قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

جنوری 2014، قیمت -/15

ماہنامہ اُردو دُنیا
دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

ہمارا آئین، ہماری جمہوریت

ماہنامہ
اردو دنیا
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi
قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
جلد:16، شمارہ:01، جنوری 2014

مدیر: ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین
نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی
اعزازی مدیر: نصرت ظہیر

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارتِ ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند
مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا
انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل
کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: منظر سبحانی

قیمت-/15 روپے، سالانہ -/150 روپے
■ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا
جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 49539000
(شعبۂ ادارت: 49539009)

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
email: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7
آر کے پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھرگٹی، حیدرآباد-500002
فون: 24415194 - 040

مشمولات

اداریہ
ہماری بات 2

خطوط
آپ کی بات — قارئین کے خطوط 3

انٹرویو
یاور عباس — راغب اختر 6

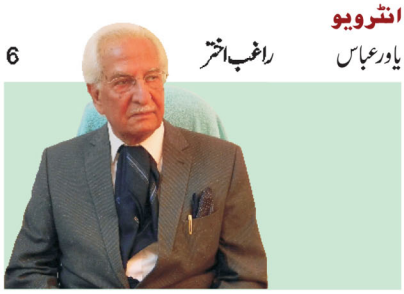

کور اسٹوری
بھارت کا آئین اور دساتیر عالم — خواجہ عبدالمنتقم 9
ہندوستان کا وفاقی نظام: ایک مطالعہ — انظار عالم 14
الیکشن کمیشن آف انڈیا
ایک خودمختار معتبر ادارہ — عبدالحی خان 17

زبان و تعلیم
پنجاب کے اقلیتی اداروں
میں اردو کی تعلیم — محمد اقبال 19
اردو تحقیق میں مواد کی فراہمی — میر رحمت اللہ 22

ادبی مباحث
اردو کے پہلے صاحب دیوان کی محبوبہ — سیدہ جعفر 24
اردو افسانہ: بیانیہ کا ارتقائی سفر — مقصود دانش 26
شجاع خاور اور دوسرا شجر — عمیر منظر 29
اردو نعت گوئی اور غیر مسلم شعرا — منیر حسین حرہ 31

اردو شاعری میں علم الجراحت — محمد ارشد جمال 34

شخصیت
بنگلہ زبان کا باغی شاعر: نذرالاسلام — محمد زاہد 37
دو متضاد راہوں کا مسافر: مجاز — تسنیم بانو 39
تہذیبی روایات کا امین: قلی قطب شاہ — عبدالعزیز سہیل 42

خراج عقیدت
اردو کو آج بھی غلام سرور کی ضرورت — اشرف استھانوی 44

مشاہیر ادب
قاضی عبدالغفار — ادارہ 46
لیلیٰ کے خطوط — قاضی عبدالغفار 47

ہماری مطبوعات
مولانا محمد علی اور گاندھی کی یاد میں (کلیاتِ ماجدی)
ترتیب و تدوین: عطاء الرحمٰن قاسمی 51

تہذیب و ثقافت
نوآبادیاتی ادب اور پس نوآبادیاتی رجحان — سراج احمد انصاری 56

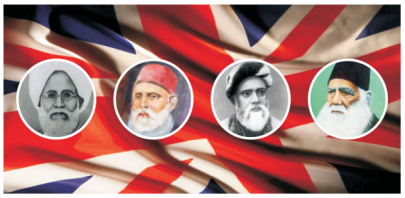

فلم
کیفی اعظمی اور ان کی فلمی شاعری — صالحہ زریں 59

سائنس و ٹکنالوجی
نیوکلیائی اتفاق — ایس ایس علی 63

سائبر دنیا کے اسرار — مظہر حسنین 65

دوسری زبانوں سے
تحریکِ محبت (سندھی) — موتی لال جوت وانی 67

فکر و تحقیق کا نیا افسانہ نمبر
فکر و تحقیق، نیا افسانہ نمبر: ایک جائزہ — علی احمد فاطمی 70

کتابوں کی دنیا
تبصرہ و تعارف 72

عالمی اردو نامہ
عالمی خبریں — ادارہ 80

خبرنامہ
اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 82

ہماری بات

ہندوستانی جمہوریت کے چونسٹھ سال، جو اسی مہینے پورے ہو رہے ہیں، بلاشبہ دنیا کی اِس سب سے بڑی جمہوریت کے، سب سے شاندار سال ہیں۔ صرف اس لیے نہیں کہ ان برسوں میں ہمارا جمہوری نظام ہر طرح کے پریشان کن حالات اور طرح طرح کی آزمائشوں سے سرخ رو ہو کر گزرا ہے اور ہندوستانی سماج میں جمہوریت کی جڑیں لگاتار مضبوط ہوتی رہی ہیں، بلکہ اس لیے بھی کہ اس عظیم ہندوستانی سماج کے جمہوری مزاج نے، عوام کے حالات بدلنے میں بھی بے حد موثر کردار ادا کیا ہے اور ملک کو معاشی و اقتصادی ترقی کے ساتھ تہذیبی اور ثقافتی تمول کے راستوں پر آگے بڑھایا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ پارلیمنٹ اور ریاستی اسمبلیوں کے قانون ساز اداروں سے لے کر میونسپل کارپوریشنوں، بلدیاتی اداروں، دیہی و پنچایتی سطح تک جمہوری اداروں کے جو ہزاروں چناؤ اس دوران ہوئے ہیں انھوں نے جمہوریت کو قومی زندگی کا جزو لاینفک بنا دیا ہے، چھوت چھات کا خاتمہ کیا ہے، مذہبی تفریق اور ذات پات کی وابستگیوں کو کمزور کر کے قومی یکجہتی کو تقویت دی ہے اور ہمیں ایک عالمی طاقت بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ بہت سی برائیوں کا ہماری جمہوریت ابھی تک خاتمہ نہیں کر پائی ہے۔ تقریباً ہر سطح پر ہونے والا کرپشن آج بھی اس ملک کے لیے سب سے بڑی لعنت بنا ہوا ہے۔ خواتین کے خلاف جرائم میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ مہنگائی، غربت اور بے روزگاری آج بھی ہمارے قومی مسئلے ہیں۔ فرقہ واریت اور مذہبی تعصب کی آوازوں کو آج بھی پوری طرح نہیں دبایا جا سکا ہے۔

لیکن ایسا بھی نہیں کہ حالات مکمل طور پر مایوس کن ہو گئے ہوں۔ گزشتہ دس برس کا دور ہمارے چونسٹھ سالہ جمہوری نظام کا سب سے بہتر دور ثابت ہوا ہے۔ بڑے بڑے گھوٹالوں کے سامنے آنے، کئی وزیروں کے جیل جانے اور خواتین کے خلاف جرائم سے بھرے ہوئے بعد کے نصف برسوں پر نظر ڈالنے کے بعد اگرچہ اس دور کو سب سے بہتر کہنا عجیب سا لگتا ہے لیکن کچھ ایسے تاریخی کام اس عرصے میں ہو گئے ہیں جن کے بارے میں پہلے سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ روزگار سے متعلق اسکیموں نے خاص طور سے دیہی علاقوں میں بے حد غریب لوگوں کی زندگی کو بہتر بنایا ہے۔ تعلیم کے حق نے ملک کو مستقبل قریب میں دنیا کی سب سے بڑی تعلیمی قوت بنانے کا بنیادی ڈھانچہ کھڑا کرنے کے راستے پر آگے بڑھایا ہے۔ نیشنل فوڈ سیکیورٹی ایکٹ نے بھک مری کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کرنے کی راہ ہموار کی ہے جس کے تحت ملک کی دو تہائی سے زیادہ غریب آبادی کو بہت ہی سستا اناج اور دوسری ضروری چیزیں مہیا کرانے کا نظام بڑی تیزی سے تشکیل پا رہا ہے اور جس کی بدولت آگے چل کر مہنگائی اور غربت کو بھی کم کیا جا سکے گا۔ خواتین کو تحفظ دینے کے لیے ان کے خلاف ہونے والے جرائم سے متعلق قوانین کو مزید سخت کیا گیا ہے جس کے، سماجی ماہرین کے مطابق، مستقبل قریب میں بہتر نتائج برآمد ہوں گے۔

لیکن اس سے بھی زیادہ خوشی اور اطمینان کی بات یہ ہے کہ ہم نے سب سے بڑی قومی لعنت، کرپشن کو دور کرنے کی سمت میں کئی بنیادی اور انقلابی قدم اٹھائے ہیں۔ اس سلسلے کی شروعات حصول اطلاعات کے حق، رائٹ ٹو انفارمیشن کے نفاذ سے ہوئی تھی، جس کے نتیجے میں بڑے بڑے گھوٹالے سامنے آئے اور بڑے بڑے لوگوں کو جیل کی ہوا کھانی پڑی۔ تازہ ترین تاریخی اقدام لوک پال کے قیام کا فیصلہ ہے جسے پارلیمنٹ کی منظوری مل چکی اور جسے جلد ہی ایک عملی نظام کی شکل مل جائے گی۔ اطلاعات کا حق اور لوک پال دونوں مل کر ہمارے نظام کو کرپشن سے بڑی حد پاک کر دیں گے اس میں اب کوئی شک باقی نہیں رہ گیا ہے اور یہ بلاشبہ ہماری جمہوریت کا سب سے اچھا تحفہ ہے جو اس نے ہمیں نئے سال کے لیے تحفے کے طور پر دیا ہے۔

ہم سب کو یہ نیا سال مبارک ہو!

(ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین)

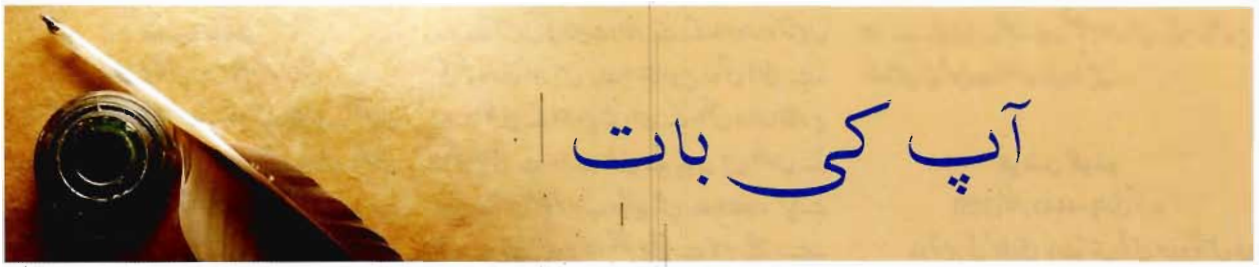

آپ کی بات

الحاج شفیق احمد
استاد مدرسہ انوار العلوم، رامنگر بارہ بنکی

ماہنامہ 'اردو دنیا' دسمبر 2013 کے سرورق پر خوبصورت کتابت سے لکھا ہوا 'اردو زبان و ادب اور ہندی' کی حروف تہجی کے چھپے ہوئے مشترکہ چند حروف کے ساتھ شمارہ نظر نواز ہوا۔ اقلیتوں کی تعلیمی ترقی کے پروگرام کے عنوان سے جاری وزارت برائے فروغ انسانی وسائل کی رپورٹ کو پڑھنے معلومات مین مزید اضافہ ہوا۔ کوراسٹوری میں شامل تمام مضامین بہت اہم اور معلومات سے بھر پور ہیں۔ 'اردو اور ہندی قربتیں اور فاصلے' کیا ہی دلچسپ مضمون ہے۔ عبدالواسع نے بہت ہی واضح اور محققانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ زبان کی سیاست کرنے والوں نے اردو اور ہندی زبانوں میں دوری پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اردو کے قلم کاروں نے اپنی کاوشوں اور محنتوں کے ذریعے اردو کو اس ملک میں زندہ رکھا۔ مشاعروں اور اردو کی محفلوں کے علاوہ ملک کے مدرسوں نے اردو کی بقا کے لیے نمایاں کام انجام دیا ہے۔ اردو اور ہندی دونوں ایسی زبانیں ہیں جو کہ عام بول چال میں پہلے بھی ایک تھیں اور آج بھی ایک ہیں۔ ہمارے ملک میں ہندی کی طرح اردو کو بھی لازمی مضمون کا درجہ دے کر تعلیمی نصاب میں شامل کیے جانے کی ضرورت ہے۔ عبدالحی صاحب کا مضمون 'اردو اور ہندی کا لسانی رشتہ' بھی بہت ہی عرق ریزی سے سپرد قلم ہوا ہے۔ یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اردو اور ہندی زبانیں ایک دوسرے سے مشترک ہیں۔ ہمارہ ملک گنگا جمنی تہذیب کا ملک ہے اور یہ دونوں زبانیں گنگا جمنی تہذیب کی علمبردار رہیں۔ ''اردو ادب میں رحیم اور کبیر کو جگہ ملنی چاہیے تھی'' کے موضوع پر پروفیسر عبدل بسم اللہ صاحب سے ڈاکٹر محمد ہادی رہبر سے کی گئی گفتگو بہت ہی دلچسپ اور معلومات سے لبریز ہے۔ پروفیسر عبدل بسم اللہ صاحب نے بہت ہی اچھی بات کہی ہے کہ ''ہندی اور اردو کی ایک مشترکہ تاریخ لکھی جانی چاہیے۔'' سلام بن رازق نے 'اردو ہندی افسانہ' پر بہترین انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ 'جنگ آزادی 1857 پر چار ناموران کے فوری تاثرات اور سرسید کی انفرادیت' مضمون سید محمد اشرف صاحب نے بہت خوب اور معلومات سے بھر پور لکھا ہے۔ زبیر شاداب نے 'فاصلاتی نظام تعلیم اور اردو' کے موجودہ نظام کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی اہمیت اور مقاصد کو بہت ہی بہترین انداز میں قلمبند کیا ہے۔

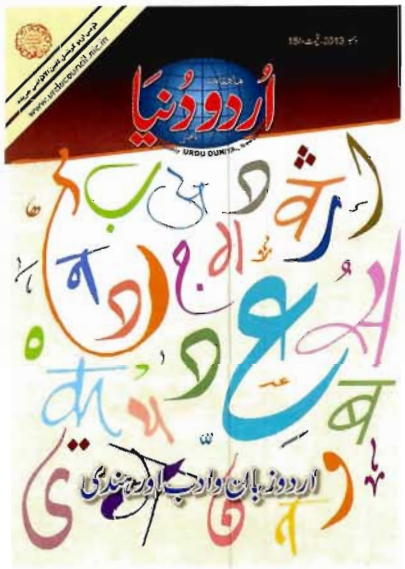

کرشن بھاؤک
کوٹھی نمبر، A-201، گورونانک نگر، پٹیالہ پنجاب

'اردو دنیا' کا دسمبر ماہ کا تازہ شمارہ حسبِ سابق صحیح وقت پر ہمدست ہوا۔ اردو زبان وادب اور ہندی، جیسے ناگزیر موضوع پر مبنی یہ شمارہ لاجواب مشمولات سے آراستہ ثابت ہوتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالحی کا سیر حاصل مضمون اردو اور ہندی کے باہمی لسانی رشتوں کے مختلف زاویوں کو بخوبی نام زد کرنے کے موجب کوزے میں سمندر کو مقید کرنے والے ضرب المثل کو صادق کرتا ہے۔ بلند پایہ شاعر مصحفی امروہہ (موجودہ اتر پردیش میں) کے تھے، جس شہر کو غلطی سے دکنی ہند میں (ص 13) گنا دیا گیا ہے۔ اسی طرح 'نقارہ' لفظ کی جگہ 'نظارہ' لفظ (ص 14) عجلت میں غلط شائع ہوا ہے۔ ہندی کے دس ہکاری (مہاپران) الفاظ کھ، چھ، ٹھ، تھ، پھ وغیرہ تو اردو کی مانند انگریزی زبان نے بھی اپنائے ہوئے ہیں۔ عبدالحی صاحب نے 'بھاشا' لفظ کی یہ صدفی صد اصلی تفہیم کرائی ہے، جو کہ میری دانست میں اس مضمون کا ایک خاص جمع نقطہ (Pluspoint) ہے۔ 'بھاشا' سے مراد وہ زبان ہے، جس پر فارسی، عربی یا کسی غیر ملکی زبان کا اثر نہیں کے برابر تھا۔'' بقول کبیر 'سنسکرِت کوپ (کوئیں کا) جل/ بھاشا بہتا نیر۔'' سلام بن رزاق ہندی زبان و ادب میں بھی اپنی بیش بہا تخلیقات سے اپنے ادبی پرچم بلند کیے ہوئے ہیں، لہٰذا ان سے مضامین لکھوانے کا انتخاب کرنا میری دانست میں فقط آپ ہی کا حصہ ہوسکتا تھا۔

اسی طرح عبدالواسع کا ہر لحاظ سے معیاری مضمون ان ہی کے بموجب اس حقیقت کا غماز ہے کہ اردو و ہندی گویا ''ایک دوشیزہ کی دو خوبصورت آنکھیں ہیں۔'' (صفحہ 10)۔ عبدالواسع صاحب نے مقالے میں محول ایک بولی کا نام 'باگھلی' (صفحہ 10) دیا ہے، جبکہ اصل نام 'بگھیلی' (بگھے لی) ہے۔ گزشتہ صدی کے غالباً وسط میں ہندی زبان میں پی ایچ ڈی ڈگری کا ایک تھیسس شائع ہوا تھا۔ 'اودھی، بگھیلی اور چھتیس گڑھی'۔ ہندی زبان کے بلند پایہ شاعر جائسی بھی اور امروہہ کے رسکھان کو بھی اردو ادب میں شامل کرنے پر غور کیا جاسکتا ہے۔ موصوف نے سابقوں (اپسرگوں) اور لاحقوں (پرتیوں) کی واضح تشریح کی ہے، جس سے ہندی زبان کے ایک شعر کا یہ مفہوم یاد آتا رہتا ہے کہ ''جب سے مجھے ہندی سے محبت ہوئی ہے، میری اردو خوبصورت ہوگئی ہے۔''

اس منکسر المزاج خاکسار کی تجویز ہے کہ سکھوں کے شہرۂ آفاق صحیفہ 'شری گورو گرنتھ صاحب' کو بھی اردو ادب میں اس لیے اپنی بیش بہا صفات کے موجب شامل کرنا درکار ہے، کیونکہ اس میں سنسکرِت اور برج بھاشا کے علاوہ عربی، فارسی اور اردو زبانوں کے ہزارہا الفاظ بخوشی جذب کیے گئے ہیں، جو کہ سیکولر ذہنیت والے غیر جانبدار سنجیدہ قارئین کو حیران و ششدر کر سکتے ہیں۔

نسیم سحر

معصوم ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر سوسائٹی

'اردو اور ہندی کا لسانی رشتہ' ایک کامیاب مضمون ہے۔ کبیر اور رحیم کا زمانہ اردو کا ابتدائی زمانہ تھا۔ افسوس کہ علماء اردو نے اسے نظر انداز کر دیا۔ ابتدائی دور سے ہمارا رشتہ ہے۔ ابھی کچھ سال قبل تک ان کے اشعار اردو کے حوالے میں آتے تھے۔ پھر کیوں لوگوں نے اس حصے کو اردو سے الگ کر دیا۔ عبدالحی صاحب کا مضمون اس طرف سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔

محمد ہاشم قدوائی

سابق ممبر پارلیمنٹ، سی 501، روز ووڈ اپارٹمنٹس، میور وہار، نئی دہلی

عین عالم انتظار میں 'اردو دنیا' کا نومبر 2013 کا شمارہ موصول ہوا۔ یہ شمارہ بھی امتیازی خصوصیتوں کا مجموعہ ہے۔ حسن طباعت اور کتابت کے ساتھ اس کے مشمولات یعنی مضامین حد درجہ معلوماتی اور گراں قدر ہیں۔ حسب ذیل گراں قدر مضامین سے خاص طور پر مستفید ہوا: شمالی ہند کی مثنویوں میں ہندوستانی تہذیب کی عکاسی، اڑیسہ میں اردو کا ادبی و تہذیبی پس منظر، مولانا آزاد ہندوستان کی ایک عبقری شخصیت، علامہ اقبال اور قومی یک جہتی، مومن کے تذکرے، شاعر حقیقت نشور واحدی اور تبصرے۔ یہ محل نظر ہے کہ علی گڑھ تحریک کے بانی کے مذہبی اجتہادات اسلامی فقہ کے عین مطابق تھے۔ ان کے اجتہادات اصل اسلام سے ہٹے ہوئے تھے۔ حالی کا اس سلسلے میں حوالہ دیا گیا ہے مگر وہ اسلامیات کے ماہر نہ تھے۔

پروفیسر علی احمد فاطمی

شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

'اردو دنیا' کا تازہ شمارہ ملا۔ 'گوشۂ علی سردار جعفری' پر بھی نظر گئی۔ شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مضمون کے ساتھ تصویریں اور خطوط بھی شائع کیے۔ تسلی ہوئی کہ میں نے سردار جعفری سے بہت کچھ سیکھا ہے۔

محمد ناظم علی

پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج، موڑتاڑ، ضلع نظام آباد

نومبر کا شمارہ بروقت ملا۔ مشمولات معلوماتی، فکر انگیز ہیں۔ سرورق پر پندرھواں کل ہند اردو کتاب میلہ اور گوشۂ علی سردار جعفری سے اندازہ ہو گیا کہ اس میں کیا کچھ معیاری نہیں، علی سردار جعفری پر گوشہ نکال کر اردو دنیا نے ان کی ادبی خدمات کا احاطہ کیا۔ ہماری بات میں مدیر نے کتابوں کی اہمیت و افادیت کے علاوہ اردو کتابوں کی فروخت اور اس سے استفادہ پر روشنی ڈالی ہے۔ وارث علوی کے انٹرویو میں ان کے دانش ورانہ افکار پر روشنی پڑتی ہے، وارث علوی بے پایاں ہیں انھوں نے سعادت حسن منٹو کو ادب و تنقید میں establish کیا ہے ان سے پہلے منٹو پر نقاد چشم پوشی سے کام لیتے رہے۔ NCPUL کی جانب سے کتب میلے سے اردو کتابوں کی نکاسی ہو رہی ہے۔ اڑیسہ میں اردو کا ادبی و تہذیبی پس منظر مضمون لسانی تاریخ میں اضافہ کا موجب ہے اگر اسی نہج پر مضامین شائع ہوں تو اردو کے ملک میں اردو کی لسانی تاریخ میں فروغ حاصل ہوگا۔ ابن کنول نے شمالی ہند کی مثنویوں میں ہندوستانی تہذیب کے عناصر کی عکاسی کی ہے۔ 100 صفحات کا یہ شمارہ اپنے اندر گوناگوں ہمہ خصوصیات و خوبیاں لیے ہوئے ہیں۔ ویسے اردو دنیا کا ہر شمارہ ایک بحر العلوم سے کم نہیں جس میں عصری شعور اور عصری آگہی کے علاوہ روایتی قدریں بھی مل جاتی ہیں۔

سرور سعید

رحمانیہ جونیئر کالج، اچلپور سٹی، ضلع امراوتی

'اردو دنیا' نومبر 2013 ملا، شکریہ۔ رسالے کی ترسیل قابلِ قدر اور قابلِ تقلید عمل ہے۔ گوشۂ علی سردار جعفری اہم دستاویز ہے۔ 'ہماری بات' اثر آفرین ہے۔ اردو کے بازوؤں کو قوت پرواز دینا آپ کے علاوہ ہم سب کی ترجیح ہونا ضروری ہے۔ دیگر زبانوں کے مقابلے میں اردو کتابیں، اخبار و رسائل خرید کر پڑھنے والوں کی تعداد کافی کم ہے۔ تاجر، ملازمت پیشہ افراد دکاندار وغیرہ میں خرید کر پڑھنے کا شعور فروغ پائے تو اردو زبان کی حفاظت و پاسداری ہوگی۔ رسالہ اردو دنیا ہمارے لیے نایاب تحفہ ہے۔ تعلیم اور اس کے مسائل پر مضامین کی شمولیت کو ضروری بنائیں۔

کرشن گوتم

3251، سیکٹر D-44، چندی گڑھ

ماہ نومبر کی 'ہماری بات' میں قومی اردو کونسل کی کتب کی فروخت کے بارے میں توقعات سے بڑھ کر اُمید رکھنا عین قدرتی ہے لیکن ایک سعی بلیغ بھی مناسب ردِعمل کے فقدان میں ایک رسماً کارگزاری ہو کر رہ جاتی ہے نتیجہ وہی ہوتا ہے جس کی طرف آپ کا اشارہ ہے۔ میں اوائل ہی سے 'کونسل' کی عمدہ کتابیں دوسری کتابوں کے ساتھ ساتھ دیکھتا آ رہا ہوں۔ بازار میں کتابیں بہت ہیں لیکن 'بڑی کتابیں' بہت تھوڑی ہوتی ہیں۔ ایسی بڑی کتابیں جو موجودہ اور آنے والی نسلوں کے لیے ایک گراں قدر عطیہ کی اہمیت رکھتی ہیں آپ کے ادارے کی طرف سے ریویو (Review) ہوتی رہتی ہیں۔ ماہنامہ 'اردو دنیا' بذاتِ خود ایک روشن چراغ ہے۔ ایسے اداروں اور جریدوں کی بقا و بہبود کے لیے مسلسل محنت اور قربانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ منشی نول کشور پریس کی مثال ہمارے سامنے ہے۔

شکیل سہسرامی

یو ایس بی ایل سی پٹنہ

نومبر 2013 کا ماہنامہ 'اردو دنیا' امینِ نظر ہوا۔ سرورق پر 'گوشۂ علی سردار جعفری' لکھا دیکھ کر طبیعت پھڑک گئی۔ صفحہ نمبر 2 اور 102 پر این سی پی یو ایل کی جانب سے اردو کتاب میلے کے دوران مختلف موقعے پر لی گئیں مختلف زاویوں کی تصاویر اردو کے ایک زندہ ارتقائی سفر کی آئینہ دار ہیں۔ اردو خطاطی کا تحفظ واقعی ایک لازمی امر ہے اس کے تئیں ہر چھوٹے بڑے اداروں کو سنجیدہ ہونا چاہیے۔ اردو زبان بلندیوں کو چھونے کے لیے اپنے پر ہی نہیں پھڑ پھڑا رہی بلکہ یہ پیاری زبان اپنے شاہیں صفت پروں کو پھیلا کر بلند بانگ فضاؤں میں پرواز کر رہی ہے۔ این سی پی یو ایل کی جانب سے سنیچر اتوار کا ای ٹی وی پر نشر ہونے والا ہفتہ وار پروگرام 'اردو دنیا' مسلسل دیکھ رہا ہوں۔ آدھے گھنٹے کا یہ پروگرام انتہائی مزیدار اور دلکش ہوتا ہے۔ میری دلی خواہش ہے کہ کل ہند اردو کتاب میلہ عالمی اردو کتاب میلہ میں تبدیل ہو جائے۔ رفیعہ شبنم صاحبہ نے علی سردار جعفری صاحب کا سوانحی خاکہ بڑے پر اثر انداز میں پیش کیا ہے۔

انتخاب کلام سردار جعفری کو حاصل شمارہ کہنا حق بجانب ہوگا۔ عبدالرشید صاحب کے ذریعہ فیض کے تعلق سے ایک نئے گوشے کی تلاش اُن کے شخصی شعور کے ابواب وا کرتی ہے۔ مومن خاں مومن کے بارے میں کچھ لکھنا بڑے دل گردے کی بات ہے۔ معید صاحب کی جسارت لائق اعتنا ہے۔ تم مرے پاس ہوتے ہو گویا، جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔ یہ تھے مومن خاں مومن۔

اسلام الدین اعظمی

دارالعلوم مئوناتھ بھنجن، ضلع مئو (یوپی)

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا نومبر کا شمارہ نظرنواز ہوا۔ درحقیقت جب تک شمارہ قاری کے ہاتھ نہ آجائے دل میں عجیب سی اضطرابی کیفیت رہتی ہے۔ اس مرتبہ کے شمارے میں قلمکاروں نے جن عبقری شخصیتوں کے بارے میں اہم مضامین قلمبند کیے ہیں وہ لائق صد ستائش ہیں خصوصاً علی سردار جعفری پر جو سوانحی خاکہ کھینچا ہے وہ بہت معنیٰ رکھتا ہے نیز ادبی مباحث کے کالم بھی بہت گراں قدر ہیں۔ محترمہ ایس نسیم بانو صاحبہ نے 'علامہ اقبال اور قومی یکجہتی' کے نام سے جس عنوان کو 'اردو دنیا' کے گوشہ میں سمویا ہے وہ قابل مبارکباد ہے چونکہ یہ سچائی مسلم ہے کہ اقبال فکری اور عملی دونوں جہتوں سے ہندوستانی قوم کی فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور یک جہتی کے لیے بے حد کوشاں اور نہایت متمنی رہے۔

رئیس الدین رئیس 'انسانی قدروں کے ترجمان: طوطیِ ہند امیر خسرو اور مہا کوی کبیر' کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ ''امیر خسرو کی ذات ایک بے مثل مایہ ناز وفخر ہے وہ صوفی کے لحاظ سے فنافی اللہ ندیم کی حیثیت سے ارسطو کے زمانہ، عالم کی حیثیت سے تبحر علامہ، موسیقی میں امام المجتہد، مورخ کی حیثیت سے بے نظیر محقق اور شاعر کی حیثیت سے ملک الشعرا ہیں'' یہ مضمون بھی بے مثال ہے۔

سلمان جونپوری

23، اقراڈ پلیکس، نارول، وٹوا روڈ احمد آباد، گجرات

'اردو دنیا' کا نومبر کا شمارہ دستیاب ہوا، بزرگ نقاد و ادیب محترم پروفیسر وارث حسین علوی صاحب جو اردو زبان وادب کے ایک اہم ستون ہیں، ان کا انٹرویو انتہائی اہمیت کا حامل ہے جس میں ایسے بہت سے گوشے آگئے ہیں جو عام طور سے اردو زبان و ادب کے شائقین کی نظروں سے اوجھل تھے۔ ان کا یہ انٹرویو دستاویزی نوعیت کا ہے۔ علی سردار جعفری اپنی جگہ پر ترقی پسند شعرا میں ایک نمایاں شخصیت کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ اردو دنیا نے گوشۂ علی سردار جعفری شائع کر کے قابلِ قدر کارنامہ انجام دیا ہے۔ محترم فاروق ارگلی صاحب کی تحریر عصرِ حاضر میں اپنی ایک الگ علمی اور ادبی شان رکھتی ہے انھوں نے جناب نشور واحدی پر اپنی فکر ونظر سے جو کچھ لکھا ہے وہ سند کا اعتبار رکھتی ہے۔

معین الدین شمسی

اسلامیہ مڈل اسکول، گریڈیہہ (جھارکھنڈ)

نومبر 2013 کا 'اردو دنیا' تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہوا۔ سرورق پر 14 تا 22 ستمبر 2013 'پندرہواں کل ہند اردو کتاب میلہ' چھوٹا میدان بنگلور، دیکھ کر ایسا لگا کہ چھوٹا میدان نہیں بلکہ شیواجی اسٹیڈیم بڑا میدان اور عظیم الشان میلہ میں تبدیل ہوگیا ہے۔ کوراسٹوری کے تحت شاہد اختر نے بھی پندرہویں کل ہند اردو کتاب میلہ کا تذکرہ کما حقہ کیا ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی کا علی سردار جعفری کا سوانحی خاکہ خوب ہے۔ علی سردار جعفری کی پیدائش کے سوویں سال میں موصوف کے فن اور شخصیت پر ایک خاص گوشہ مرتب کرنا ماشاء اللہ سونے پہ سہاگہ ہے۔ اس سے نئی نسل کے قارئین یہ سمجھ سکیں گے کہ ملک، سماج، تہذیب اور سارے جہاں کو بہتر بنانے کی کوشش میں ایک بھرپور جیون کیسے گزارا جاتا ہے۔ ہندی کہانی 'اتھنس کا ستیارتھی' کا سرفراز جاوید نے سہل ترجمہ کر کے قارئین تک پہنچایا ہے۔ علم طب کے تحت حکیم چاند پوری نے طب اور ادب پر بہت کچھ لکھا ہے۔ بعض اداروں سے یہ کوشش کی جارہی ہے کہ بچے اردو میں تعلیم حاصل نہ کرسکیں یہی وجہ ہے کہ اسکول بند ہورہے ہیں۔ اردو اسکول ہندی اسکول میں تبدیل ہورہے ہیں۔ اردو میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد بچوں کو اچھی ملازمت نہیں ملتی۔ ایسی باتوں اور گھٹیا سوچ سے لوگوں کے ذہن پاک کرنے اور اردو کے بقا کے لیے اردو والوں کو عہد کرنا چاہیے کہ ہم اپنے بچوں کی اردو تعلیم کو یقینی بنائیں۔ اردو کی کتابیں اور اخبار و جرائد خریدیں گے۔ نیز رشتہ داروں کو بھی اردو پڑھنے لکھنے بولنے کے علاوہ اردو دوستی کا درس دیں گے۔

فخر عالم صدیقی

موہن پور، گریڈیہہ، جھارکھنڈ

ماہ اکتوبر کا شمارہ 'اردو دنیا' خوب سے خوب تر ہے۔ 'اکیسویں صدی میں اردو: فروغ اور امکان' یہ جو موضوع آپ نے بین الاقوامی کانفرنس کے سامنے رکھا یہ نہایت موزوں تھا۔ سرورق میں اسے اردو اور انگریزی میں نمایاں بھی کیا یہ بھی بہتر تھا۔ قرار دادِ بین الاقوامی اردو کانفرنس کی تفصیلات بھی بڑے کام کی ہیں۔ 'معاملاتِ اردو' کے گراں قدر خطبات ذہن نشیں کرنے کی چیزیں ہیں۔ یقیناً آپ تعریف کے مستحق ہیں۔ انھیں کوششوں سے ہی کوئی رسالہ معیاری بنتا ہے۔

ڈاکٹر محمد زاہد

بی 5، مٹیا برج، کلکتہ

اکتوبر 2013 کا شمارہ نظرنواز ہوا۔ سارے مشمولات معیاری ہیں۔ اتفاق یہ ہے کہ چند ماہ قبل میں نے اردو زبان کے تعلق سے ایک مضمون لکھا تھا جو میری زیرطبع کتاب میں شامل ہے، اس میں میں نے اردو زبان کے فروغ کے لیے ایک بین الاقوامی کانفرنس کی تجویز رکھی تھی، آپ نے اسے منعقد کر کے ایک خواب کو حقیقت میں بدل ڈالا۔ پروفیسر اختر الواسع اور سید محمد اشرف نے بڑی کام کی باتیں کہی ہیں، ان پر عمل آوری کے لیے پریشر گروپ بنانے کی ضرورت ہے۔ سبھی ریاستوں میں اردو میڈیم اسکولوں کا قیام اور آئی سی ایس ای، سی بی ایس ای، کیندرودیالیہ وغیرہ میں اردو کو بحیثیت ایک زبان پڑھانے کا انتظام ہونا چاہیے۔ مدرسوں میں 'مذہبی اردو' کے ساتھ ادب وثقافت کی علم بردار زبان سے بھی واقفیت کرانا لازمی ہے۔ فروغ اردو کونسل کی اردو کانفرنس ہر سال منعقد ہو اور اس میں ہر سال کی پیش رفت کی رپورٹ پیش کی جائے۔

راغب اختر

جب بھی حریت اور انسانیت کی بات ہوگی ہندوستان میں اردو کا ذکر ضرور آئے گا

یاور عباس

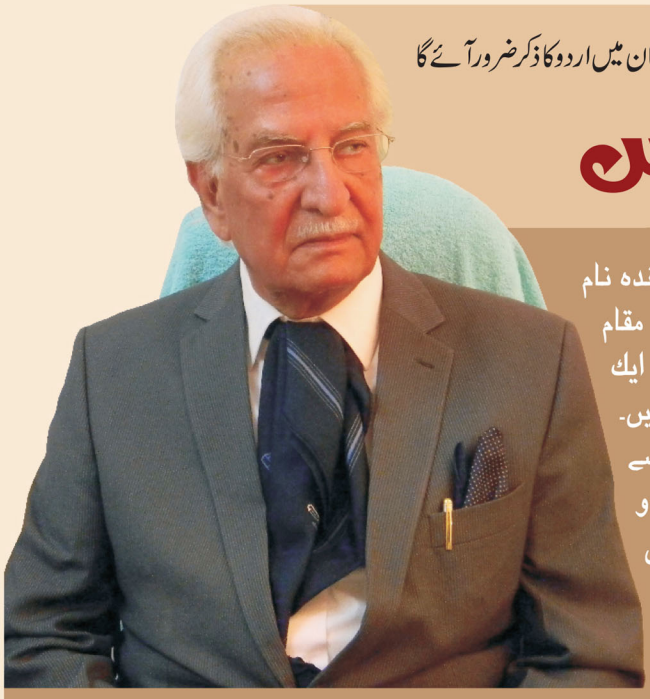

یاور عباس کا نام اردو صحافت کی دنیا میں ایک تابندہ نام ہے جس نے بی بی سی جیسے ادارے کو ایک منفرد مقام حاصل کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ یاور عباس ایک کامیاب بروڈکاسٹر، صحافی، فلم ساز اور مصنف ہیں۔ وہ لکھنؤ کے ایک تعلیم یافتہ اور مہذب شیعہ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جس میں میر انیس کے مرثیے تہذیب و ثقافت کا حصہ ہیں۔ ان کی تعلیم الہ آباد یونیورسٹی سے ہوئی جہاں انہیں رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری سے ملنے اور ان کی علمی اور ادبی محفلوں میں شامل ہونے کا موقع ملا۔ وہیں ان کی ملاقات علی سردار جعفری سے ہوئی جن سے یاور عباس بے حد متاثر ہوئے۔ موصوف نے تقسیم ہند کے وقت ہی بر صغیر کو خیر باد کہہ دیا کیونکہ انہیں اس بات کا ادراک ہو چکا تھا کہ تقسیم اور آزادی دونوں ہی خیالی تصورات ہیں اور ان خیالی تصورات کی بنیاد پر پائیدار مستقبل کی عمارت کھڑی نہیں کی جا سکتی۔ لندن میں بھی ان کا دل اپنے ہندوستان کے لیے تڑپتا رہا اور وہ تڑپ ان کی فلم 'انڈیا مائی انڈیا' میں محسوس کی جا سکتی ہے۔ یاور عباس لکھنؤ کے علمی اور ادبی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں اور اردو زبان کی شیرینی انہیں وراثت میں ملی ہے۔ اپنی ماں کی طرف سے وہ میر انیس سے نسبت رکھتے ہیں اور برملا اس پر فخر بھی کرتے ہیں۔ وہ 39 سال کی عمر میں بھی چست و درست صحت اور مثبت فکر کے مالک ہیں اور مستقبل کے حوالے سے کبھی مایوسی کا اظہار نہیں کرتے۔ اپنے ان ہی خیالات کا اظہار انھوں نے ہمارے ساتھ کی گئی گفتگو میں بھی کیا جو حاضر خدمت ہے۔

راغب اختر: یہ بتائیں کہ اردو زبان و ادب کی اس زمانے میں کیا حالت تھی، کیا وہ اس زمانے میں بھی ان ہی حالات کا شکار تھی جن کی ابھی ہے؟

یاور عباس: جی نہیں۔ میرے زمانے میں خواہ کسی شخص کا تعلق کسی مذہب سے ہو وہ مہذب تسلیم نہیں کیا جاتا تھا جب تک وہ اچھی اردو لکھتا اور بولتا نہ ہو۔ میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ اردو کو ایک زمانے میں ہندوستان میں وہی مقام حاصل تھا جو یورپ میں فرانسیسی کو تھا۔ وہاں فرانسیسی تہذیب کی زبان مانی جاتی تھی اور یہاں اردو۔ اس کے علاوہ اردو رابطے کی بہت زبردست زبان رہی ہے۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ جب بھی حریت اور انسانیت کی بات ہوگی ہندوستان میں اردو کا ذکر ضرور آئے گا۔

ر ا: آپ لندن میں رہ کر بھی اس قدر شستہ اردو بولتے ہیں یہ کیسے ممکن ہوا؟

یاور عباس: یہ اس وجہ سے ممکن ہو سکا ہے کہ میری بنیاد میں اردو رچی بسی ہے۔ میرا خاندانی پس منظر جس میں میری والدہ کی میر انیس کے خاندان سے نسبت ہے میرے اور اردو کے درمیان جو رشتہ ہے اسے مستحکم کرتا ہے۔ اس کے علاوہ الہ آباد یونیورسٹی اور وہاں فراق جیسے استاد کی صحبت اس کی دوسری بڑی وجہ ہے۔ تیسری جو میرے خیال سے بہت بڑی وجہ ہے وہ میر انیس کے کلام سے نسبت ہے جو مرثیے کی شکل میں ہماری خاندانی تہذیب کا ایک حصہ ہیں۔

ر ا: یاور صاحب تقسیم کے وقت مسلمان پاکستان گئے یا پھر ہندوستان میں رہ گئے آپ لندن کیسے پہنچ گئے؟

یاور عباس: راغب صاحب جن دنوں تقسیم کا واقعہ پیش آیا اور میں برطانیہ کی فوج میں تھا جہاں میرا کام فلمیں بنانا تھا۔ میرے فیلڈ مارشل نے ان دنوں مجھے اس حصے میں اسی غرض سے بھیجا تھا جو حصہ اب پاکستان کہلاتا ہے۔ وہ فلم بہت اچھی بنی لیکن وہ ہندوستان کے تناظر میں تھی۔ جب تقسیم کا واقعہ ہوا تو مجھے میرے فیلڈ مارشل نے بلا کر کہا کہ تمھیں تمھاری فلم کی وجہ سے جو استقلال پاکستان کے موضوع پر ہے پاکستان میں پسند نہیں کیا جائے گا لہٰذا تم اپنے سسرال چلے جاؤ۔ میں آپ کو یہ بھی بتاتا چلوں کہ فوج ہی کی ملازمت کے دوران جن دنوں میں جاپان میں تھا میری ملاقات ایک برطانوی خاتون سے ہوئی اور وہیں جاپان میں ہی ہم نے شادی کر لی۔ میرے فیلڈ مارشل نے اسی حوالے سے مجھے کہا کہ تم اپنے سسرال چلے جاؤ اور میں برطانیہ چلا گیا۔

ر ا: لندن میں جانے کے بعد بی بی سی سے کیسے منسلک ہوئے؟

یاور عباس: جب میں لندن گیا تو میرے پاس ریڈیو کا کوئی تجربہ تو تھا نہیں۔ میں تو فوج کا آدمی تھا اور اس میں بھی خاص شعبے فلمنگ کا آدمی تھا۔ لہٰذا جب میں انگلستان

گیا تھا تو یہ سوچ کر گیا تھا کہ میں وہاں بھی فلم انڈسٹری سے جڑوں گا لیکن وہاں جا کر معلوم ہوا کہ اگر آپ یونین سے جڑے ہوئے نہیں ہیں تو آپ فلم انڈسٹری میں کام نہیں کر سکتے اور جب تک آپ فلم انڈسٹری میں کام نہیں کر سکتے آپ یونین کے ممبر نہیں ہو سکتے۔ اتفاق سے مجھے کسی نے بتایا کہ یہاں پر ایک بی بی سی بھی ہے اور میں وہاں پہنچ گیا۔ وہاں ایک انگریز افسر ہوا کرتے تھے بی بی سی کے جو اردو سیکشن دیکھ رہے تھے۔ ان سے کسی نے بتایا کہ یہ لکھنؤ کے ہیں اور لکھنؤ کو زبان کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ انہوں نے اسٹاف کے ایک صاحب جن کا نام امجد علی تھا انھیں میرا انٹرویو کرنے کے لیے کہا جو 'آج کے مہمان' کے عنوان سے بی بی سی سے نشر ہوا اور اسے کافی پذیرائی ملی۔ اس کے بعد انھوں نے کچھ اور کام دیے اور پھر مجھ سے کہا کہ آپ ہمارے اسٹاف پہ آجایئے۔ اس دور میں میں بہت پریشان تھا اور یہ سوچ کر کہ کہیں یہ اپنا ارادہ نہ تبدیل کر دیں فوراً حامی بھر لی اور اس طرح میں بی بی سی سے جڑ گیا۔

ر ا: پھر بی بی سی کا تجربہ کیسا رہا؟ آپ کو اس میں کچھ پریشانی محسوس نہیں ہوئی؟

یاور عباس: جی نہیں میں تو کچھ ہی روز میں اس میں رچ بس گیا اور مجھے ایسا لگا کہ مجھے اب تک اسی کی تلاش تھی۔ وہاں میں نے بہت محنت کی۔ اس زمانے میں بی بی سی محض خبریں ہی نشر نہیں کرتی تھی بلکہ خبروں کے لیے صرف پندرہ منٹ تھے اور آدھا گھنٹہ دیگر پروگراموں کے لیے ہوا کرتا تھا۔ اس ماحول میں کام کرنے کا الگ ہی مزہ تھا اور میں نے وہاں شیکسپیئر کے اکثر ڈراموں کو اردو میں ڈیزائن کیا اور اسے ریڈیو ڈرامہ کی شکل دی۔

ر ا: یاور عباس صاحب آپ کا تعلق صحافت سے ہے اور آپ ایک عظیم صحافتی ادارے بی بی سی سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ تعلق تقریباً تقسیم ہند کے وقت ہی سے ہے۔ یہ بتائیں کہ جب آپ اس دور میں لندن گئے تو آپ کو ہندوستان کے صحافتی منظر نامے اور لندن کے صحافتی منظرنامے میں کیا فرق محسوس ہوا؟

یاور عباس: ہندوستان میں انگریزی صحافت تو اس وقت کافی ترقی کر چکی تھی۔ جب میں یہاں سے گیا ہو ں اس وقت تک اردو پر عتاب نازل ہونا شروع ہو چکا تھا۔ اردو صحافت اس وقت تک تو مضبوط تھی لیکن اسی دور میں اس کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ انگلستان میں ایک دوسرا منظر تھا۔ تکنیکی اعتبار سے وہاں کی صحافت کافی ترقی کر چکی تھی لیکن جہاں تک خیالات، تصورات، تبصروں اور عالمی افکار کی بات ہے ہندوستان اس وقت بھی انگلستان کی صحافت سے آگے تھا۔ لیکن یہ بات میں ہندوستان کی انگریزی صحافت کے حوالے سے کہہ رہا ہوں۔ زبان کے معاملے میں ہندوستانی اخبارات ذرا کمزور تھے لیکن باقی ہر اعتبار سے بہتر تھے۔ اس کے مقابلے میں برطانیہ کی صحافت بادشاہت کی وجہ سے گھٹی ہوئی تھی۔ ہر چند کہ انگلستان کا امپائر ختم ہو رہا تھا لیکن ذہنیت وہی تھی، بلکہ مجھے یہ کہنے دیجیے کہ کسی حد تک آج بھی ان کی صحافت میں وہی ذہنیت کارفرما ہے جو دور شہنشاہیت میں تھی۔

ر ا: کچھ اخبارات تو ہوں گے جو آزاد ہوں گے اور اس ذہنیت سے الگ انھوں نے اپنی راہ بنائی ہوگی؟

یاور عباس: جی ہاں میرے خیال میں گارڈین اور انڈپنڈنٹ جیسے چند اخبارات اس ذہنیت سے کافی حد تک آزاد ہیں لیکن باقی اخبارات آج بھی اسی دور کی ذہنیت کے ساتھ چل رہے ہیں۔

ر ا: اس زمانے میں ہندوستان میں کون کون سے نمائندہ اخبارات تھے؟

یاور عباس: میرے زمانے میں ہندوستان ٹائمس، پائنیئر، ٹائمس آف انڈیا، ہندو، امرت بازار پتر کا نمائندہ اخبارات تھے اور ان کی عوام میں ایک ساکھ تھی۔ وہ اس وجہ سے کہ ان اخبارات کے ذریعے جو صحافت وجود میں آئی تھی وہ بڑی بے لاگ صحافت تھی۔

ر ا: آپ ہندوستان کی موجودہ صحافت سے بھی بخوبی واقف ہیں اور رفتہ رفتہ میڈیا میں جو نیا رجحان دیکھا جا رہا ہے جسے زرد صحافت یا اس سے قریب کی کوئی شے کہا جا سکتا ہے، اسے آپ کس طرح دیکھتے ہیں؟

یاور عباس: بہت دکھ پہنچتا ہے۔ اس کی اجازت وہاں انگلستان میں نہیں دی جاتی ہے۔ اور اب تو روپرٹ مرڈک والے واقعے کے بعد اور بھی کم ہوگئی ہے۔ روپرٹ مرڈک جس نے آدھے سے زیادہ پریس خرید لیا تھا اس کی بہت بڑی امپائر تھی لیکن اب جب اس کا بھانڈا پھوٹا ہے تو مسٹر مرڈک اب جیل جانے والے ہیں۔ ہر چند کہ برطانیہ میں راج والی ذہنیت موجود ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ آزادی بھی وہاں موجود ہے اور انصاف میں بھی بہت زیادہ دیر نہیں لگتی اور نہ ہی کوئی شخص انصاف کے دائرے سے باہر ہے، خواہ وہ وزیر اعظم ہو یا میڈیا کنگ۔ اور یہ چیز ہندوستان میں نہیں ہے۔

ر ا: یاور عباس صاحب! 11 ستمبر کے واقعے کے بعد میڈیا کا منظر نامہ یکسر بدل گیا اور اخبارات میں دہشت گردی، شدت پسندی اور بنیاد پرستی جیسے موضوعات مرکز میں آگئے اور تقریباً ہر شے کو اسی پس منظر میں دیکھا جانے لگا۔ اس حوالے سے آپ کے کیا تاثرات ہیں؟

یاور عباس: میں برطانیہ کی بہت سی چیزوں سے بہت متاثر ہوا ہوں اور ان کا قائل بھی ہوں۔ مثلاً آزادیِ گفتار، انصاف کا حصول اور کرپشن کی کمی وغیرہ کا لیکن ایک چیز ہے جس نے برطانیہ کو بہت نقصان پہونچایا ہے اور وہ ہے یہی فکر جس کا آپ ذکر کر رہے ہیں۔ اور لیبر پارٹی کو اس کا سب سے بڑا مجرم میں اس لیے مانتا ہوں کیونکہ اس پارٹی کا نصب العین اس ذہنیت کا خاتمہ تھا جو بادشاہت کی پروردہ تھی لیکن وہ پارٹی بھی اسی ذہنیت کا حصہ بن گئی ہے۔ اس قضیے میں سب سے بڑا مجرم وہ شخص ہے جس کا نام ٹونی بلیئر ہے، اس نے اور جارج بش نے مل کر ایک تہلکہ مچا دیا اور ساری دنیا کا نظام درہم برہم کر ڈالا۔ انھوں نے برطانیہ کی دارالعوام کو گمراہ کیا اور جھوٹ بول کر حملہ کروایا۔ 9/11 کے حملے میں ملوث 24 لوگوں میں سے اٹھارہ یا انیس تو سعودی عرب کے لوگ تھے جن سے ان ممالک کی گہری دوستی ہے۔ بلکہ سعودی عرب والوں کو جہاز میں بھر کر حفاظت کے ساتھ سعودی عرب بھیجا اور دوسروں کے اوپر حملے کیے جا رہے ہیں۔ عراق میں تو کبھی طالبان کی حکمرانی یا دہشت گردی وغیرہ تھی ہی نہیں۔ بس ایک خراب آدمی تھا وہاں پر صدام حسین جو انھی کا آدمی تھا۔ صدام حسین کا تو آسانی سے تصفیہ ہو سکتا تھا پورے ملک کو تباہ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ خاص بات یہ بھی ہے کہ یہ یورپ کے ملکوں پر حملے نہیں کرتے ہیں بلکہ دوسرے براعظم کے ممالک پر حملے کرتے ہیں۔

ر ا: آپ نے کہا کہ یہ عوام کو گمراہ کر کے دوسرے ملکوں پر حملے کرتے ہیں، تو آخر اس کے محرکات کیا ہیں؟

یاور عباس: یہ بڑی عجیب چیزیں ہیں دراصل امریکہ اور برطانیہ کی آرمامنٹ انڈسٹری (عسکری قوتوں) کے شکنجے میں یہ ممالک پھنسے ہوئے ہیں۔ اگر امریکہ چھوٹی، بڑی لڑائیاں نہیں کرائے گا تو اس کی معیشت تباہ ہو جائے گی کیونکہ اس کی معیشت اس کے ہتھیاروں کی صنعت سے جڑی ہوئی ہے۔ امریکہ کی اس صورت حال کو ہم بھگت رہے ہیں۔ یہاں تک کہ اوبامہ جیسا شخص بھی جو بڑا ترقی پسند انسان بھی بے بس نظر آتا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ وہاں پر جو پریشر

گروپس ہیں خاص طور پر صیہونی طاقتیں وہ امریکہ کو اپنے چنگل سے نکلنے نہیں دیتیں۔ ایک دن آئے گا جب امریکہ کو پتہ چلے گا کہ ان کو جھانسہ دیا گیا ہے اور جس دن امریکہ نے یہ محسوس کیا وہ صیہونیوں کا بوجھ اتار پھینکیں گے۔ دراصل اسرائیل امریکہ کی امداد کے بغیر ایک دن بھی قائم نہیں رہ سکتا۔

ر ا: ہندوستان کی میڈیا میں اب غیر ملکی سرمایہ کاری بہت زیادہ ہوگئی ہے، اس کے باوجود یہاں کی میڈیا اپنے ملک کے مفاد کو کس طرح تحفظ فراہم کرسکتی ہے؟

یاور عباس: نہیں صاحب یہ چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی۔ اگر میں یہاں رہ رہا ہوتا تب ضرور میں اس پر اپنی رائے دیتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں اس کا حقدار نہیں ہوں کہ میں یہاں کی میڈیا پر تبصرہ کروں۔

ر ا: چلیے میں اپنا سوال بدل لیتا ہوں، یہ بتائیں کہ ہم لوگ جو ہندوستانی عوام ہیں وہ کس طرح کی صحافت کو پسند کریں۔ یا کسی خبر پر کس طرح اپنا ردعمل ظاہر کریں۔ عوام اور میڈیا کا دوہرا رشتہ ہے اور دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ ایسے میں عوام کن چیزوں کو پسند کرے اور کن چیزوں کو نہ کرے اس کے حوالے سے اپنے تاثرات کا اظہار کریں۔

یاور عباس: یہ بڑا گہرا سوال ہے، اس کے لیے ہمیں مختلف خانے بنانے ہوں گے۔ جو چیز اردو کے لیے بہتر ہے پتہ نہیں وہ دوسرے شعبوں کو راس آتی ہے کہ نہیں۔ اگر اردو کے حوالے سے بات کریں تو بات آگے بڑھ رہی ہے لیکن میرے خیال میں دو چیزوں پر خاص توجہ دینی چاہیے ایک تو ٹکنالوجی، کیونکہ اس سے اب لوگوں کی روزی جڑی ہوئی ہے لیکن ادب کو نہیں بھولنا چاہیے کیونکہ ادب آپ کی روح ہے۔ اگر آپ ٹکنالوجی کے سہارے آگے بڑھ بھی گئے تو ادبی روح کے بغیر اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

ر ا: یہ بات تو اردو کے حوالے سے ہوگئی لیکن دیگر شعبہ ہائے زندگی بھی تو ہیں جہاں میڈیا کا اثر ہے۔ ان سے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

ی ع: نہیں صاحب، یہ بڑے سنگین معاملات ہیں، ان پر نہ جایئے۔ چلیے میں ایک عام سی بات کہہ دوں آپ سے۔ ہمارا یہ معاشرہ ہی جھوٹ کی بنیاد پر قائم ہے اور وہ جھوٹ ہے تقسیم کا جھوٹ۔ اس تقسیم کی لعنت کے ساتھ معاشرہ کبھی درست نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس جھوٹ کو جھوٹ تصور نہ کیا جائے۔ کم از کم مان تو لیجیے کہ یہ جھوٹ ہے۔ یہ اعتراف تو کریں کہ ہم سے غلطی ہوئی۔ جب

یاور عباس

سنہ پیدائش: 1920
جائے پیدائش: چرکھری (بندیل کھنڈ)
آبائی وطن: لکھنؤ (اتر پردیش)
سکونت: لندن
ہجرت: 1949
پیشہ: بروڈ کاسٹنگ، فلم میکنگ
پہلی ملازمت: فوج 1942
بی بی سی میں ملازمت: 1949
آزادانہ فلم سازی کا آغاز: 1963

فلمیں

- انڈیا مائی انڈیا
- انڈیا کا لڈیم
- فلمس آن یوگا
- فیسز آف انڈیا (سیریز)
- گنگا میا
- کرکٹ ان انڈیا

اعتراف کرلیں گی تب آپ کو احساس ہوگا کہ کسی غلطی کو صحیح ثابت کرنا اور بھی بڑی غلطی ہے۔ پاکستان میں جب یہ بات میں پندرہ برس پہلے کرتا تھا تو لوگ مارنے مرنے پر اتر آتے تھے لیکن اب لوگ کہتے ہیں کہ ہاں صاحب تقسیم غلط ہوئی، لیکن اب تو ہوگئی اور ہم اس کو روک نہیں سکتے۔ تب میں ان سے کہتا ہوں کہ اس غلطی کو Perpetuate کرنا تو اور بھی غلط بات ہے۔ اگر تقسیم غلط ہے تو اس کو ختم کروایئے۔ دونوں جرمنی آخر کو ایک ہوئے۔ سارا یورپ ایک ہوگیا۔ یورپ کے مختلف ملکوں کے درمیان واقعی اختلافات ہیں۔ ان کے درمیان لسانی، مذہبی، جغرافیائی تمام اختلافات ہیں لیکن پھر بھی وہ ان کو ختم کر کے زمین دوز راستے بنا کر ایک ہوگئے۔ یورپ نے دیکھ لیا کہ ہم نے جو لڑائیاں لڑی ہیں اس کی وجہ سے ہم کو بڑا نقصان ہوا ہے اور انھوں نے مل کر رہنے کا فیصلہ کرلیا۔ تمام ممالک آزاد ہیں لیکن ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں۔ وہ یوروپین یونین کے تحت ایک ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کے حوالے سے میرا ماننا یہ ہے اول تو یہ دونوں الگ ریاستیں ہونی نہیں چاہیے تھیں لیکن اگر ایسا ہوتا بھی ہے تو یوروپین یونین کی طرز پر ہی کوئی حل ڈھونڈھیں۔ کتنے شرم کی بات ہے کہ ہم ایک دوسرے کو دشمن ملک قرار دیتے ہیں جو ہمارے بھائی ہیں۔ بجائے اس کے کہ تم چین سے دوستی کرو، امریکہ سے دوستی کرو اپنے بھائیوں سے دوستی کرو۔ نقشے پر ایک لکیر ہے اور اسی سے ہم الگ ہوگئے یہ کیسی حماقت ہے۔ ایک ایشین یونین بناؤ، ایک جوائنٹ ڈیفنس کا طریقہ کار بناؤ۔

ر ا: میں پھر واپس میڈیا کی طرف آتا ہوں، جب میں بی بی سی کی طرف دیکھتا ہوں تو وہ اپنا نقطۂ نظر رکھتے تو ہیں لیکن اسے بین السطور رکھتے ہیں جسے ہم encapsulation کہہ سکتے ہیں، لیکن اردو میڈیا میں چیزیں بالکل کھلی ہوئی پیش کی جاتی ہیں، جس سے عوامی جذبات برانگیختہ ہوتے ہیں، میں اس پر آپ کی رائے جاننا چاہتا ہوں۔

ی ع: میں یہاں بھی تقسیم ہی کو اس کے لیے ذمے دار مانتا ہوں۔ اور یہ تمام چیزیں اسی تقسیم کا خمیازہ ہیں جو ہم بھگت رہے ہیں اور اگر ہمیں اس بات کا ادراک ہو کہ یہ تقسیم کا خمیازہ ہیں تو شاید ہم ان کی اصلاح کا عمل بھی شروع کریں۔ خواہ ملاپ ہو خواہ نہ ہو لیکن یہ تقسیم کی وراثت کو اپنے ذہن سے نکالنا ہوگا۔ اگر ہندوستان کے لوگ اپنی سمت درست کرلیں اور محض آئین کے مطابق اپنی زندگی گزارنا شروع کردیں تو پاکستان کا قصہ آپ سے آپ ختم ہوجائے گا۔

ر ا: یاور صاحب آخر میں میں آپ سے یہ جاننا چاہوں گا کہ آپ برصغیر میں اردو کا مستقبل کیسا دیکھ رہے ہیں؟

یاور عباس: آج سے پانچ سال پہلے اگر یہ سوال آپ مجھ سے کرتے تو جواب دینے میں مجھے ذرا مشکل پیش آتی، لیکن اب میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ اردو کے لیے احساس پیدا ہونا شروع ہوا ہے اور لوگ اس بات کو سمجھ رہے ہیں کہ اردو بڑے کام کی زبان ہے اور اس کو برقرار رکھنا ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی اس حوالے سے بڑی اہمیت ہے۔ آپ لوگ جو کام ذاتی حیثیت سے baazgasht.com کام کی شکل میں کر رہے ہیں وہ بھی بہت اہم ہے کیونکہ سرکاری اداروں کا کام تو اہم ہے ہی لیکن صرف ان کے سہارے نہیں رہا جاسکتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ اردو کلام ناگری رسم الخط میں لکھتے ہیں لیکن یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ اگر ہم چھوٹی 'ہ' کی جگہ بڑی 'ح' لکھ دیں تو اس سے لفظ اور معنی بدل جائے گا اور ہندی میں اس فرق کو نہیں سمجھا جاسکتا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے گھروں میں بھی اردو کو فروغ دیں تاکہ اردو اپنی تمام تر صفات کے ساتھ ہمارے درمیان رہے۔

Raghib Akhtar, Jawahar Lal Nehru University
New Delhi - 110067

خواجہ عبدالمنتقم

بھارت کا آئین اور دساتیر عالم

دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کے چونسٹھ سال کامیابی اور سرخ روئی کے ساتھ مکمل ہونا بلاشبہ ہر ہندستانی کے لیے فخر مندی کی بات ہے۔ لیکن 26جنوری 1950کو قائم ہونے والی جمہوریت کی یہ سالگرہ ہمیں اپنی ذمہ داریوں اور ان بچے ہوئے کاموں کو پورا کرنے کی ضرورت کا بھی احساس دلاتی ہے جن کے بغیر دنیا کے کسی بھی جمہوری نظام کو مکمل طور سے عوامی نظام نہیں کہا جاسکتا۔ ہم نے جو آئین برسوں پہلے اپنے اوپر نافذ کیا تھا، اور جس میں ان برسوں کے دوران بہت سی تبدیلیاں یا ترامیم ہوتی رہی ہیں آج بھی کئی ضروری اصلاحات کی گنجائش رکھتا ہے جو بدلتے ہوئے وقت کے تقاضوں اور عوامی آرزوئوں و امنگوں کے پیش نظر مسلسل اہمیت اختیار کرتی جا رہی ہیں۔لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہمارا جمہوری آئین دنیا کے کسی بھی جمہوری آئین کے مقابلے زیادہ بہتر ، زیادہ عوامی حلقوں کی نمائندگی کرنے والا اور انسانی حقوق کو جمہوری تہذیب کا حصہ بنانے والا آئین ثابت ہوا ہے۔ اس مرتبہ کور اسٹوری میں ہم عالمی پس منظر میں اپنے آئین اور جمہوری وفاقی نظام کی اہمیت و خصوصیات کامختصر جائزہ لے رہے ۔ آئینی معاملات کے مشہور جانکار اور ماہر خواجہ عبد المنتقم کا مضمون اس سلسلے میں کلیدی اہمیت کا حامل ہے۔ دیگر تحریروں میں ہمارے وفاقی ڈھانچے اور الیکشن کمیشن کے پورے سسٹم پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ (ادارہ)

آئین کسی مملکت کا وہ اساسی قانون ہوتا ہے جو اس کے بنیادی نظریات، تصورات، اندورنی نظم ونسق کے بنیادی اصولوں اور مختلف شعبوں کے درمیان ان کے فرائض اور اختیارات کی حدود متعین کرتا ہے۔ چونکہ آئین مملکت اور شہریوں کے درمیان جو رشتہ ہے اس کی ضابطہ بندی کا کام کرتا ہے اسی لیے اسے شہری، سیاسی اور انسانی حقوق کے تحفظات کی اساس بھی کہا جاتا ہے۔ ملک کے دیگر قوانین اسی دستور کی روشنی میں وضع کیے جاتے ہیں اور تمام قوانین اس کے تابع ہوتے ہیں۔ اگر کوئی قانون دستور کے متناقض ہو یعنی اس سے مطابقت نہ رکھتا ہو تو عدالتیں ایسے قانون کو کچھ قانونی تحفظات کے تابع عدم تطابق یا انحراف کی بنا پر کالعدم قرار دے دیتی ہیں۔ انگلینڈ اور اسرائیل جن کا آئین مختلف قانونی کتابوں یا دستاویزات کی شکل میں ہے، کو چھوڑ کر تمام ممالک کا اپنا اپنا دستور ہے۔ ہمارے ملک کا بھی اپنا ایک دستور ہے جس کا مختصر نام یعنی آئینی وقانونی نام 'بھارت کا آئین' ہے، جیسا کہ آئین کی دفعہ 393 میں درج ہے۔ اسی لیے سرکاری دستاویزات میں لفظ دستور کی جگہ آئین کے لفظ کا استعمال کیا جاتا ہے۔ دساتیر عالم میں بھارت کے آئین کا شمار اس کی نمایاں خصوصیات کی بدولت اعلیٰ درجے کے دساتیر میں ہوتا ہے اور اس کی انہیں خصوصیات کے باعث ذی شرف وغیر معمولی فضیلت رکھنے والے ماہرین وناقدین قانون نے نہ صرف اس امر حقیقی کو تسلیم کیا ہے بلکہ بار بار دہرایا بھی ہے اور یہاں تک کہ اسے انسانی حقوق کے مکمل چارٹر کا نام بھی دیا ہے۔ آیئے اب ہم بھارت کے آئین کی ان خصوصیات کا ذکر کریں جن کی وجہ سے اسے یہ ممتاز حیثیت حاصل ہے اور یہ کہ اس 'اسپ مسابقہ' کو قانونی گھوڑوں کی عالمی دوڑ میں کون سا مقام حاصل ہے چونکہ کچھ متعصب اور یرقاں چشم ناقدین کا خیال، جسے خیال خام کہنا بہتر ہوگا، یہ بھی ہے کہ ہم نے اپنا آئین محض کٹنگ وپیسٹنگ کے ذریعہ یعنی دوسرے ممالک سے لیا ہے اور کچھ لوگوں نے تو اسے Melting pot of Constitution بھی کہا ہے۔ ایک عام آدمی کے لیے یہ سرقہ ہوسکتا ہے لیکن قانون کی زبان میں اسے سرقہ نہیں کہتے بلکہ اسے قابل تحسین وقابل تقلید انتخاب کہا جاتا ہے۔ ہم نے دیگر ممالک کے دساتیر سے صرف وہ باتیں لی ہیں جو ہمارے ملک اور عوام کے مفاد میں تھیں۔ قانون سازی کے عمل میں وضعی نظائر کا استعمال مقدم ہوتا ہے خواہ وہ نظائر بنیادی ہوں یا ترغیبی۔

ہم سب سے پہلے اپنے آئین میں انسانی حقوق کے تحفظ کی بات کرتے ہیں چونکہ انسانی حقوق کو آفاقی حیثیت حاصل ہے اور آج تمام دنیا میں انسانی حقوق کے تحفظ کا چرچا ہے۔ دراصل اس پرآشوب دور میں انسانی حقوق ہی بنی نوع انسان کو ہر سطح پر خواہ وہ انفرادی ہوں، اجتماعی یا عالمی، مربوط کیے ہوئے ہیں ورنہ انسانی زندگی کا

برطانیہ | امریکہ | کناڈا | آسٹریلیا

تحفظ تو کیا اس کا وجود بھی خطرے میں پڑ جاتا۔ دور حاضر میں انسانی حقوق کی خلاف ورزی کرنے والا ملک مہذب ممالک کی صف میں نہیں کھڑا ہوسکتا۔ جہاں تک انسانی حقوق کی بات ہے بہت سے ممالک نے جن میں افریقی اور مشرق وسطی کے بہت سے چھوٹے چھوٹے ممالک بھی شامل ہیں اپنے اپنے دستور میں انسانی حقوق کو شامل کیا ہے۔ لیکن کچھ ممالک ایسے بھی ہیں جنہوں نے اس اصطلاح کا استعمال نہیں کیا ہے لیکن ان کے آئین میں انسانی حقوق کو مکمل تحفظ فراہم کیا گیا ہے۔ اس کی سب سے بڑی مثال ہمارا ملک ہندوستان ہے جس کے آئین کو، جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، اگر انسانی حقوق کا چارٹر کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

آئین میں انسانی حقوق کا تحفظ اور قانونی چارۂ کار کا حق

جہاں تک بھارت کے آئین میں انسانی حقوق کے تحفظ کا سوال ہے اس سلسلے میں یہاں پر یہ بات واضح کرنا ضروری ہے کہ آئین میں کہیں بھی انسانی حقوق جیسے الفاظ کا استعمال نہیں کیا گیا ہے بلکہ انھیں بنیادی حقوق کا نام دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ آئین میں مملکت کی حکمت عملی کے ہدایتی اصولوں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ ان اصولوں میں بھی مختلف انسانی حقوق کے تحفظ کی بات کہی گئی ہے۔ یہاں یہ بات بھی واضح کرنا ضروری ہے کہ ہر انسانی حق بھارت کے آئین کی رو سے بنیادی حق نہیں ہے۔ مثلاً انسانی حقوق کے عالمگیر اعلامیے کے مطابق جائیداد کا حق ایک انسانی حق ہے لیکن بھارت کے آئین میں یہ حق بنیادی حق کے طور پر تسلیم نہیں کیا جاتا۔

بھارت کے آئین کے جز 3 (دفعات 12 تا 35) میں بنیادی حقوق کی شکل میں انسانی حقوق کے تحفظ کی بابت توضیحات کی گئی ہیں۔ دفعہ 13 میں بنیادی حقوق کے تناقض یا ان کو کم کرنے والے قوانین کو باطل قرار دیا گیا ہے۔ دفعہ 14 میں قانون کی نظر میں مساوات اور قانون کے مساویانہ تحفظ کی بات کہی گئی ہے۔ دفعہ 15 میں مذہب، نسل، ذات، یا جنس یا مقام پیدائش کی بنا پر کسی بھی طرح کے امتیاز کی ممانعت کی گئی۔ دفعہ 16 میں سرکاری ملازمت کے لیے سبھی کو مساوی مواقع فراہم کیے گئے ہیں۔ دفعہ 17 کے ذریعے چھوت چھات کا خاتمہ کیا گیا ہے۔ دفعہ 18 کے ذریعے خطابات کا خاتمہ کیا گیا ہے، دفعہ 19 میں تقریر اور اظہار خیال کی آزادی، امن پسندانہ طریقے سے اور غیر مسلح طور پر جمع ہونے، انجمنیں یا یونین قائم کرنے، بھارت میں کہیں پر بھی آنے جانے او رکہیں پر بھی بود و باش اختیار کرنے، کوئی بھی پیشہ اختیار کرنے یا کاروبار کرنے کی آزادی عطا کی گئی ہے۔ دفعہ 20 میں ایک ہی جرم کے لیے دوبار مقدمہ چلانے یا دوبار سزا دینے کی ممانعت کی گئی ہے۔ دفعہ 21 میں جان اور شخصی آزادی کے تحفظ کو یقینی بنایا گیا ہے اور واضح طور پر یہ کہا گیا ہے کہ کسی شخص کو اس کی جان یا شخصی آزادی سے صرف قانون کے مطابق ہی محروم کیا جاسکتا ہے نہ کہ دیگر طور پر۔ دفعہ 21 الف میں 6 سے 14 سال تک کی عمر کے بچوں کو مفت اور لازمی تعلیم دینے کی بات کہی گئی ہے۔ دفعہ 22 کے مطابق کسی بھی ایسے شخص کو جسے گرفتار کیا گیا ہو، گرفتار کرنے کی وجوہات بتانا ضروری ہے ورنہ اسے حوالات میں نہیں رکھا جاسکتا یعنی گرفتاری کی وجہ سے جس قدر جلد ہو سکے آگاہ کیا جانا چاہیے اور گرفتار شدہ شخص کو قانونی پیشہ ور سے صلاح لینے اور پیروی کروانے کے حق سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔ علاوہ ازیں ہر ایسے شخص کو جسے گرفتار کیا گیا ہو یا حوالات میں رکھا گیا ہو 24 گھنٹے کے اندر اندر قریب ترین مجسٹریٹ کے روبرو پیش کیا جانا چاہیے۔ یہاں یہ بات وضاحت طلب ہے کہ چوبیس گھنٹے کی مدت میں سفر کی مدت یعنی مقام گرفتاری سے عدالت تک پہنچنے میں صرف ہونے والا وقت شامل نہیں ہے۔ دفعہ 23 میں انسانوں کی تجارت اور جبری خدمت کی ممانعت کی گئی ہے۔ دفعہ 24 میں بچوں کو کارخانوں وغیرہ میں مامور کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ دفعہ 25 میں مذہب کی آزادی کا حق یعنی آزادیِ ضمیر اور مذہب کو قبول کرنے اور اس کی پیروی اور تبلیغ کی آزادی، دفعہ 26 میں مذہبی امور کے انتظام کی آزادی کی بات کہی گئی ہے۔ دفعہ 27 کے مطابق کسی شخص کو ایسے ٹیکس ادا کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا جن کی آمدنی کسی خاص مذہب یا مذہبی فرقے کی ترقی پر صرف کی جائے۔ دفعہ 29,30 ثقافتی اور تعلیمی حقوق کے تحفظ کو یقینی بناتی ہیں۔ دفعہ 29 میں اقلیتوں کو اپنی زبان، رسم الخط اور ثقافت کو محفوظ رکھنے کا حق دیا گیا ہے۔ ساتھ ہی یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ کسی بھی سرکاری ادارے میں یا کسی ایسے ادارے میں، جسے سرکار سے مالی امداد ملتی ہو، داخلہ دینے سے محض مذہب، نسل، ذات، زبان، یا ان میں سے کسی کی بنا پر انکار نہیں کیا جائے گا۔ دفعہ 30 میں اقلیتوں کو اپنے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور ان کا انتظام کرنے کا حق عطا کیا گیا ہے۔

اگر متذکرہ بالا حقوق میں سے کسی بھی حق کی خلاف ورزی کی جاتی ہے تو متاثرہ شخص دفعہ 32 کے تحت سپریم کورٹ سے اور دفعہ 226 کے تحت ہائی کورٹ سے رجوع کرسکتا ہے۔

> ہم سب سے پہلے اپنے آئین میں انسانی حقوق کے تحفظ کی بات کرتے ہیں چونکہ انسانی حقوق کو آفاقی حیثیت حاصل ہے اور آج تمام دنیا میں انسانی حقوق کے تحفظ کا چرچا ہے۔ دراصل اس پرآشوب دور میں انسانی حقوق ہی بنی نوع انسان کو ہر سطح پر خواہ وہ انفرادی ہوں، اجتماعی یا عالمی، مربوط کیے ہوئے ہیں ورنہ انسانی زندگی کا تحفظ تو کیا اس کا وجود بھی خطرے میں پڑ جاتا۔ دور حاضر میں انسانی حقوق کی خلاف ورزی کرنے والا ملک مہذب ممالک کی صف میں نہیں کھڑا ہوسکتا۔

روس | جرمنی | آئرلینڈ | جاپان

دنیا کے مختلف ممالک کے آئین کی خصوصیات

نام ممالک	بھارت	برطانیہ	امریکہ	روس	جاپان	فرانس	جرمنی
بنیادی حقوق کا تحفظ	تحفظ بذریعہ آئین	تحفظ بذریعہ Judgemade Law	تحفظ بذریعہ آئین	تحفظ بذریعہ آئین	تحفظ بذریعہ آئین	تحفظ بذریعہ آئین	تحفظ بذریعہ آئین
لچکدار/غیر لچکدار	لچکدار وغیر لچکدار	لچکدار	غیر لچکدار	غیر لچکدار	غیر لچکدار	غیر لچکدار	غیر لچکدار
وحدانی/وفاقی	وفاقی مع وحدانی رجحان	وحدانی	وفاقی	وفاقی	وحدانی	وحدانی	وفاقی
پارلیمانی/صدارتی جمہوریت	پارلیمانی جمہوریت	پارلیمانی جمہوریت	صدارتی جمہوریت	نیم صدارتی جمہوریت	پارلیمانی جمہوریت	نیم صدارتی ونیم وزارت عظمیٰ والی (Quasi prime ministerial)	پارلیمانی جمہوریہ
پارلیمنٹ/آئین کی بالادستی	آئین کی بالادستی	پارلیمنٹ کی بالادستی	آئین کی بالادستی	.....	آئین کی کی بالادستی	پارلیمنٹ کی بالادستی محدود اختیارات کے ساتھ	.....
جمہوریہ/بادشاہت	جمہوریہ	آئینی بادشاہت	جمہوریہ	جمہوریہ	آئینی بادشاہت	جمہوریہ	جمہوریہ
صدر	عاملانہ سربراہ/بالواسطہ انتخاب	.....	راست انتخاب	راست انتخاب	.....	راست انتخاب	بالواسطہ انتخاب
دوہری شہریت	واحد شہریت	دوہری شہریت	دوہری شہریت	دوہری شہریت	واحد شہریت	دوہری شہریت	اصولی طور پر دوہری شہریت نہیں
بطریق قانونی/قانون کے ذریعے قائم کیا ہوا ضابطہ	قانون کے ذریعے قائم کیا ہوا ضابطہ (Procedure established by Law)	قانون کی بالادستی	بطریق قانونی (Due process of Law)	.....	قانون کے ذریعے قائم ہوا ضابطہ	.....	.....

آئین کے جز4 میں شامل کیے گئے حکمت عملی کے ہدایتی اصولوں (دفعات 36 تا 51) میں لوگوں کی بہبودی کے لیے ایک بہتر نظام قائم کرنے، مساوات مردوزن جس میں دونوں کو برابر مزدوری کا حق بھی شامل ہے، مزدوروں کو قابل گزارہ اجرت دینے، صنعتوں کے انتظام میں کام گروں کے اشتراک، تمام شہریوں کے لیے یکساں سول کوڈ، بچوں کے لیے مفت اور لازمی تعلیم، درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبیلوں اور دوسرے زیادہ کمزور طبقوں کے تعلیمی ومعاشی مفادات کے فروغ، غذائیت کی سطح اور معیارِ زندگی بلند کرنے اور صحت عامہ کو ترقی دینے، زراعت اور افزائش حیوانات، ماحولیاتی تحفظ اور جنگلی جانوروں کی حفاظت، قومی اہمیت کی یادگاروں اور مقامات اور اشیا کی حفاظت، بین الاقوامی امن وسلامتی کے فروغ وغیرہ کی بات کہی گئی ہے۔

اس کے علاوہ آئین کی دفعہ 51 الف جو بنیادی فرائض سے متعلق ہے اس میں بھی بھائی چارے کے فروغ، خواتین کی تعظیم، ملک کی ملی جلی ثقافت کے تحفظ اور اس کی برقراری، قدرتی ماحول کو، جس میں جنگلات، جھیلیں، دریا اور جنگلی جانور شامل ہیں، محفوظ رکھنے اور جانوروں کے ساتھ محبت وشفقت کا جذبہ رکھنے، انسان دوستی، قومی جائیداد کا تحفظ کرنے اور تشدد سے گریز کرنے کی بات کہی گئی ہے۔

جیسا کہ اوپر درج ہے آئین میں کہیں بھی انسانی حقوق جیسے الفاظ کا استعمال نہیں کیا گیا ہے بلکہ انھیں بنیادی حقوق کا نام دیا گیا ہے لیکن اس کے باوجود آج ہندوستان کا شمار دنیا کے ان ممالک میں ہوتا ہے جن میں انسانی حقوق کے تحفظ سے متعلق قوانین میں کوئی کمی نہیں پائی جاتی۔ اگر ہم آئین کی تمہید پر نظر طائرانہ ہی ڈالیں تو اس سے یہ بات ظاہر ہوجاتی ہے کہ اس میں سماجی، معاشی اور سیاسی انصاف، اظہار رائے اور عبادت کی آزادی، جیسی باتوں کو یقینی بنانے کی بات کہی گئی ہے اور ہندوستان کو ایک مقتدر سماجوادی سیکولر عوامی جمہوریہ کہا گیا ہے جبکہ کچھ ایسے ممالک بھی ہیں جن کے دساتیر کی نہ صرف تمہید میں بلکہ دیگر دفعات میں بھی انسانی حقوق کی اصطلاح کا استعمال کرتے ہوئے ان کے تحفظات کی بات تو کہی گئی ہے لیکن ان میں سے کچھ ممالک میں تو صحیح معنوں میں جمہوری نظام بھی قائم نہیں ہوا ہے۔ چونکہ ہمارا ملک دنیا کے تمام ممالک سے دوستی میں یقین رکھتا ہے اور اس کا خواہاں بھی ہے۔ اس لیے کسی بھی ملک کا نام لے کر اس کی تنقید سفارتی وبین الاقوامی تعلقات کے لحاظ سے قرین مصلحت نہیں۔

آیئے اب ہم اپنے آئین کے مختلف ماخذ پر غور

کریں اور یہ دیکھیں کہ ہم نے دیگر ممالک کے دساتیر سے کیا لیا ہے اور یہ کہ ہمارے اس اخذی عمل سے ہمارے آئین کی جو خصوصیات ہیں انھیں کس حد تک تقویت حاصل ہوئی ہے اور وہ کس حد تک بین الاقوامی پیمانوں پر کھری اترتی ہیں اور آئینی درجہ بندی میں ہندوستان کا مقام اور مسابقتی حیثیت کیا ہے۔

برطانیہ سے ہمیں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ، 1935 کی شکل میں دیگر باتوں کے ساتھ ساتھ وفاقی ڈھانچہ ورثہ میں ملا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں برطانیہ کے پارلیمانی نظام، قانون کی بالادستی (Rule of Law)، واحد شہریت، نظام قانون سازی، مجلس کابینہ کی تشکیل، کمپٹرولر اور آڈیٹر جنرل کا عہدہ، امتیازی (Prerogative) رٹ اور دو ایوانی مقننہ و دو ایوانی نظام سے ترغیب ملی اور ہم نے ان باتوں کو اپنے آئین کا ممکنہ حد تک حصہ بنایا۔

امریکہ سے ہم نے بنیادی حقوق، عدلیاتی نظرثانی (Judicial Review)، نائب صدر کا عہدہ، عدلیہ کی آزادی، صدر پر اتہام بدنظمی یا ان کا مواخذہ (Impeachment)، سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے ججوں کے مواخذے کا طریقۂ کار جیسی باتوں کو اپنے ملک کی صورت حال کے مطابق آئین کا حصہ بنایا۔

کناڈا سے ہم نے نیم وفاقی ڈھانچے کے ساتھ ساتھ مرکز کے ذریعے ریاستی گورنروں کی تقرری اور سپریم کورٹ کے مشاورتی/نظرثانی کے اختیار جیسی باتوں کو لے کر اپنے آئین میں شامل کیا۔

آسٹریلیا سے ہمیں اپنے آئین میں متوازی فہرست، تجارتی آزادی، بین ریاستی تجارت و پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس جیسی باتوں کو شامل کرنے کی ترغیب ملی۔

روس سے ہمیں اپنے آئین کی تمہید وضع کرنے اور آئین میں بنیادی فرائض کو شامل کرنے کی ترغیب ملی۔

جرمنی کے آئین کی توضیعات کے مدنظر ہم نے اپنے آئین میں ناگہانی حالات میں کچھ حقوق کی معطلی اور ناگہانی حالات سے متعلق دفعات شامل کیں۔

آئرلینڈ سے ہم نے مملکت کی حکمت عملی کے ہدایتی اصول اور صدر مملکت کے انتخاب کا طریقۂ کار اور صدر کے ذریعے اراکین کی نامزدگی جیسی باتیں اپنے آئین میں بھی شامل کیں۔

جاپان سے ہمیں 'قانون کے ذریعے قائم کیا ہوا ضابطہ' (Procedure established by Law) جیسے تصور کو اپنے قانون میں شامل کرنے کا موقع ملا اور ہم نے اسے دفعہ 21 کا حصہ بنایا اور اس میں صاف صاف یہ بات کہی کہ کسی بھی شخص کو صرف قانون کے ذریعے قائم کیے ہوئے ضابطے سے ہی اس کی جان یا شخصی آزادی سے محروم کیا جاسکتا ہے۔

صرف یہی نہیں ہمارے واضعین وقانون ساز اداروں نے دیگر ممالک کے دساتیر اور انسانی حقوق سے متعلق بین الاقوامی دستاویزات جیسے انسانی حقوق کا عالمگیر اعلامیہ، 1948، بین الاقوامی منشور برائے معاشی، سماجی اور ثقافتی حقوق، 1966، بین الاقوامی منشور برائے شہری اور سیاسی حقوق، 1966، مذہب یا عقیدے کی بنیاد پر سبھی طرح کی عدم برداشت اور امتیاز کے خاتمے سے متعلق اعلامیہ، 1981، قومی یا نسلی، مذہبی اور لسانی اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے افراد کے حقوق سے متعلق اعلامیہ، 1992، اقوام متحدہ 2000 سالہ اعلامیہ اور متمدن اقوام کے مابین ہم کلامی کے لیے اقوام متحدہ کا عالمی ایجنڈا و دیگر عالمی اہمیت کی حامل دستاویزات کا بھی مطالعہ کیا اور ان سے ماخوذ باتوں کو معقول وجہ کی بنیاد پر آئین میں شامل کیا۔ اسی لیے ہمارے آئین کی مندرجہ بالا خصوصیات جن کا چند صفحات میں تفصیلی احاطہ کرنا ممکن نہیں، اس بات کا جیتا جاگتا اور دستاویزی ثبوت ہیں کہ ہمارے ملک کے آئین میں مجموعی طور پر لگ بھگ وہ سب کچھ ہے جو دیگر ممالک کے آئین میں مجموعی یا منتشر طور پر موجود ہے۔

بھارت کے آئین کو اپنی مخصوص خصوصیات اور تفصیلی توضیعات کی وجہ سے کبھی ناکامی کا منہ نہیں دیکھنا پڑا۔ لغزش اگر ہوئی ہے تو ان لوگوں کی جانب سے جنہیں اس آئین کے اطلاق کا کام سونپا گیا تھا۔ بھارت کے آئین کی کچھ دیگر اہم خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں—

یہ وفاقی بھی ہے اور وحدانی بھی

مملکتِ وحدانی میں جہاں وحدانی آئین لاگو ہوتا ہے تمام اختیارات مرکزی حکومت کو حاصل ہوتے ہیں جبکہ وفاقی حکومت میں جہاں وفاقی آئین لاگو ہوتا ہے اختیارات کی تقسیم اس طرح کی جاتی ہے کہ کچھ اختیارات مرکز کے پاس ہوتے ہیں اور کچھ اختیارات ریاستوں کے پاس۔ مرکز اور ریاستوں یعنی دونوں کو ہی اپنے اپنے دائرۂ اختیار میں کام کرنے، فیصلہ کرنے اور کسی قسم کے دیگر فرائض کی انجام دہی کے معاملے میں مکمل آزادی حاصل ہوتی ہے۔ جہاں تک بھارت کے آئین کا سوال ہے اُس کے بارے میں مختلف لوگوں کی الگ الگ رائے ہے۔ کچھ کا کہنا ہے کہ یہ وفاقی ہے تو کچھ لوگوں کی یہ رائے ہے کہ یہ نیم وفاقی ہے لیکن اس کا ڈھانچہ اس قسم کا رکھا گیا ہے کہ ہنگامی حالات میں یہ وحدانی آئین کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ البتہ وہ لوگ جو آئین وضع کرنے کے کام سے جڑے ہوئے تھے اُن کی رائے یہی تھی کہ بھارت کا آئین وفاقی ہے۔ ڈاکٹر امبیڈکر کا کہنا تھا کہ بہت سی مختلف نوعیت کی توضیعات کے باوجود مرکز کو ایسے اختیارات دیے گئے ہیں کہ وہ ریاستوں کے اختیارات پر غالب آسکیں لیکن پھر بھی یہی کہا جائے گا کہ بھارت کا آئین اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک وفاقی آئین ہے۔

جہاں تک وفاقی قانون کا سوال ہے اُس میں کچھ خصوصیات کا ہونا لازمی ہے۔ اوّل یہ کہ آئین کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہو، عدالتوں کو مکمل اختیارات حاصل ہوں، اختیارات کی تقسیم کی گئی ہو اور دوہری حکومت ہو۔ یہاں اس بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ اگرچہ بھارت کے آئین میں یہ چاروں باتیں موجود ہیں لیکن اس کے باوجود کچھ بنیادی معاملات میں یہ جانے مانے وفاقی نظاموں سے کسی حد تک مختلف ہے مثلاً یہ کہ امریکہ اور آسٹریلیا میں وفاق خودمختار اور آزاد ریاستوں کے درمیان رضاکارانہ طور پر وجود میں آیا اور اسی طرح کناڈا کی طرح کسی وحدانی ریاست کو خودمختار بنانے کے لیے اُسے ایک وفاقی یونین میں بدلا جاسکتا ہے۔

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ، 1935 وضع کیے

جانے تک ہندوستان کا آئین وحدانی تھا۔ اس ایکٹ میں برٹش پارلیمنٹ نے کچھ خودمختار یونٹ بنائے اور انھیں ایک وفاق کی شکل دے کر وفاقی نظام قائم کیا۔ جہاں تک بھارت کے آئین کا سوال ہے اسے بھارت کے عوام نے قانون ساز اسمبلی میں اپنے نمائندوں کے ذریعے قبول کیا ہے اور اس کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ خودمختار ریاستوں کے درمیان کیے گئے کسی معاہدے کا نتیجہ ہے۔

اندرونی طور پر لچیلا پن

بھارت کا آئین اپنی نوعیت کے اعتبار سے لچیلا ہے اور اس میں حسبِ ضرورت کسی وقت بھی ترمیم کی جاسکتی ہے لیکن اس کی ترمیم بھی اس میں دیے گئے طریقے کے مطابق یعنی دفعہ 368 کے مطابق ہی کی جاسکتی ہے البتہ آئین کے بنیادی ڈھانچے میں کوئی تبدیلی نہیں کی جاسکتی۔ بھارت کے آئین کے لچیلے پن کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس میں تاہنوز 98 ترامیم ہوچکی ہیں۔

عدالتی نظرثانی اور پارلیمنٹ کی خود مختاری

بھارت کے آئین میں عدالتی نظرثانی اور پارلیمنٹ کی خودمختاری کا بہترین امتزاج ہے اور یہ اس آئین کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ جہاں ایک طرف سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کو، حسبِ صورت، کسی قانون کو غیر آئینی یا کالعدم کرنے کا حق حاصل ہے تو دوسری طرف پارلیمنٹ کو قانون بنانے کے معاملے میں مکمل خودمختاری حاصل ہے اور دونوں ہی سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے دائرۂ اختیار میں دخل اندازی نہیں کریں گے لیکن اس کے باوجود کبھی کبھی دونوں کے مابین ٹکراؤ کی سی صورت پیدا ہوجاتی ہے جو ہمارے جیسے ملک میں جہاں عدلیہ اور عاملہ ایک دوسرے سے علیحدہ ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ قانون ساز ادارے مکمل طور پر خودمختار ہیں یعنی جہاں عدلیہ کو مکمل آزادی حاصل ہے وہاں اس قسم کا ٹکراؤ نہیں ہونا چاہیے۔

بالغ رائے دہی

بھارت کے آئین کے مطابق ہندوستان کے تمام بالغ شہریوں کو، خواہ وہ مرد ہوں یا عورت، جن کی عمر 18 سال ہوچکی ہے ووٹ ڈالنے کا حق ہے۔ اس کی بنیاد تمام دنیا میں رائج بالغ رائے دہی کے اصول پر ہے۔ اس معاملے میں بھی ہم کسی سے کم نہیں۔ آج بھی کچھ ممالک نظام جمہوریت سے محروم ہیں اور کچھ ممالک میں نام نہاد جمہوریت ہے۔ ان ممالک میں لوگوں کو صحیح معنوں میں آج بھی مکمل حق رائے دہی حاصل نہیں۔

> آئین کے جز 4 میں شامل کیے گئے حکمت عملی کے ہدایتی اصولوں (دفعات 36 تا 51) میں لوگوں کی بہبودی کے لیے ایک بہتر نظام قائم کرنے، مساوات مرد وزن جس میں دونوں کو برابر مزدوری کا حق بھی شامل ہے، مزدوروں کو قابل گزارہ اجرت دینے، صنعتوں کے انتظام میں کام گروں کے اشتراک، تمام شہریوں کے لیے یکساں سول کوڈ، بچوں کے لیے مفت اور لازمی تعلیم، درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبیلوں اور دوسرے زیادہ کمزور طبقوں کے تعلیمی ومعاشی مفادات کے فروغ، غذائیت کی سطح اور معیارِ زندگی بلند کرنے اور صحت عامہ کو ترقی دینے، زراعت اور افزائش حیوانات، ماحولیاتی تحفظ اور جنگلی جانوروں کی حفاظت، قومی اہمیت کی یادگاروں اور مقامات اور اشیا کی حفاظت، بین الاقوامی امن وسلامتی کے فروغ وغیرہ کی بات کہی گئی ہے۔

پارلیمانی طریقۂ حکومت

ہندوستان میں پارلیمانی نظامِ حکومت قائم ہے حالانکہ کبھی کبھی صدارتی نظام حکومت قائم کرنے کی بات سامنے آتی رہتی ہے۔ موجودہ نظام میں بھارت کے صدر کا آئین میں دیے گئے طریقۂ کار کے مطابق انتخاب کیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ حکومت سازی کے معاملے میں کیبنٹ سسٹم اختیار کیا جاتا ہے۔ کابینہ پارلیمنٹ کو جوابدہ ہوتی ہے۔ صدر یونین کا عاملانہ سربراہ ہوتا ہے لیکن وہ وزرائے کونسل کے صلاح ومشورے کے مطابق ہی کام کرتا ہے۔

ہندوستانی ریاستوں کا بھارت میں شمول

بھارت کے آئین کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ تقسیمِ ہند کے بعد ہندوستان کی 552 ریاستیں مملکتِ بھارت میں شامل اور ضم ہوگئیں۔

بین الاقوامی امن وسلامتی کا فروغ

متذکرہ بالا خصوصیات کے علاوہ بھارت کے آئین کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں واضح طور پر یہ بات کہی گئی ہے کہ بین الاقوامی امن اور سلامتی کو فروغ دینے، قوموں کے مابین منصفانہ اور باعزت تعلقات رکھنے اور بین الاقوامی قانون اور عہد ناموں کے وجوب اور بین الاقوامی تنازعات ثالثی کے ذریعے طے کرنے کی کوشش اور حوصلہ افزائی کی جائے گی۔

دنیا کا سب سے طویل آئین

بھارت کے آئین کی سب سے آخری تو نہیں بلکہ ایک دیگر خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ دنیا کا سب سے طویل آئین ہے اس میں 395 دفعات، 22 جز اور 12 جدول شامل ہیں۔ اس میں شامل الفاظ کی کل تعداد 1,17,369 ہے جبکہ امریکہ کے آئین میں شامل الفاظ کی کل تعداد تقریباً ساڑھے 4 ہزار ہے۔

مندرجہ بالا چارٹ اس بات کا مظہر اور دستاویزی ثبوت ہے کہ بھارت کا آئین بیک وقت ان تمام خصوصیات کا حامل ہے جو دنیا کے بیشتر دساتیر میں منتشر طور پر پائی جاتی ہیں۔ پھر ہمیں اپنے آئین پر ناز کیوں نہ ہو!

نوٹ: چارٹ میں جن ممالک کے قوانین کو غیر لچکدار بتایا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ان میں ترمیم نہیں ہوسکتی۔ دراصل انہیں اس لیے غیر لچکدار بتایا گیا ہے کہ ان ممالک میں آئینی ترامیم کا عمل دِقّت طلب ہے۔ برطانیہ میں بنیادی حقوق کے تحفظ کے بارے میں Judge made Law کا اشارہ اس لیے کیا گیا ہے کہ برطانیہ کا آئین تحریری شکل میں یکجا نہیں ہے بلکہ وہ دیگر دستاویزات پر مشتمل ہے جبکہ متذکرہ بالا دیگر ممالک کے دساتیر تحریری شکل میں موجود ہیں۔

(مضمون نگار ایمٹی یونیورسٹی میں وزیٹنگ پروفیسر ہیں اور حکومت ہند کے ایڈیشنل لیجسلیٹو کاؤنسل اور قومی مذہبی ولسانی اقلیتی کمیشن کے ڈائریکٹر رہ چکے ہیں۔ اس کے علاوہ دستور وانسانی حقوق سے متعلق کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں)

Khwaja Abdul Muntaqim
Dharma Aptt, 2-I.P.Extn., Delhi-110092

انظار عالم

ہندوستان کا وفاقی نظام: ایک مطالعہ

ہندوستانی جمہوریہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ سبھی علاقوں کی جداگانہ اہمیت کو برقرار رکھتے ہوئے انھیں اپنی ضرورت اور سہولت کے مطابق حکومتی اور انتظامی آزادی دیتا ہے۔ ملک کے آئین میں اس 'وفاقی ڈھانچے' کے لیے تمام ضروری ضوابط کی نشان دہی کردی گئی ہے۔ تاہم یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ہندوستانی آئین وفاقی نظام حکومت کے نفاذ کی راہ ہموار تو کرتا ہے، لیکن آئین میں کہیں بھی 'وفاق' کی اصطلاح کا استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ دوسری طرف دستور ہند کی دفعہ 1 بیان کرتی ہے کہ 'انڈیا' جس کا دوسرا نام بھارت ہے، اور جو مختلف ریاستوں پر مشتمل ایک یونین ہے، ایک ایسی تعبیر ہے، جس سے دو چیزوں کا تصور سامنے آتا ہے۔ اول یہ کہ، امریکہ کے برعکس ہندوستانی وفاق مختلف اکائیوں کے درمیان ہوئے کسی معاہدے کا نتیجہ نہیں ہے۔ دوم یہ کہ، اکائیوں (ریاستوں) کو وفاق سے علاحدہ ہونے کا کوئی حق نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستانی وفاق کی ریاستوں کا بذات خود اپنا کوئی مستقل وجود نہیں ہے۔ پارلیمنٹ ان کی اجازت کے بغیر ان کے نام اور علاقوں کو تبدیل کرسکتی ہے۔

ہندوستانی آئین ساز اسمبلی کے ارکان اس بات کے قائل تھے کہ ہندوستان جیسے وسیع ملک کی حکومت ایک مرکز سے مؤثر انداز میں نہیں چلائی جاسکتی اور ان کی یہ رائے تھی کہ حکمرانی کے لیے وفاقی نظام کو اپنانا بہتر ہے۔ نسل، مذہب اور زبان کے تنوع نے بھی انھیں ایک وفاقی پالیسی کو منتخب کرنے پر آمادہ کیا، کیوں کہ ہندوستان کے کثیر ثقافتی ماحول میں یہی ایک نظام ہے، جو مقامی اہمیت کے حامل معاملات میں ریاستوں کی خود مختاری کو تحفظ فراہم کرتے ہوئے ملک کے اتحاد و یکجہتی کو بھی یقینی بنا سکتا ہے۔ اس بات کا باسانی مشاہدہ کیا جاسکتا ہے کہ ہندوستانی آئین ایک عام وفاق کی تمام خصوصیات کو نہیں اپناتا، بلکہ بہت سی جگہوں پر اس سے انحراف کرتا ہے۔ اسی انحراف کے پیش نظر ناقدین نے ہندوستانی آئین کے مکمل وفاقی کردار کو چیلنج کیا ہے اور اسے نیم وفاقی قرار دیا ہے۔ مثلاً کے سی وھیئر (K. C. Wheare) کا کہنا ہے کہ: "ہندوستانی یونین ضمنی طور پر وحدانی خصوصیات کی حامل ایک وفاقی ریاست ہونے کے بجائے ضمنی طور پر وفاقی خصوصیات کی حامل ایک وحدانی ریاست ہے"۔ گرینول آسٹن (Granville Austin) ہندوستانی وفاق کو ہندوستان کی مخصوص ضرورتوں کو پورا کرنے والا ایک نئی قسم کا وفاق قرار دیتے ہوئے اس نقطۂ نظر سے اتفاق کرتا ہے۔

دستور ہند کے معماروں نے دستور کو وفاقی کردار کا حامل بنایا ہے، بنیادی طور پر اس کی دو وجوہات ہیں:

1. ایک وفاقی ریاست ایک وحدانی ریاست سے اس وقت زیادہ مؤثر ہوتی ہے جب اس کے علاقے کا رقبہ ہندوستان کی طرح انتہائی وسیع ہو۔
2. ایک وفاقی ریاست ایک وحدانی ریاست سے اس صورت میں زیادہ مؤثر ہوتی ہے جب اس کی آبادی کے مختلف گروپ ہندوستان کی طرح الگ الگ خود مختار ریاستوں میں مرتکز حالت میں رہتے ہوں۔

ہندوستانی وفاقی نظام کی حقیقی نوعیت سے متعلق نزاع کو حل کرنے کے لیے، یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ایک وفاقی نظام کا کیا تقاضا ہے اور اس کی خاص خصوصیات کیا ہیں۔ ریاستی حکومتیں نہ مرکزی حکومت کی ایجنٹ ہیں اور نہ ہی دونوں ایک دوسرے سے ان کے اختیارات مستعار لے سکتی ہیں، بلکہ اس کے برعکس دونوں: مرکزی اور ریاستی حکومتیں صرف دستور سے اپنے اختیارات حاصل کرتی ہیں۔

دستور ہند کی وفاقی خصوصیات

مرکز- ریاست تعلقات کے تناظر میں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی وفاق کی اہم خصوصیات کا جائزہ لیا جائے۔

آئین کی بالا دستی: ایک وفاقی نظام میں آئین ہمیشہ بالاتر ہوتا ہے۔ ایک وفاقی آئین مرکزی حکومت اور ریاستی حکومتوں کے اختیارات کے درمیان توازن برقرار رکھتا ہے۔ یہ دونوں حکومتوں کو ان کے متعلقہ دائرہ کار میں آزادی کی ضمانت دیتا ہے۔ دونوں حکومتوں میں سے کسی کو بھی یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ دستور کی ان دفعات کو منسوخ کرے جو ان کے اختیارات کی وضاحت اور تحدید کرتی ہیں۔ آئین کی پیروی دونوں پر لازم ہے۔ یہ (آئین کی پیروی کا) مطالبہ اسی وقت پورا ہوتا ہے جب یہ تسلیم کیا جائے کہ آئین ہی ملک کا بالاتر قانون' ہے اور تمام اختیارات وہیں سے صادر ہوتے، اسی کے ماتحت چلتے اور اسی کے ذریعے ان پر نگرانی رکھی جاتی ہے۔ ہندوستان میں بھی ہمارے دستور کے ذریعے یہ مطالبہ پورا کیا جاتا ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم نے ایک وفاقی نظام اپنایا ہے۔

ایک تحریری آئین: حکومت کے ایک وفاقی نظام کی پہلی ضرورت یہ ہے کہ آئین تحریری شکل میں ہو۔ یہ اس لیے ضروری ہے کیوں کہ 'وفاق' دو حکومتوں: وفاقی حکومت اور اس کی ماتحت اکائیوں (صوبوں) کے درمیان ایک معاہدہ ہے اور کسی بھی معاہدے کی شرائط کا واضح اور تحریری ہونا لازمی ہے۔ ہندی آئین تحریری ہے۔

1950 میں نافذ اصل دستور 395 دفعات اور 7 ذیلی دفعات پر مشتمل ہے۔ دستور اپنی موجودہ شکل (مارچ 2011) میں ایک مقدمہ اور 22 ابواب پر مشتمل ہے، جس میں اصلی دفعات کی جگہ شامل کی گئیں 450 دفعات، 12 ذیلی دفعات، 2 ضمیمے اور اب تک ہونے والی 96 ترمیمات ہیں۔ تازہ ترین 96 ترمیمات 23 ستمبر، 2011 کو نافذ ہوئیں۔ یہ دستور عظیم تفصیلات پر مشتمل مکمل تحریری ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حقیقت میں یہ ہمارے ملک کے متعدد پیچیدہ مسائل کو حل کرنے کی کوشش ہے۔ ہندوستانی آئین اس طرح ایک تحریری آئین کی شرط پوری کرتا ہے، اس لحاظ سے یہ وفاقی کردار کا حامل ہے۔

دونوں قسموں کی حکومتوں کے درمیان اختیارات کی تقسیم: حکومت کے ایک وفاقی نظام میں، وفاقی اور ریاستی حکومتوں کے درمیان اختیارات کی واضح تقسیم ضروری ہے۔ یہ خصوصیت بھی ہندوستان میں موجود ہے۔ دفعہ 245 اور 246 اور ساتویں ذیلی دفعہ میں درج تین قانون ساز فہرستوں کے تحت مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے درمیان اختیارات کی تقسیم کی گئی ہے۔ پہلی - مرکزی فہرست - میں دفاع، خارجہ امور، الیکشن، ریلوے، ڈاک کی خدمات، ٹیکس، مواصلات وغیرہ جیسے 100 معاملات درج ہیں۔ جن کی بنیاد پر مرکزی پارلیمنٹ کو قانون سازی کا خصوصی اختیار حاصل ہے۔ دوسری - ریاستی فہرست - میں پولیس، پنچایت، کاشتکاری وغیرہ جیسے 61 معاملات درج ہیں۔ اس کے علاوہ قانون سازی کے معاملات میں بھی ریاستوں کو خصوصی اختیارات دیے جاتے رہے ہیں۔ تعلیم، صحت اور جنگلات جیسی 52 اشیا پر مشتمل ایک تیسری فہرست - مشترکہ فہرست - بھی ہے، جس پر مرکزی اور ریاستی دونوں مقننہ کے ممبران قانون بنا سکتے ہیں۔ باقی اختیارات مرکز کے ہاتھ میں رہیں گے (دفعہ 248)۔

دو ایوانی مقننہ:

ایک وفاقی ریاست میں اصولی طور پر دو ایوانی مقننہ کی گنجائش ہوتی ہے۔ ایوان زیریں ملک کی نمائندگی کرتا ہے جب کہ ایوان بالا صوبائی مفادات کی حفاظت کرتا ہے۔ آئین ہند بھی دو ایوانی مقننہ: 'لوک سبھا اور راجیہ سبھا' کی تشکیل کرتا ہے۔ لوک سبھا پوری قوم کی نمائندگی کرتا ہے۔

> آئین وفاقی ڈھانچے کا حامل ہوسکتا ہے۔ چہ جائے کہ بعض فوائد کی بنا پر آئین میں لفظ 'یونین' کا استعمال کیا گیا ہے، مثلا یہ کہ ہندوستانی وفاق مختلف اکائیوں کے درمیان ہوئے کسی باہمی معاہدے کا نتیجہ نہیں ہے اور نہ یونین میں شامل اکائیوں کو اس سے علاحدہ ہونے کی آزادی ہے۔

اس کے ارکان براہ راست عوام کے ذریعے منتخب ہوتے ہیں۔ لوک سبھا 545 اراکین پر مشتمل ہے۔ راجیہ سبھا کی تشکیل ریاستوں کے نمائندوں سے ہوتی ہے، جن کا انتخاب ہر ریاست کی کل آبادی کی بنیاد پر عمل میں آتا ہے۔ راجیہ سبھا کے ارکان قانون ساز اسمبلی کے ذریعے منتخب ہوتے ہیں اور ان کی تعداد 250 ہوتی ہے۔

جمہوریہ ہندوستان کی آئین سازی

عدلیہ کی آزادی:

عدلیہ کی آزادی کا مطلب یہ ہے کہ جج ہر قسم کے کنٹرول اور اثر ورسوخ سے آزاد ہوں تاکہ وہ بے خوف اور کسی کی تائید کے دباؤ سے بالاتر ہوکر انصاف کرسکیں۔ آزاد اور غیر جانبدار عدلیہ ملک میں آئینی حکومت کو یقینی بنانے اور شہریوں کے حقوق کا تحفظ کرنے کے لیے ضروری ہے۔ دستور ہند میں جب حکومت کے وفاقی نظام کو اپنایا گیا، تو اس تناظر میں سپریم کورٹ کو عدالتی نظر ثانی کا اختیار دیا گیا تاکہ وہ اس بات کو یقینی بنائے کہ مرکزی اور صوبائی حکومتیں اپنی اپنی حدود میں رہیں اور آئین کے ذریعے عطا کردہ شہریوں کے بنیادی حقوق پامال نہ ہوں۔ عدالتی نظر ثانی کا مطلب یہ ہے کہ قانونی عدالت کو اس بات کا اختیار ہے کہ وہ آئینی دفعات کے حوالے سے قانون سازی کی موزونیت کے ساتھ ساتھ دیگر حکومتی کارروائیوں کا بھی جائزہ لیتی رہے۔ اے کے گوپالن (A.K.Gopalan) بنام ریاست مدراس 1951۔

دستور ساز کمیٹی کے صدر بی آر امبیڈکر (B. R. Ambedkar) کے بقول: ''آئین وفاقی ڈھانچے کا حامل ہوسکتا ہے۔ چہ جائے کہ بعض فوائد کی بنا پر آئین میں لفظ 'یونین' کا استعمال کیا گیا ہے، مثلا یہ کہ ہندوستانی وفاق مختلف اکائیوں کے درمیان ہوئے کسی باہمی معاہدے کا نتیجہ نہیں ہے اور نہ یونین میں شامل اکائیوں کو اس سے علاحدہ ہونے کی آزادی ہے۔

راجیہ سبھا میں ریاستوں کی غیر مساویانہ نمائندگی:

وفاق میں ریاستوں کی برابری کو یقینی بنانے کے لیے ایوان بالا کا رویہ غیر جانب دار ہوتا ہے۔ لیکن ہندوستان کا جہاں تعلق ہے، تو یہاں راجیہ سبھا میں صوبوں کی نمائندگی آبادی کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ جیسا کہ چوتھے باب میں مذکور ہے۔ اس لحاظ سے الگ الگ ریاستوں کے ارکان کی تعداد مختلف ہوتی ہے اور یہ اختلاف 1 سے 31 تک ہوتا ہے، جیسا کہ اتر پردیش کے 31 ارکان ہوتے ہیں جب کہ پانڈیچری سے صرف ایک رکن ہوتا ہے۔

آئین کی ہنگامی دفعات:

دیگر تمام چیزوں سے اوپر تین قسم کی ہنگامی صورت حال جو بالترتیب 352، 356 اور 360 کی دفعات کے تحت تصور کی جاتی ہیں ان سے ریاست کی خودمختاری پر مرکز کے انتہائی اہم اختیار کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ دفعہ 352 کے تحت ہندوستان کی سلامتی کو خطرہ لاحق ہونے پر ہنگامی حالت کا اعلان در اصل صورت حال کی ایسی تبدیلی کا اعلان ہے، جس میں اختیارات کی وفاقی تقسیم کو عارضی طور پر منسوخ کیا جاسکتا ہے۔ اس صورت میں مرکزی حکومت کے انتظامی اختیار کا دائرہ وسیع ہوکر ریاستوں کے تمام معاملات پر حاوی ہو جاتا ہے اور پارلیمنٹ کو ریاستوں کے دائرہ اختیار میں آنے والے معاملات پر قوانین بنانے کا خصوصی اختیار دے دیتا ہے۔ آئینی مشینری کی ناکامی کے وقت ہنگامی

حالت کا اعلان، جیسا کہ آئین کی دفعہ 356 کے تحت مذکور ہے، بہت اہم ہے۔ مرکزی انتظامیہ کو پارلیمنٹ کی طرف سے دوسری منظوری ملنے تک، ریاستی کابینہ کو مسترد کرنے اور ریاستی مقننہ کو تحلیل یا معطل کرنے کا اختیار ہے۔ مالی بحران کے وقت ہنگامی حالت کے اعلان کو دفعہ 360 کے تحت رکھا جاسکتا ہے۔ یہ صورت حال صدر کو ریاستوں کی مالی آزادی کو محدود کرنے کا اختیار دیتی ہے۔ ایچ این کنزرو (H. N. Kunzru) کے مطابق ریاستوں کے تئیں دفعہ 360 کا برتاؤ ایسا ہے ''جیسے وہ (صوبے) بچے ہوں اور صدر گاؤں کا اسکول ماسٹر''۔

مرکز پر ریاستوں کا مالی انحصار: 270، 273، 275 اور 280 دفعات میں ایک ایسے مالیاتی کمیشن کے قیام کی گنجائش ہے، جو مالیات کے تعلق سے خاص اقدامات کی سفارش کرے، ان دفعات میں اس کا بھی امکان موجود ہے کہ آمدنی کے وسائل کو مرکز اور وفاق میں شامل اکائیوں کے درمیان اس طرح تقسیم کیا جائے کہ مالیاتی شعبے میں بھی کافی حد تک ان کی خود مختاری اور خود کفالت برقرار رہے۔ لیکن ہندوستان میں صوبوں کے لیے جو وسائل مختص کیے جاتے ہیں وہ تکمیل ضروریات کی حد سے بہت کم ہوتے ہیں۔ اس طرح صوبوں کو مرکز پر مالیات کے شعبے میں بھی انحصار کرنا پڑتا ہے اور ظاہر ہے کہ جس کا تجوری پر اختیار ہوگا دیگر معاملات کی لگام بھی اسی کے ہاتھ میں ہوگی۔ اس لحاظ سے مرکز ریاستوں کی پالیسیوں اور انتظامیہ کو کنٹرول کرنے کی پوزیشن میں ہوتا ہے۔

صدر کے ذریعہ ریاستی گورنروں کی تقرری: صدر کے ذریعے کسی ریاست کے گورنر کی تقرری کا ضابطہ بظاہر مرکز اور ریاستوں کے درمیان تعلق استوار کرنے کی غرض سے متعارف کرایا گیا تھا، لیکن درحقیقت اس کے پیچھے علاحدگی پسند رجحانات کو پنپنے سے روکنے کا نظریہ زیادہ کارفرما تھا۔ آئینی اسمبلی کے ارکان نے مختلف انداز میں اس بات پر زور دیا ہے کہ گورنر مرکز کا ایجنٹ ہوتا ہے۔ لہٰذا اپنی حیثیت کے مطابق جو کردار اسے ادا کرنا تھا وہ غیر یقینی صورتِ حال کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے۔ تمام باتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے بھی یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ گورنر مرکز کا ایک ایجنٹ ہوتا ہے۔ وہ اپنے منصب پر اس وقت تک برقرار رہتا ہے جب تک صدر کی خوشنودی اسے حاصل رہتی ہے اور صرف اسی صورت میں ریاستی مقننہ سے منظور بل صدر کی توجہ کے مستحق ہو سکتے ہیں۔ (دفعہ 155، 156)۔

کھاتوں اور حسابات کی جانچ پڑتال کی مرکزی خدمات: ریاستوں کے مالیات کا معائنہ اور جانچ پڑتال ہندوستان کے کنٹرولر اور آڈیٹر جنرل کے ذریعے ہوتی ہے، جسے صدر مقرر کرتا ہے (دفعہ 148)۔ وہی ہر ریاست کے حسابات کی جانچ پڑتال اور معائنہ کے لیے علاحدہ علاحدہ محاسب عمومی (Accountant General) کا تقرر کرتا ہے۔ یہ بھی ملک کے نظام کو مرکزیت کی طرف لے جاتا ہے۔

> ہندوستانی آئین ساز اسمبلی کے ارکان اس بات کے قائل تھے کہ ہندوستان جیسے وسیع ملک کی حکومت ایک مرکز سے مؤثر انداز میں نہیں چلائی جاسکتی اور ان کی یہ رائے تھی کہ حکمرانی کے لیے وفاقی نظام کو اپنانا بہتر ہے۔ نسل، مذہب اور زبان کے تنوع نے بھی انھیں ایک وفاقی پالیسی کو منتخب کرنے پر آمادہ کیا، کیوں کہ ہندوستان کے کثیر ثقافتی ماحول میں یہی ایک نظام ہے، جو مقامی اہمیت کے حامل معاملات میں ریاستوں کی خود مختاری کو تحفظ فراہم کرتے ہوئے ملک کے اتحاد و یکجہتی کو بھی یقینی بنا سکتا ہے۔

سر کاریا کمیشن اور وفاق کا تصور: مرکز اور ریاستوں کے تعلقات کے ضمن میں جسٹس سرکار یا کمیشن کی سفارشات بے حد اہمیت رکھتی ہیں۔ انتھک سرگرمیوں اور مرکز - ریاست تعلقات کے موجودہ نہج میں تبدیلیوں کے حق اور مخالفت میں تمام حلقوں کے متصادم خیالات سننے کے بعد، سرکار یا کمیشن نے 1988 میں اپنی رپورٹ پیش کی۔ کمیشن نے مرکز - ریاست تعلقات کے مختلف گوشوں پر 245 سفارشات پیش کیں، جن پر حکومت نے مناسب انداز میں اور تفصیلی طور پر غور وخوض کیا۔ 245 میں سے 180 سفارشات قبول کر لی گئیں جب کہ کچھ اب بھی زیر غور ہیں۔ کچھ اہم سفارشات جو قبول ہونے کے بعد نافذ بھی کی جا چکی ہیں گورنروں کے کردار سے متعلق ہیں۔ کمیشن نے گورنروں کے لیے وزرا اعلیٰ کے انتخاب اور ریاستی قانون ساز اسمبلی کی کارروائی چلانے سے متعلق رہنما اصول طے کیے جانے کے ساتھ ساتھ گورنر کے انتخاب، تقرری اور صوابدید کے اختیارات پر متعدد اہم سفارشات پیش کیں۔ کمیشن نے سفارش کی کہ دفعہ 263 کے تحت ایک مستقل بین ریاستی کونسل کا قیام عمل میں لایا جانا چاہیے۔ چناں چہ سنہ 1990 میں مرکزی حکومت نے ہندوستانی آئین کی دفعہ 263 کی شقوں کے تحت ایک بین ریاستی کونسل قائم کی۔ یہ کونسل چھ مرکزی کابینی وزرا اور تمام ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ پر مشتمل ہوتی ہے۔

آئینی امور کے مشہور ماہر سبھاش سی۔ کشیپ نے مندرجہ ذیل الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے: ''اتفاق سے مرکز - ریاست تعلقات کے میدان میں، خاص طور سے اس پر زور دیے جانے کی ضرورت ہے کہ 'مرکز - ریاست'، 'مرکزی قانون ساز اسمبلی'، اور 'مرکزی قوانین' وغیرہ اصطلاحات کے غلط استعمال کی وجہ سے بہت بڑے پیمانے پر نقصان ہوتا رہا ہے۔ یہ اصطلاحات بدقسمتی سے استعماری دور میں قائم ہونے والی مرکزی حکومت کے زمانے سے اسی طرح چلی آرہی ہیں۔ 'مرکز' اور 'یونین' دو جداگانہ چیزیں ہیں، یہ دونوں بہت مختلف تصویریں بناتے اور انتہائی الگ الگ تصورات پیش کرتے ہیں۔ 'مرکز' دائرہ کے وسط میں ایک نقطہ ہے جب کہ 'یونین' پورا دائرہ ہے۔ مرکز اور صوبوں کا باہمی تعلق ہے، اقتدار کے مرکز اور اس کے مضافاتی علاقوں کا تعلق نہیں ہے۔ ہندوستانی آئین میں ملک کے مختلف صوبوں میں تقسیم کا جو تصور ہے، اگر امبیڈکر کے لفظوں میں دہرائیں، تو وہ صرف ''انتظامیہ کی سہولت کے لیے'' ہے۔ مگر دراصل یہ مرکز اور ریاستوں کی دو مختلف سطحوں کے درمیان ایک ایسے ہموار عملی تعلق کے حصول کی کوشش تھی، جس کا پلڑا تمام قانون ساز، انتظامی اور اقتصادی تعلقات کے شعبے میں مرکز کی طرف شدید طور سے جھکا ہوا ہو۔ بہر حال اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا، جو بظاہر متضاد لگ سکتا ہے، کہ ہندوستانی آئین ایک وفاقی ڈھانچے کی بہت سی خصوصیات کا حامل ہے۔

Anzar Alam
F-11/13, Street no. 6, Jogabai Ext.
Jamia Nagar, New Delhi-25

عبدالحی خاں

الیکشن کمیشن آف انڈیا
ایک خودمختار معتبر ادارہ

الیکشن کے اعداد و شمار

کل رقبہ	3,287,590	مربع کلومیٹر
زمینی رقبہ	2,973,190	مربع کلومیٹر
آبی رقبہ	314,400	مربع کلومیٹر

کل آبادی: 1,147,995,904 (2008) کی مردم شماری کے مطابق

پارلیمنٹ کے پانچ سب سے بڑے حلقے (بلحاظِ رقبہ)

ریاست/ مرکزی کے زیرانتظام	پارلیمانی حلقے	مربع کلومیٹر
جموں وکشمیر	لداخ	173266.37
راجستھان	برمر	71601.24
گجرات	کوچ	41644.55
اروناچل پردیش	اروناچل ایسٹ	40572.29
اروناچل پردیش	اروناچل ویسٹ	39749.64

پارلیمنٹ کے پانچ سب سے بڑے حلقے (بلحاظِ رقبہ)

ریاست/ مرکزی کے زیرانتظام	پارلیمانی حلقے	مربع کلومیٹر
دہلی	دہلی صدر	28.09
مہاراشٹرا	ممبئی ساؤتھ سینٹرل	18.31
مہاراشٹرا	ممبئی ساؤتھ	13.73
ویسٹ بنگال	کولکاتہ نارتھ ویسٹ	13.23
دہلی	چاندنی چوک	10.59

لوک سبھا کی نشستیں

پولنگ بوتھوں کی کل تعداد 8,28,804

نمبر شمار	ریاستیں/ مرکز کے زیرانتظام علاقے	حلقے جنرل	ایس سی	ایس ٹی	کل
1	آندھراپردیش	34	6	2	42
2	اروناچل پردیش	2	-	-	2
3	آسام	11	1	2	14
4	بہار	33	7	0	40
5	جھارکھنڈ	11	1	2	14
6	گوا	2	-	-	2
7	گجرات	20	2	4	26
8	ہریانہ	8	2	-	10
9	ہماچل پردیش	3	1	-	4
10	جموں وکشمیر	6	-	-	6
11	کرناٹک	24	4	-	28
12	کیرالا	18	2	-	20
13	مدھیہ پردیش	20	4	5	29
14	چھتیس گڑھ *	5	2	4	11
15	مہاراشٹرا	41	3	4	48
16	منی پور	1	-	1	2
17	میگھالیہ	2	-	-	2

الیکشن کمیشن آف انڈیا کی تاریخ بھی وہیں سے شروع ہوتی ہے جہاں سے آزاد ہندوستان کی تاریخ کا آغاز ہوتا ہے۔ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہونے کی حیثیت سے الیکشن کمیشن کا نظام بھی کافی وسیع ہے جو آزادی ہمارے ملک میں الیکشن کمیشن کو حاصل ہے وہ دوسرے ملکوں میں نہیں ہے کیونکہ الیکشن کمیشن تو ایسے ملکوں میں بھی قائم ہیں جہاں جمہوریت کی داغ بیل بھی نہیں پڑی ہے لیکن ہندوستان کا الیکشن کمیشن ایک خودمختار ادارہ ہے اور آئین کے دائرہ میں رہتے ہوئے اسے آزادانہ کام کرنے کی کھلی چھوٹ ہے اس طرح کمیشن ایک آئینی ادارہ ہے اس کا قیام 25 جنوری 1950 کو عمل میں آیا تھا اور جب سے یہ ادارہ پارلیمانی انتخابات سے لے کر صدر جمہوریہ اور نائب صدر جمہوریہ کے انتخابات کا اہتمام کرتا ہے۔ آغاز میں اس ادارہ کا ایک ہی سربراہ ہوتا تھا جسے چیف الیکشن کمشنر کہتے تھے لیکن کئی فیصلوں میں غیرجانبدارانہ کردار سامنے نہ آنے پر حکومت کو دو نائبین کی تقرری بھی کرنی پڑی اس طرح کمیشن میں فیصلہ تین لوگوں کے سپرد کردیا گیا تاکہ جانبداری کے الزامات سے کمیشن کو بچایا جاسکے حالانکہ اس نظم کو بیچ میں ختم کردیا گیا تھا لیکن 1993 میں ایک بار پھر غور کرکے اس ادارہ کو اکثریتی ووٹ سے فیصلہ لینے کے قابل بنایا گیا یعنی اب کمیشن ایک چیف الیکشن کمشنر اور دو کمشنروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ دوسری جانب کمیشن کا عملہ مختلف سطحوں پر تقریباً تین سو عہدیداروں اور افسروں پر مبنی ہے مرکزی ادارہ الیکشن سکریٹریٹ کہلاتا ہے اور تمام ریاستوں کے انتخابی کمیشن اسی کے تحت کام کرتے ہیں یوں تو مرکز سے لے کر ریاستوں تک الیکشن کمیشن کے مستقل دفاتر موجود ہیں لیکن لوک سبھا یا اسمبلی کے انتخابات کے دوران عارضی طور پر ضروری عملہ کو ریاستی اور مقامی انتظامیہ سے عارضی طور پر طلب کرلیا جاتا ہے اور الیکشن ختم ہونے کے بعد وہ عملہ ایک بار پھر اپنے اپنے دفتروں کو واپس چلا جاتا ہے۔ شاید آپ یقین نہ کریں کہ جب ہندوستان میں عام انتخابات ہوتے ہیں تو اس کے لیے پچاس لاکھ افراد پر مشتمل عملے کی ضرورت پڑتی ہے جس میں پولیس اہلکار بھی شامل ہوتے ہیں جو عملہ عارضی طور پر دوسرے اداروں سے طلب کیا جاتا ہے وہ پوری طرح کمیشن کے ماتحت ہوتا ہے اور اسی کی ہدایتوں کے مطابق کام کرتا ہے۔

ملک کے پورے انتخابی نظام کی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ ہمارا الیکشن کمیشن انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ فار ڈیموکریسی اینڈ الیکٹورل اسسٹینس (IDEA) کا رکن بھی ہے یہ ادارہ سویڈن کے اسٹاک ہوم میں ہے۔ دنیا کے مختلف ملکوں میں کمیشن کے مشاہدین وقتاً فوقتاً دورے پر جاتے رہتے ہیں۔ حالیہ برسوں میں عراق میں ہونے والے پہلے عام انتخابات میں ہندوستان کے الیکشن کمیشن نے وہاں کی عبوری حکومت کی پوری مدد کی تھی اور وہاں کے عوام کو ایک صاف ستھری جمہوریت دینے میں بھرپور ہاتھ بٹایا تھا۔

جس طرح الیکشن کمیشن بتدریج ترقی کی راہ پر گامزن ہے اسی طرح ملک میں پولنگ کے نظام کو بھی بہتر سے بہتر بنانے کے اقدامات کیے جاتے رہے ہیں اور اس بات کی کوشش کی جاتی رہی ہے کہ رائے دہندگان

جو کسی جمہوری ملک کی سب سے مقدس اکائی ہے اس کی رائے کو پوری طرح پوشیدہ رکھ کر سارے نظام کو ترتیب دیا جائے ایک وقت تھا جب مختلف پارٹیوں کے نام کے ڈبوں میں لوگ ووٹ ڈالتے تھے اور پھر ان کی گنتی ہوتی تھی یعنی اہلکاروں کو ووٹ چھانٹنا نہیں پڑتے تھے پھر ایک وقت آیا کہ ایک ہی سلپ پر جسے بیلٹ پیپر کہتے تھے سارے امیدواروں کے نام اور ان کے چناؤ نشان درج

اس کے علاوہ آج بھی یہ بات کہی جاتی ہے کہ الیکشن کمیشن کے پاس اختیارات بہت محدود ہیں کمیشن کسی کے خلاف خود سے کارروائی نہیں کرسکتا ہے بلکہ اس کے لیے اسے حکومت، انتظامیہ اور عدلیہ کے پاس جانا پڑتا ہے

ہوتے تھے اور رائے دہندگان ایک خاص قسم کی مہر لگا کر اپنا ووٹ ڈالا کرتے تھے اور بعد میں انھیں علاحدہ کیا جاتا تھا یعنی ایک طویل وقت درکار ہوتا تھا ووٹوں کی گنتی میں اور کبھی کبھی تو ووٹوں کی گنتی سے پہلے ہی امیدواروں کے ایجنٹ باہر آکر اپنے امیدوار کی کامیابی کا اعلان کردیا کرتے تھے یعنی صرف گڈیوں کی ضخامت دیکھ کر ہی فتح کا جشن منانا شروع کردیا جاتا تھا لیکن مواصلات کی انقلابی ترقی نے اس ساری بدنظمی پر قابو پالیا ہے اب جہاں الیکٹورل ووٹنگ مشین کے ذریعے ووٹ ڈالا جاتا ہے وہیں آخر وقت تک کس امیدوار کو کتنے ووٹ پڑے یہ بھی مخفی رہتا ہے اور سب سے بڑی بات وقت کی بچت اور دل کی دھڑکنوں پر بھی کنٹرول کرلیا گیا ہے اور ایک دوسرے کے خلاف الزامات کی گنجائش بھی بہت کم رہ گئی ہے۔ اسی طرح صاف ستھرے اور منصفانہ انتخابات کے امکانات مزید مستحکم ہوگئے ہیں۔

الیکشن کمیشن کے سربراہان اس بات کا شکوہ ہمیشہ کرتے رہے ہیں کہ بدعنوان سیاستدانوں سے نمٹنے اور الیکشن میں جیتنے کے لیے بے دریغ دولت کے استعمال کو کیسے روکا جائے اس کے لیے ہمیشہ کمیشن کو اختیارات دینے کی بات کہی جاتی رہی ہے اور اصلاحات کی ضرورت محسوس کی جاتی رہی ہے حالانکہ اس سمت میں بہت سے اقدامات کیے بھی جا چکے ہیں لیکن وہ ابھی نا کافی ہیں امیدواروں پر غلط ذرائع کو روکنے کے لیے کمیشن نے بہت سے اقدامات کیے ہیں ایک طرف امیدوار ناجائز دولت کا انتخابی مہم کے دوران استعمال کم کریں دوسری جانب عوام اپنی خواہش کے مطابق اپنے امیدوار کا انتخاب کرسکیں اس طرح کے اقدامات کے نتائج سامنے آنے لگے ہیں۔

اس کے علاوہ آج بھی یہ بات کہی جاتی ہے کہ الیکشن کمیشن کے پاس اختیارات بہت محدود ہیں کمیشن کسی کے خلاف خود سے کارروائی نہیں کرسکتا ہے بلکہ اس کے لیے اسے حکومت، انتظامیہ اور عدلیہ کے پاس جانا پڑتا ہے اور اس کے لیے ایک طویل عمل درکار ہوتا ہے جہاں تک صاف ستھرے انتخابات کی بات ہے اس سے متعلق الیکشن کمیشن نے بہت ہی اہم فیصلے لیے ہیں ان میں سیاسی پارٹیوں اور امیدواروں کی طرف سے سرکاری میڈیا کا استعمال، سیاست کو مجرمانہ سرگرمیوں سے علاحدہ رکھنا اور ان پر قابو پانا انتخابی فہرستوں کو کمپیوٹرائز کرنا، رائے دہندگان کو شناختی کارڈوں کی فراہمی، امیدواروں کے اخراجات کے حساب وکتاب کو آسان بنانا اور ضابطہ اخلاق پر سختی سے پابندی کرانا شامل ہیں۔

بہرحال بہتری کی گنجائش ہمیشہ باقی رہتی ہے الیکشن کمیشن کا سفر جاری ہے اور اس کے اقدامات کا اثر رائے دہندگان کے سامنے آرہا ہے اس کے لیے اب کمیشن بیداری مہم بھی شروع کرنے لگا ہے تاکہ عوام زیادہ سے زیادہ حق رائے دہی کا استعمال کرکے جمہوریت کو مزید مستحکم کرسکیں۔

(مضمون نگار انقلاب دہلی کے ایڈیٹر انچارج ہیں۔)

Abdul Hayee Khan, R-13, 4th Floor, Nafees Road, Batla House, New Delhi - 110025

18	مزورم	-	-	1	1
19	ناگالینڈ	1	-	-	1
20	اوڈیشہ	13	3	5	21
21	پنجاب	10	3	-	13
22	راجستھان	18	4	3	25
23	سکم	1	-	-	1
24	تمل ناڈو	32	7	-	39
25	تری پورہ	1	-	1	2
26	اتر پردیش	63	17	-	80
27	اتراچل*	4	1	-	5
28	ویسٹ بنگال	32	8	2	42
29	اے اور این آئس لینڈ	1	-	-	1
30	چنڈی گڑھ	1	-	-	1
31	ڈی&این حویلی	-	-	1	1
32	دمن&DiU	1	-	-	1
33	دہلی	6	1	-	7
34	لکشدیپ	-	-	1	1
35	پانڈی چیری	1	-	-	1
	مجموعی	423	79	41	543

لوک سبھا انتخابات میں پولنگ کا فیصد

عام انتخابات	سال	مرد	خواتین	مجموعی
پہلا	1952			61.2
دوسرا	1957			62.2
تیسرا	1962	63.31	46.63	55.42
چوتھا	1967	66.73	55.48	61.33
پانچواں	1971	60.90	49.11	55.29
چھٹا	1977	65.63	54.91	60.49
ساتواں	1980	62.16	51.22	56.92
آٹھواں	1984	68.18	58.60	63.56
نواں	1989	66.13	57.32	61.95
دسواں	1991	61.58	51.35	56.93
گیارہواں	1996	62.06	53.41	57.94
بارہواں	1998	1998	57.88	61.97
تیرہواں	1999	63.97	55.64	59.99
چودہواں	2004	52.65	44.65	48.74
پندرہواں	2009			58.17

پنجاب کے اقلیتی اداروں میں اردو کی تعلیم

محمد اقبال

پنجاب اور اردو کا آپسی رشتہ بڑا مستحکم اور توانا ہے۔ پنجاب کا نام ہی (پانچ دریاؤں کی سرزمین) اردو سے اپنے قدیم ازلی تعلق کا ثبوت فراہم کررہا ہے۔ یہ خطہ شروع ہی سے اردو کی تعلیم وتدریس کے لیے معروف رہا ہے۔ یہاں کے اردو مراکز اور درسگاہیں فروغِ اردو میں نمایاں کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو ادب کی مختلف اصناف اور تحریکات پنجاب کا ذکر کیے بغیر مکمل نہیں ہوتیں۔ پنجاب نے اردو کا دامن ہمیشہ مختلف رنگ کے پھولوں سے بھرا ہے اور یہ سلسلہ آج بھی جاری و ساری ہے۔ پنجابی اور اردو کی باہمی لسانی قربت بھی پنجاب میں اردو کے روشن مستقبل کی پیشین گوئی کرتی ہے۔

مالیر کوٹلہ امن واخوت کی زریں روایات کے لیے برصغیر میں جانا پہچانا جاتا ہے۔ ملک کی آزادی کے بعد یہ اردو کا اہم مرکز و جزیرہ تصور کیا جاتا ہے۔ اس تاریخی شہر میں اردو کا چراغ ہمیشہ روشن رہا ہے۔ یہاں کے تعلیمی اداروں میں اردو زبان کی تعلیم اور مختلف ادبی انجمنوں کی سرگرمیاں اور تقریبات محبانِ اردو کے لیے ہمیشہ توجہ کا مرکز رہی ہیں۔

اسلامیہ سینئر سیکنڈری اسکول مالیر کوٹلہ پنجاب میں اردو تعلیم کا آزادی کے بعد سب سے بڑا اقلیتی تعلیمی ادارہ ہونے کے سبب ملک گیر شہرت کا حامل ہے۔ 24 اکتوبر 1924 میں قائم شدہ یہ اسکول اردو ذریعۂ تعلیم کے ادارہ کے طور پر ایک طویل عرصے تک اپنی منفرد شناخت رکھتا تھا۔ انجمن ترقی اردو (ہند) پنجاب شاخ کے جنرل سکریٹری اور اسکول کے سابق ہیڈ ماسٹر جناب محمد کفایت اللہ بی اے، بی ٹی (علیگ) مرحوم نے اسکول اور علاقے میں اردو کے فروغ کے لیے کافی مخلصانہ کوششیں کیں۔ چند برسوں سے مقامی تقاضوں کے تحت اسکول کا ذریعہ تعلیم پنجابی کردیا گیا ہے لیکن ثانوی زبان کے طور پر اردو آج بھی اسکول کی مقبول زبان ہے۔ سالِ رواں میں پرائمری سطح تک اردو پڑھنے والے طلبا کی تعداد 1523 ہے۔ مڈل میں 720 طلبا اردو کی تعلیم حاصل کررہے ہیں، سیکنڈری کلاس میں 275 طلبا اور سینئر سیکنڈری کلاس میں 439 طلبا اس شیریں زبان کا علم حاصل کررہے ہیں۔ اسکول کے فارغ طلبا ملک اور بیرونِ ملک اونچے عہدوں پر فائز ہیں جو اپنی درسگاہ اور علاقے کے لیے باعثِ افتخار ہیں۔ یہ اسکول پنجاب وقف بورڈ کے زیر انتظام چل رہا ہے۔

قوم کی تعلیمی ترقی کے مقصد سے اسلامیہ کمبوج سینئر سیکنڈری مالیر کوٹلہ کا قیام 1939 میں عمل میں آیا۔ اسکول کا ذریعہ تعلیم پنجابی ہے لیکن اردو ابتدا ہی سے دوسری زبان کے طور پر پڑھائی جاتی ہے۔ پرائمری میں 430 طلبا اردو کی تعلیم حاصل کررہے ہیں، مڈل کے درجے میں 300 طلبا اور سیکنڈری کلاس میں 180 طلبا اردو پڑھ رہے ہیں۔ سینئر سیکنڈری کلاس میں 70 طلبا اردو کی تعلیم حاصل کررہے ہیں۔ اسکول انتظامیہ کمیٹی کے تحت چل رہا ہے جس میں مسلم کمبوج برادری کے معزز حضرات شامل ہیں۔

مدرسہ اہل حدیث مالیر کوٹلہ جواب اہل حدیث ایلی مینٹری اسکول کے نام سے جانا جانے لگا ہے۔ ریاست مالیر کوٹلہ کا قدیم اسکول ہے جسے ملت کی تعلیمی ترقی کے لیے بہی خواہوں نے 1917 میں قائم کیا تھا۔ یہ اسکول اگرچہ بنیادی اور ابتدائی تعلیم فراہم کرتا تھا لیکن اپنے بلند معیار تعلیم اور سیرت سازی کے ایک موثر اور ہر دلعزیز ادارے کے طور پر کافی مقبول تھا۔ ابتدا میں یہ اردو ذریعہ تعلیم کی درس گاہ تھی لیکن دور حاضر میں پنجابی میڈیم کے ذریعے آٹھویں جماعت تک تعلیم کی سہولیات فراہم کررہا ہے۔ اس ادارے نے بہت سی نامور شخصیات کی تربیت کی ہے۔ سالِ رواں میں پرائمری سطح تک 180 طلبا اردو کی بنیادی تعلیم حاصل کررہے ہیں اور مڈل کے درجہ میں 78 طلبا اردو کے زیور سے اپنے آپ کو آراستہ کررہے ہیں۔

1968 سے قائم اسلامیہ گرلز سینئر سیکنڈری اسکول عہد حاضر میں مسلم لڑکیوں کا سب سے بڑا اسکول ہے۔ اسکول کا ذریعہ تعلیم پنجابی ہے لیکن اردو تعلیم کا بھی مناسب انتظام ہے اور سب درجات میں دوسری زبان کی حیثیت سے اردو کی تعلیم دی جارہی ہے۔ پرائمری میں 450 طالبات ثانوی زبان کی حیثیت سے اردو پڑھ رہی ہیں۔ مڈل درجات میں 395 لڑکیاں اردو کی تعلیم حاصل کررہی ہیں۔ سیکنڈری کلاسوں میں 367 طالبات اور سینئر سیکنڈری کلاسوں میں 200 دخترانِ ملت اردو زبان اختیار کیے ہوئے ہیں۔

مالیر کوٹلہ شہر کے مخلص بزرگ حافظ غلام رسول مرحوم نے مسلم بچیوں کی تعلیم وتربیت کے لیے 1961 میں مدرسۃ البنات مالیر کوٹلہ کے نام سے ادارہ قائم کیا جو ترقی کرتے کرتے ہائی اسکول بن گیا لیکن پنجاب اسکول ایجوکیشن بورڈ کے نئے ضوابط کے تحت اب یہ مڈل سطح تک تعلیم دے رہا ہے اردو اور عربی کی تعلیم کا کافی مقبول

ادارہ رہا ہے اس وقت ذریعہ تعلیم پنجابی ہے اور اردو ثانوی زبان کی حیثیت سے پڑھائی جارہی ہے۔ سالِ رواں میں 80 طالبات پرائمری درجات میں اردو پڑھ رہی ہیں۔ مڈل درجات میں 30 طالبات نے اردو کو ثانوی زبان کی حیثیت سے منتخب کیا ہے۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے رکن مفتی اعظم مولانا فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی کی کوششوں سے 1973 میں مدرسہ تعمیر سیرت مالیرکوٹلہ کا سنگ بنیاد قاری محمد طیبؒ مرحوم سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کے دست مبارک سے رکھا گیا۔ اردو و عربی کے جدید خطوط پر تعلیم کے علاوہ اسلامی طرز پر طلبا کی سیرت سازی مدرسہ کے قیام کے بنیادی مقاصد تھے۔ اس وقت یہ ہائی اسکول کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ درجہ پنجم تک اردو پہلی زبان کے طور پر پڑھائی جاتی ہے اور طلبا کی تعداد 115 ہے۔ مڈل اور ہائی اسکول کے درجات میں دوسری زبان کی حیثیت سے پنجاب اسکول ایجوکیشن بورڈ کے نصاب کے تحت اردو پڑھنے والے طلبا کی تعداد بالترتیب 85 اور 55 ہے۔

مالیرکوٹلہ کے مسلم گنجان آبادی والے علاقے بھُمسی میں تعلیمی پسماندگی دور کرنے کے لیے 1971 میں مسلم سینئر سیکنڈری اسکول قائم کیا گیا۔ اسکول کا ذریعہ تعلیم پنجابی ہے۔ 319 طلبا پرائمری درجات میں اردو کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ مڈل درجات میں 136، سیکنڈری میں 56 طلبا دوسری زبان کی حیثیت سے اور سینئر سیکنڈری کلاس میں 33 طلبا اردو زبان و ادب کا علم حاصل کر رہے ہیں۔

الفلاح ایجوکیشنل ٹرسٹ کے زیر انتظام 1995 سے چل رہا الفلاح سینئر سیکنڈری پبلک اسکول مالیرکوٹلہ انگلش میڈیم اسکول کے طور پر ترقی کی طرف گامزن ہے۔ اختیاری مضمون کے طور پر پرائمری درجات میں 1139، مڈل درجات میں 510 سیکنڈری کلاسوں میں 267 اس طرح پرائمری سے دسویں جماعت تک بطور اختیاری مضمون کے اردو پڑھنے والے طلبا و طالبات کی کل تعداد 1916 ہے۔ اسکول کے پرنسپل اور اساتذہ بچوں میں اردو کی دلچسپی اور لگاؤ پیدا کرنے کے لیے سنجیدگی سے کوشاں ہیں۔

مالیرکوٹلہ کے بیرونی علاقے قلعہ رحمت گڑھ میں علاقے کے لڑکوں اور لڑکیوں میں علم کی روشنی پھیلانے کے لیے 1988 میں اسلامیہ گرلز سینئر سیکنڈری اسکول اور اسلامیہ ہائی اسکول (بوائز) قائم کیے گئے۔ اسلامیہ گرلز سینئر سیکنڈری اسکول قلعہ رحمت گڑھ، مالیرکوٹلہ میں اس سال پرائمری میں 84، مڈل میں 13 اور ہائی اسکول میں 81 طالبات بطور ثانوی زبان کے اردو کی تعلیم حاصل کر رہی ہیں اور 39 طالبات سینئر سیکنڈری درجات میں زیر تعلیم ہیں۔

اسلامیہ ہائی اسکول (بوائز) قلعہ رحمت گڑھ میں پرائمری میں 68 لڑکے بنیادی اردو سے آشنا ہو رہے ہیں اور مڈل کی سطح تک 70 طلبا دوسری زبان کے طور پر اردو اختیار کیے ہوئے ہیں۔

مدرسہ حفظ القرآن جمالپورہ، مالیرکوٹلہ دینی تعلیم کا ایک قدیم اور مقبول ادارہ ہے جو فروری 1962 سے اشاعت دین کا فریضہ انجام دے رہا ہے۔ مدرسے کی دو پرائمری شاخیں بھی قائم کی گئی ہیں پرائمری میں 581 طلبا اردو کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ مڈل درجات میں 43

شہر کے مختلف علاقوں میں ماڈل اور پبلک اسکول قائم ہیں اور کافی تعداد میں قائم شدہ دینی مدارس کے ذریعے بھی اردو کی تعلیم کسی نہ کسی شکل میں دی جارہی ہے جس سے اس علاقے میں فروغِ اردو کا مقصد پورا ہو رہا ہے۔

طلبا اردو کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں اس سال سے پنجاب اسکول ایجوکیشن بورڈ کا نصاب شامل کیا گیا ہے۔ مدرسہ انتظامیہ کمیٹی حفظ القرآن جمالپورہ، مالیرکوٹلہ کے زیر انتظام چل رہا ہے۔

انگریزی ذریعہ تعلیم سے معیاری اور سیکولرزم کی تعلیم دینے کی غرض سے حرف چیریٹیبل ٹرسٹ کی جانب سے 2002 میں سہراب پبلک اسکول مالیرکوٹلہ کا قیام عمل میں لایا گیا جس کے قیام کا سہرا ٹرسٹ کے چیئرمین جناب امجد علی کے سر ہے۔ اسکول کا الحاق سینٹرل بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن کے ساتھ ہے۔ اسکول کی انتظامیہ دیگر زبانوں کے ساتھ اردو کی تعلیم پر بھی خصوصی توجہ دے رہی ہے۔ اسکول میں اردو اضافی اختیاری مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جارہی ہے۔ اسکول میں 160 طلبا اردو کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں جس میں تقریباً 45 کے قریب غیر مسلم طلبا بھی شامل ہیں۔ ٹرسٹ کی جانب سے 2012 میں حرف کالج قائم کیا گیا جس میں اس سال سے بی اے کی تعلیم شروع کی گئی ہے اردو مضمون کی سہولت بھی کالج کی طرف سے فراہم کی جارہی ہے۔ امید ہے کالج کے فعال پرنسپل پروفیسر ارشاد احمد خاں کی رہنمائی میں یہ کالج مستقبل میں اردو تعلیم کا اہم مرکز بن جائے گا۔

مالیرکوٹلہ میں مسلم لڑکیوں کی تعلیم کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے پنجاب وقف بورڈ کے چیئرمین جناب محمد اظہار عالم ریٹائرڈ ڈی جی پی پنجاب کی جانب سے 2010 میں اسلامیہ گرلز کالج قائم کیا گیا۔ کالج کا الحاق پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ کے ساتھ ہے۔ 2013-14 کے تعلیمی سیشن میں بی اے سال اوّل میں 72 طالبات، بی اے سال دوم میں 37 طالبات اور بی اے سال آخر میں بھی 37 طالبات نے اردو الیکٹو مضمون کو اختیار کیا ہے ایک طالبہ بی اے آنرز میں اردو کے ساتھ زیر تعلیم ہے۔

شہر کے مختلف علاقوں میں ماڈل اور پبلک اسکول قائم ہیں اور کافی تعداد میں قائم شدہ دینی مدارس کے ذریعے بھی اردو کی تعلیم کسی نہ کسی شکل میں دی جارہی ہے جس سے اس علاقے میں فروغِ اردو کا مقصد پورا ہو رہا ہے۔

مالیرکوٹلہ سے بیس کلومیٹر کی دوری پر 1961 سے قائم اسلامیہ ہائی اسکول روہیڑہ دیہی علاقے میں تعلیم اور اردو کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کر رہا ہے۔ اسکول کا ذریعہ تعلیم پنجابی ہونے کے باوجود 140 طلبا پرائمری درجات میں شوق کے ساتھ اردو زبان سیکھ رہے ہیں۔ مڈل درجات میں 90 اور سیکنڈری درجات میں 41 طلبا ثانوی زبان کے طور پر اردو کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

اسلامیہ ہائی اسکول بنجولی خورد تحصیل مالیرکوٹلہ 1964 سے قائم شدہ ایک فعال ادارہ ہے۔ تحصیل مالیرکوٹلہ کا یہ گاؤں تعلیمی اعتبار سے کافی ترقی یافتہ ہے۔ اسکول پنجاب وقف بورڈ کے زیر انتظام چل رہا ہے۔ اسکول میں پنجاب وقف بورڈ کا نصاب رائج ہے۔ ابتدائی درجات میں 115 طلبا اردو زبان پڑھ رہے ہیں۔ مڈل کلاسوں میں 110 طلبا اور سیکنڈری کلاسز میں 86 طلبا دوسری زبان کے طور پر اردو کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں اس طرح اسکول میں 311 طلبا اور طالبات اردو کا علم حاصل کر رہے ہیں ان میں لڑکوں کی تعداد 159 اور لڑکیوں کی تعداد 152 ہے۔

تحصیل مالیرکوٹلہ کے دیہات میں قائم اسلامیہ پبلک اسکول دلیل گڑھ اور اسلامیہ اسکول دُگی بھی طلبا کو ابتدائی اُردو سے آشنا کرنے کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔

اردو کے تعلیمی ادارے مالیرکوٹلہ تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ مالیرکوٹلہ کے علاوہ دوسرے شہروں میں بھی قائم

اقلیتی تعلیمی ادارے اردو کی تعلیم دے کر زبان کی خدمت کر رہے ہیں۔ اسلامیہ پبلک ہائی اسکول احمد گڑھ اپریل 1994 سے علاقے میں اشاعتِ تعلیم اور ترویج اردو کی ذمے داری نبھا رہا ہے۔ درجہ پرائمری میں اضافی مضمون کے طور پر 159 بچے اردو کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ مڈل میں 88 طلبا اور ہائی اسکول میں 61 طلبا پنجاب اسکول ایجوکیشن بورڈ کے نصاب کے مطابق ایڈیشنل اختیاری مضمون کے طور پر اردو پڑھ رہے ہیں۔

اسلامیہ ہائی اسکول منڈی گوبند گڑھ میں طلبا پنجابی میڈیم سے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ہندی دوسری زبان ہے اور اردو کی حیثیت اضافی اختیاری زبان کی ہے۔ پرائمری کے شعبے میں 284 طلبا سال رواں میں اردو بطور اختیاری مضمون کے پڑھ رہے ہیں۔ مڈل میں 44 طلبا ایڈیشنل احتیاری مضمون کے طور پر اردو پڑھ رہے ہیں اور ہائی اسکول میں بھی 34 طلبا اردو کو اختیاری اضافی مضمون کے طور پر پڑھ رہے ہیں۔

بابا فرید اسلامیہ ہائی اسکول پٹیالہ یکم نومبر 1999 سے پنجاب وقف بورڈ کے زیر انتظام چلنے والا پٹیالہ کے تاریخی شہر کا ملت کا معروف تعلیمی ادارہ ہے جہاں تمام مذاہب کے طلبا تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ یہ اسکول پنجاب وقف بورڈ کے سابق رکن میاں غلام صابر کی کوششوں سے وجود میں آیا اور چوہدری محمد رمضان ماہر باغبانی نے اس کی ترقی میں اہم رول ادا کیا۔ اسکول کا ذریعہ تعلیم پنجابی ہے۔ پرائمری میں 9 طلبا، مڈل میں 11 طلبا اور سیکنڈری کلاس میں سات طلبا ایڈیشنل اختیاری مضمون کے طور پر اردو پڑھتے ہیں۔

اسلامیہ پرائمری اسکول لاچھرو کلاں تحصیل راجپورہ ضلع پٹیالہ بھی دور دراز دیہی علاقے میں قائم شدہ اہم اسکول ہے جو 1990 سے پنجاب وقف بورڈ کے زیر انتظام ہے۔ یہ تعلیم کی بنیادی درس گاہ ہے جو علاقے کے مسلم باشندوں کی تعلیمی ضرورت کی تکمیل کر رہی ہے۔ پرائمری شعبے میں 63 طلبا اردو کی ابتدائی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

مدرسہ ایضاح العلوم مجددی، منی مزرعہ، چنڈی گڑھ دینی تعلیم کے ساتھ عصری تعلیم بھی دے رہا ہے۔ مدرسہ چنڈی گڑھ میں اردو کی بنیادی تعلیم کا اہم مرکز ہے۔ یہ مدرسہ 1975 سے درس و تدریس کی اہم خدمت انجام دے رہا ہے۔ پرائمری اور مڈل میں 245 طلبا اردو کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ مدرسے نے خود ہی اپنا اردو نصاب وضع کیا ہے۔ زیادہ تر مولوی اسماعیل میرٹھی کی اردو کتابیں مدرسے میں پڑھائی جاتی ہیں۔ مدرسے کی انتظامیہ کسی تعلیمی بورڈ سے اس کا الحاق کرانے کے لیے کوشاں ہے۔ اس مدرسے کے قیام میں مولانا شکیل احمد قاسمی کی کوششوں کا بڑا دخل ہے۔

مدرسہ فیض العلوم اینڈ محمدیہ ماڈل پبلک اسکول قصبہ شنکر تحصیل نکودر ضلع جالندھر کا قیام 14 اپریل 1996 کو عمل میں آیا۔ درجہ حفظ اور درجہ ناظرہ کے علاوہ آٹھویں جماعت تک عصری تعلیم دی جا رہی ہے۔ اسکول میں 169 طلبا اردو کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ پرائمری میں 41 اور مڈل درجات میں 128 طلبا اختیاری زبان کے طور پر اردو پڑھ رہے ہیں۔ پانچویں تک مولوی اسمٰعیل میرٹھی کی

کتابیں داخل نصاب ہیں۔ مڈل کے درجے میں پنجاب اسکول ایجوکیشن بورڈ کا اردو نصاب شامل ہے۔

مدرسہ دارالعلوم ارشدیہ اینڈ پبلک اسکول حمشیر خاص، جالندھر 2010 میں قائم کیا گیا۔ پرائمری تک 50 طلبا اردو سے فیضیاب ہو رہے ہیں۔

اسلامیہ مڈل اسکول کپورتھلہ 1986 میں مدرسے کی حیثیت سے قائم کیا گیا ہے جسے 1990 میں مڈل اسکول کی شکل دے دی گئی۔ اسکول میں ایڈیشنل اختیاری مضمون کے طور پر اردو پڑھنے والے بچوں کی تعداد 140 ہے۔

تعلیم الاسلام سینئر سیکنڈری اسکول قادیان ضلع گورداسپور 1898 میں پرائمری اسکول کی حیثیت سے قائم کیا گیا تھا۔ 280 طلبا اختیاری مضمون کے طور پر اردو کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ پرائمری میں 99 طلبا مڈل کلاسوں میں 85 اور سیکنڈری میں 56 طلبا اردو پڑھ رہے ہیں۔ گیارہویں جماعت میں 40 طلبا اردو کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

نصرت گرلز ہائی اسکول قادیان ضلع گورداسپور میں اسکول کا ذریعہ تعلیم ہندی اور انگریزی ہے۔ اردو اختیاری مضمون کے طور پر پڑھائی جا رہی ہے۔ پرائمری میں 123، مڈل درجات میں 84 اور سیکنڈری کلاس میں 34 طالبات اختیاری مضمون کے طور پر اردو پڑھ رہی ہیں۔

پنجاب میں زیادہ تر مکاتب اور مدارس پنجاب وقف بورڈ کے زیر انتظام چل رہے ہیں کچھ مدارس انتظامیہ کمیٹیوں کی نگرانی میں بھی چل رہے ہیں لیکن ان میں سے بہت سے وقف بورڈ سے ماہانہ گرانٹ حاصل کرتے ہیں۔

اسکولوں کا اہم مسئلہ اردو کتابوں کی فراہمی اور اردو اساتذہ کی ٹریننگ کا ہے۔ پنجاب اسکول ایجوکیشن بورڈ کی طرف سے این سی ای آر ٹی کی اردو کتابیں نصاب میں شامل کی گئی ہیں۔ اسکولوں کے ذمے داران ان کے لیے بعض دفعہ مقامی طور پر کتابوں کی دستیابی نہیں ہوتی جس کے لیے انھیں دہلی جا کر کتابیں حاصل کرنا پڑتی ہیں۔ دہلی میں بھی آسانی سے کتابیں حاصل نہیں ہوتیں۔ اگر کتابوں کی فراہمی کے مسئلے کو قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کے اشتراک سے حل کرلیا جائے تو پنجاب میں اردو پڑھانے والے اسکولوں کا دیرینہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔ اب تک کسی کالج میں اردو اساتذہ کی ٹریننگ کا انتظام نہیں تھا جس کے لیے اکثر طلبا دہلی اور جموں کشمیر جانے کے لیے مجبور تھے۔ لیکن اب گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن مالیرکوٹلہ میں ٹیچنگ آف اردو کا مضمون پڑھا جانے لگا ہے۔ گزشتہ سال 34 طلبا بی۔ ایڈ ایڈیشنل تدریس اردو کے امتحان میں شریک ہوئے جس سے ان شاء اللہ ٹرینڈ اردو اساتذہ کی کمی کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔

پنجاب کے اقلیتی تعلیمی ادارے اردو کی تعلیم کا جو مقدس فریضہ انجام دے رہے ہیں وہ اس خطے میں فروغِ اردو کے لیے بہت اہم اور اردو کے روشن مستقبل کی علامت ہے۔

Mr. Mohd Iqbal, Principal, Govt. College of Education, Maler Kotla- 148023 (Pb.)

اردو تحقیق میں مواد کی فراہمی: مسائل اور حل

میر رحمت اللہ

تحقیق میں سب سے پہلا اور اہم مرحلہ موضوع کا انتخاب ہوتا ہے۔ موضوع کے انتخاب کے بارے میں یہ بات کافی مقبول ہے کہ آیا شریک حیات کا انتخاب مشکل ہے یا موضوع کا۔ یہ بات اس لیے کہی جاتی ہے کیوں کہ موضوع کے انتخاب کے سلسلے میں کئی ایک باتوں کا دھیان رکھنا از حد ضروری ہوتا ہے۔ موضوع کے انتخاب کے وقت ایک ریسرچ اسکالر کو یہ دیکھنا ضروری ہوتا ہے کہ اس موضوع کا انتخاب کیوں کیا جارہا ہے؟ اس پر کام کرنے کی کتنی ضرورت ہے اور اس موضوع سے علم کے کس شعبے کو فائدہ پہنچے گا یا یہ کہ اس سے علم کا دائرہ کتنا وسیع ہوگا؟ اس کے علاوہ محقق کو یہ بھی دیکھنا ضروری ہوگا کہ کیا واقعی اس موضوع پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اب اگر اس موضوع پر پہلے سے ہی کچھ کام ہوا ہے تو ایسی صورت میں اسے یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ کون سے نئے پہلو ہیں، جن پر مزید تحقیق کرنے کی گنجائش ہے۔

ایک بار موضوع کا انتخاب ہونے کے بعد محقق کو کوئی مفروضہ Hypothesis قائم کرنا پڑے گا۔ اگرچہ کئی ماہرین کا ماننا ہے کہ ادبی تحقیق میں مفروضے کی ضرورت نہیں لیکن یہ بات حقیقت سے بے حد دور ہے کیونکہ تحقیق تو مفروضہ قائم کیے بغیر آگے بڑھ ہی نہیں سکتی۔ مفروضے کی غیر موجودگی میں محقق کا معاملہ ریگستان میں سفر کرنے والے اس مسافر کی طرح ہوگا، جس کو یہ نہیں معلوم کہ اس کی منزل کس سمت میں ہے۔

مذکورہ مراحل کے بعد مواد کی فراہمی کی منزل آتی ہے۔ تحقیق کسی بھی شعبے میں ہو مواد کے بغیر ممکن ہی نہیں بلکہ کئی ایک ماہرین کا ماننا ہے کہ تحقیق کی گاڑی مواد کے ایندھن کے بغیر چل ہی نہیں سکتی اور مواد ہی محقق کے غور و فکر کی بنیاد ہوتا ہے۔ پروفیسر عبدالستار دلوی کے مطابق:

''خالص مواد کی شکل خام مال کی طرح ہوتی ہے۔ اسی خام مال سے تجزیہ، درجہ بندی اور تحقیق کے ذریعہ نتائج اور عام اصول وضع کیے جاتے ہیں۔''

(ادبی اور لسانی تحقیق، ترتیب، پروفیسر عبدالستار دلوی، ص 32)

مواد کی فراہمی تحقیق میں کافی اہمیت کی حامل ہے۔ اس کا سارا بار ایک ریسرچ اسکالر کو خود ہی اٹھانا پڑتا ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ ایک محقق کو خود سے ہی کنواں کھودنا پڑتا ہے اور خود سے ہی اپنی پیاس بجھانی پڑتی ہے۔ ادبی تحقیق چونکہ عملی کم اور کتابی زیادہ ہوتی ہے، اس لیے ادبی تحقیق کا آغاز ان کتابوں کی تلاش سے ہی ہوتا ہے جو موضوع تحقیق سے متعلق ہوں۔ خلیق انجم نے اپنے ایک مضمون 'ادبی تحقیق اور حقائق' میں لکھا ہے کہ ایک محقق کو سب سے پہلے یہ معلوم کرنا ہوگا کہ موضوع سے متعلق کیا مواد ہے؟ کہاں ہے؟ اور کیسے فراہم کیا جاسکتا ہے؟

(لسانی اور ادبی تحقیق، ترتیب پروفیسر عبدالستار دلوی، ص 160)

ایک ریسرچ اسکالر کو مواد کی فراہمی میں احتیاط سے کام لینا ضروری ہے کیوں کہ مواد کی فراہمی میں اسے ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا پڑتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ محقق آنکھیں بند کر کے مواد کی فراہمی کو یقینی بنانا چاہتا ہے۔ اس مرحلے پر وہ یہی سوچتا ہے کہ کسی بھی طرح اسے اپنے موضوع سے متعلق ضروری و غیر ضروری مواد فراہم ہو جائے۔ آگے جا کر وہ جب مواد کو پرکھنے کے لیے بیٹھتا ہے تو غیر ضروری مواد میں اپنے آپ کو گھرا پاتا ہے۔ اس لیے مواد کی فراہمی کی منزل سے بڑی ہوشیاری اور دانشمندی سے گزرنے کی ضرورت ہے۔ یہاں پر رہنما کا فرض بنتا ہے کہ وہ نئے محقق کو بنیادی مواد کی فراہمی کے لیے اپنے مشوروں سے نوازے تاکہ وہ اس بحرِ بیکراں سے نبرد آزما ہو سکے۔

مواد کی فراہمی کے سلسلے میں محقق کو شہد کی مکھی سے تعبیر کیا گیا ہے کہ جس طرح شہد کی مکھیاں مختلف پھولوں کا رس چوس کر شہد بناتی ہیں، اسی طرح ایک محقق کو بھی مختلف ماخذوں کو حاصل کر کے اپنی تحقیق کو بہترین بنانا پڑے گا تب جا کر وہ تحقیق کا حق ادا کر پائے گا۔

مواد کی فراہمی میں ایک محقق کو بڑے غور و فکر سے کام کرنا پڑتا ہے۔ اسے بنیادی مواد تک رسائی حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اکثر ریسرچ اسکالر ثانوی ماخذ سے مدد لے کر اپنی تحقیق کو مکمل کر لیتے ہیں، جس کی وجہ سے آگے چل کر انھیں دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ بنیادی ماخذوں کی غیر موجودگی میں اس کی تحقیق ناقص ہی رہتی ہے۔ ایسی صورت میں حاصل شدہ نتائج کی صحت پر شکوک و شبہات کی انگلی اٹھ سکتی ہے۔

تحقیق چونکہ کافی دشوار گزار کام ہے اس لیے اس میں دلچسپی، دل جمعی، لگن و محنت کے ساتھ ساتھ خاطر خواہ وقت بھی چاہیے۔ ان تمام مراحل سے ہم تبھی نبرد آزما ہو سکتے ہیں جب ان کے لیے پہلے سے ہی ذہنی طور پر تیار ہوں۔ بعض ریسرچ اسکالر ابتدائی تین چار برس مواد اکٹھا کرنے میں ہی گزار دیتے ہیں، ایسے میں آخری برسوں میں انھیں کافی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے ریسرچ اسکالر کو چاہیے کہ جتنی جلد ہو سکے مواد کو اکٹھا کر کے، اس کی چھان پھٹک کا کام شروع کر دے۔ جو لوگ واقعی تحقیق سے دلچسپی رکھتے ہیں، وہ کبھی کبھی اپنا کھانا پینا بھی بھول جاتے ہیں۔ اس ضمن میں گیان چند جین نے قاضی عبدالودود کے حوالے سے بڑے پتے کی بات کہی ہے۔ لکھتے ہیں:

''تحقیق صرف وہی کر سکتا ہے جسے سوائے کھانے پینے اور تحقیق کرنے کے دوسرا کام نہ ہو۔''

(تحریریں، ڈاکٹر گیان چند جین، ص 11)

ادبی تحقیق کے لیے مواد کی فراہمی کا سب سے بہترین ذریعہ لائبریریاں ہیں۔ لائبریریوں میں نہ صرف ادبی کتابیں موجود ہوتی ہیں بلکہ دنیا میں رائج الوقت علوم و فنون سے متعلق کتابیں بھی ہر وقت دستیاب رہتی ہیں جن سے ضرورت پڑنے پر نہ صرف محققین بلکہ عام قارئین بھی استفادہ کر سکتے ہیں۔ محقق کو چونکہ اپنے موضوع سے متعلق مواد لائبریریوں سے ہی فراہم ہوتا ہے، اس لیے وہ زیادہ تر کتب خانوں سے ہی استفادہ کرتے ہیں۔

اب اگر ہم ہندستان کے اردو کتب خانوں کا جائزہ لیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ہندوستان میں اردو کی بیشتر لائبریریاں بتدریج زوال پذیر ہیں۔ وہ چاہے ادارۂ ادبیات حیدر آباد ہو یا کشمیر کی مختلف لائبریریاں۔ مواد کی تلاش کے دوران راقم نے اس بات کا از خود مشاہدہ کیا ہے کہ ریاست جموں و کشمیر کی لائبریریوں میں ادب کی مایہ ناز

کتابیں کس طرح گرد کی نذر ہو رہی ہیں؟ اس ضمن میں ایک اور بات یہ بھی ہے کہ اردو داں طبقہ خوابِ غفلت سے بیدار ہونے کے لیے ابھی تیار نظر نہیں آتا۔ جب تک اردو والے خود بیدار نہیں ہوں گے تب تک اردو ادب کے مایہ ناز ادبی ذخیرے کو محفوظ کرنے کی طرف کوئی پہل نہیں ہوگی اور نہ ہی نئی لائبریریوں کے قیام کی طرف پیش رفت ہو سکے گی۔ ہمارے اپنے شعبۂ اردو میں ابھی تک کتب خانہ قائم نہیں ہو سکا ہے، جب کہ شعبے کو قائم ہوئے ایک زمانہ ہو چکا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ اسی یونیورسٹی میں باقی تمام شعبوں میں ان کی اپنی ذاتی لائبریریاں موجود ہیں چاہے وہ شعبۂ ہندی ہو یا شعبۂ انگریزی۔ ایسی صورت میں شعبے کے ریسرچ اسکالروں سے عمدہ اور بہترین تحقیقی کام کا تقاضہ تو کیا جا سکتا ہے لیکن نتیجہ خاطر خواہ ہو، ایسی امید نہیں کی جا سکتی۔ پروفیسر عبدالستار دلوی نے اپنی کتاب 'ادبی تحقیق' میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ تحقیقی عمل کی کامیابی اور تکمیل کا انحصار لائبریری کے مواد کی وسعت اور اس کی ہمہ گیری پر ہوتا ہے۔

ایک محقق کو مواد کے انتخاب کی مہارت بھی ضروری ہے تاکہ وہ غیر ضروری مواد کو نظر انداز کر کے اپنے لیے مفید اور ضروری مواد ہی جمع کر سکے۔ لائبریری میں کتابوں کو آسانی سے حاصل کرنے کے لیے کارڈ پر کتابوں کی فہرست بنائی جاتی ہے۔ ہر کارڈ پر کتاب کا نام، مصنف کا نام، موضوع اور لائبریری کی الماری یا شلف کا مخصوص نمبر درج کیا جاتا ہے۔ اس طرح سے محقق کارڈوں کو دیکھ کر اپنے مواد کی کتابیں آسانی سے حاصل کر سکتا ہے۔ موجودہ زمانہ چونکہ کمپیوٹر کا زمانہ ہے۔ ایسی صورت میں اب کارڈ کی جگہ کمپیوٹر کا استعمال ہو رہا ہے۔ ایک لائبریری میں جتنی بھی کتابیں ہوتی ہیں ان کو کمپیوٹر میں ایک نظم وضبط کے ساتھ درج کیا جاتا ہے اور ضرورت پڑنے پر اپنی پسند کی کتاب کا نام ٹائپ کر آسانی سے تلاش کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح بھی ایک محقق آسانی سے کسی بھی لائبریری سے مواد کی تلاش اور فراہمی کو یقینی بنا سکتا ہے۔ اس لیے ایسی صورت میں اگر آج کا محقق کمپیوٹر سے نابلد ہے تو بھی مواد کی فراہمی میں اسے دشواری پیش آئے گی۔ عبدالستار دلوی نے اس ضمن میں لکھا ہے:

''ایک محقق کو کتابوں کی فہرست اور ان کو رکھے جانے کے طریقۂ کار سے اچھی طرح واقف ہونا چاہیے تاکہ مواد کی تلاش جلد اور مکمل انداز میں ہو سکے۔ اس کے علاوہ مواد کے انتخاب کی مہارت بھی ضروری ہے تاکہ وہ غیر ضروری مواد کو نظر انداز کر کے اپنے لیے مفید اور ضروری مواد ہی جمع کر سکے۔''

(ادبی اور لسانی تحقیق، پروفیسر عبدالستار دلوی، ص 37)

ملک کی مختلف لائبریریوں میں اردو زبان وادب کی کتابیں بکثرت ملتی ہیں۔ لیکن اردو کی کچھ بہترین لائبریریوں کو چھوڑ کر کسی بھی اہم لائبریری کو اب تک کمپیوٹرائزڈ نہیں کیا گیا ہے۔ اس لیے نئے ریسرچ اسکالروں کو مواد کی کتابیں ڈھونڈنے کے لیے وہ طریقے استعمال کرنا پڑتے ہیں جو ترقی یافتہ زبانوں میں تحقیق کرنے کے لیے آج سے بیس سال پہلے رائج تھے۔ مواد کی فراہمی کی منزل کے دوران راقم نے اس حقیقت کا مشاہدہ کیا کہ حکومت نے آج تک کئی لائبریریوں کو کمپیوٹرائزڈ کرنے کے لیے کمپیوٹروں کی فراہمی یقینی بنائی

> مواد کی فراہمی میں ایک محقق کو بڑے غور وفکر سے کام کرنا پڑتا ہے۔ اسے بنیادی مواد تک رسائی حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اکثر ریسرچ اسکالر ثانوی مآخذ سے مدد لے کر اپنی تحقیق کو مکمل کر لیتے ہیں، جس کی وجہ سے آگے چل کر انھیں دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ بنیادی ماخذوں کی غیر موجودگی میں اس کی تحقیق ناقص ہی رہتی ہے۔

لیکن آج تک یہ کام اس لیے تکمیل کو نہیں پہنچ پایا کہ ان لائبریریوں کے منتظمین ان مشینوں کو استعمال کرنا نہیں جانتے ہیں۔

ادبی تحقیق کے لیے کتابوں کے علاوہ رسائل وجرائد بھی کافی اہمیت رکھتے ہیں بلکہ کئی حضرات کا یہاں تک ماننا ہے کہ رسائل کی اہمیت کتابوں کے مقابلے میں زیادہ ہے کہ ان میں جدید معلومات ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند جین رسائل کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تحقیق میں لکھنے سے کہیں زیادہ وقت مواد کی فراہمی میں صرف ہوتا ہے۔ اپنے موضوع سے متعلق نہ صرف تمام اردو کتابوں کو چھان مارنے کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ رسالوں میں بھی اپنے کام کے مقالے کھوجنے چاہئیں۔ کیوں کہ ان میں بسا اوقات وہ بیش بہا نکتے مل جاتے ہیں جو ہنوز کتابی صورت میں نہیں آئے۔''

(تحریریں، ڈاکٹر گیان چند جین، ص 13)

لائبریری میں عموماً کتابوں کے علاوہ رسائل کی بھی ایک بڑی تعداد ہوتی ہے اور ان کو محفوظ رکھنے کے لیے ایک الگ کمرہ بھی فراہم کیا جاتا ہے۔ ملک کی تقریباً تمام لائبریریوں میں رسائل وجرائد کے لیے باضابطہ رجسٹریشن ہوتے ہیں۔ ایک نئے ریسرچ اسکالر کو اپنے موضوع کی بہت ساری تفصیلات رسائل میں بھی مل جاتی ہیں۔ رسائل کا استعمال کتابوں کے مقابلے میں قدرے مشکل ہوتا ہے کہ ان کے کارڈ نہیں بنائے جاتے۔ ایسے میں محقق کو خود ہی رسائل کی فہرست اور مضامین کی تلاش کرنی پڑتی ہیں۔ زبان وادب کے کسی بھی شعبے میں کی جانے والی تحقیق کا زیادہ تر مواد کتابوں اور رسائل پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس لیے ایک ریسرچ اسکالر کو خود بھی ادبی رسائل و جرائد کی رجسٹریشن ہونی چاہیے تاکہ وہ ان میں آسانی سے اپنے کام کی چیزیں حاصل کر سکیں۔

مواد کی فراہمی میں انٹرویوز کی بھی خاصی اہمیت ہے۔ ایک نئے ریسرچ اسکالر کے لیے جب وہ کسی دور پر کام کر رہا ہو تو اسے متعلق مواد حاصل کرنے کے لیے ادیبوں، ناقدوں اور دانشوروں سے انٹرویوز کے ذریعے متعلقہ مواد سے متعلق اہم معلومات اکٹھا کرنا بھی ضروری ہوتا ہے لیکن اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ یونیورسٹیوں کے اساتذہ بھی جو اس میدان میں ماہر ہوتے ہیں، جس پر کام ہو رہا ہوتا ہے، جب طلبہ ان سے انٹرویو کا وقت چاہتے ہیں تو وہ مصروفیات کا بہانہ بنا کر ٹال دیتے ہیں یا پھر وقت دیتے بھی ہیں تو خوش دلی کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ حد تو یہ ہے کہ جتنی معلومات ان کے پاس ہوتی ہیں، انھیں بھی وہ بڑی کنجوسی سے پیش کرتے ہیں۔ اس طرح بھی بعض اوقات محققین کو دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اس سلسلے میں، میری رائے ہے کہ ماہرین ادب کو بھی ریسرچ اسکالروں کی مدد کرنی چاہیے تاکہ اردو ادب میں بہترین تحقیقی کام ہو سکے اور نئے ریسرچ اسکالروں کو آپ کی مدد سے حوصلہ مل سکے جس سے نہ صرف مواد کی فراہمی میں آسانی ہو گی بلکہ ریسرچ اسکالر کا بہت سا وقت بھی بچے گا اور تحقیق کی دشوار گزار راہیں بھی آسان ہوں گی۔

Meer Rehmatullah, PhD Scholar, Room No-205, Mens Hostel-E Annex. University of Hyderabad. Hyderabad-500046

اردو کے پہلے صاحب دیوان کی محبوبہ

(تاریخ کی روشنی میں)

سیدہ جعفر

اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ شرنگار رس اور جمالیاتی شعور کا فنکار تھا۔ محمد قلی کا کلام اس کے جمالیاتی ادراک کا مظہر ہے اس نے اپنے کلیات میں بارہ پیاریوں کا ذکر کیا ہے جو حسن و جمال کا پیکر تھیں۔ بعض مورخین اور مصنفین نے بھاگ متی کو محمد قلی قطب شاہ کی عزیز ترین محبوبہ بتایا ہے۔ تاریخ کی روشنی میں اس حقیقت کا جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ بھاگ متی کا وجود تاریخ دکن میں ہمیشہ سے سوالیہ نشان بنا رہا ہے۔ مغل مورخین میں سب سے پہلے فیضی نے محمد قلی قطب شاہ اور بھاگ متی کے افسانے کا ذکر کیا ہے۔ اور 'زیب داستاں' کے لیے اس میں بہت سے واقعات کا اضافہ کردیا ہے۔ فیضی شہنشاہ اکبر کے ریذیڈنٹ کی حیثیت سے احمد نگر اور برہان پور میں 1591 سے 1594 تک قیام پذیر رہا تھا۔ وہ اپنی تصنیف 'تباشیر الصبح' 1 کی ایک عرض داشت میں محمد قلی کے بارے میں رقمطراز ہے کہ اس نے اپنی محبوبہ بھاگ متی کے نام پر ایک شہر آباد کیا ہے۔ بھاگ متی احمد قلی (محمد قلی) کی 'معشوقہ قدیم' ہے۔ 2

فیضی نے تلنگانہ کی سرزمین پر کبھی قدم نہیں رکھا تھا اس کا مندرجہ بالا بیان سلطنت قطب شاہی سے اس کی عدم واقفیت کا ترجمان ہے جس کی انتہا یہ ہے کہ اس نے قطب شاہی سلطنت کے سلطان وقت کا نام تک صحیح نہیں لکھا ہے۔ پروفیسر ہارون خاں شیروانی لکھتے ہیں کہ ''فیضی دکن کی سلطنتوں کو ذاتی طور پر ناپسند کرتا تھا۔'' 3 اور برہان پور میں وہ اس لیے شہنشاہ اکبر کا ریذیڈنٹ مقرر کیا گیا تھا کہ جنوبی ہند میں مغل سلطنت کی توسیع کے امکانات کا جائزہ لیتا رہے۔ فیضی بیجاپور، احمد نگر اور گولکنڈے کی حکومتوں کو آزاد اور خودمختار سیاسی اکائیاں تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا اس لیے وہ ان سلطنتوں کو 'جاگیروں' کے نام سے موسوم کرتا اور ان کے حکمرانوں کو امیروں اور رئیسوں سے زیادہ وقعت کا حامل نہیں سمجھتا جس سے اس کے تحقیر آمیز رویے کا اظہار ہوتا ہے۔ بیرون سلطنت کے ایک اور مورخ نظام الدین احمد نے 'طبقات اکبر شاہی' (1594 مطابق 1002ھ) میں محمد قلی کے معاشقے کا ذکر کیا ہے۔ 4 ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قطب شاہی سلطنت اور محمد قلی کے بارے میں اس کی معلومات ناکافی اور محدود تھیں۔ نظام الدین احمد نے محمد قلی کے عہد حکومت کے آغاز کا سنہ غلط تحریر کیا ہے اس نے محمد قلی کے افسانہ محبت میں خاصی رنگ آمیزی کی ہے اور بھاگ متی کے جلوس میں 'ہزار سواروں' کا اضافہ بھی اس کی ذہنی اختراع ہے۔ پروفیسر ڈاوسن فیضی کے تسامحات کی وجہ سے اس کو مورخ نہیں سمجھتا۔ ایک اور مغل مورخ خافی خان نے بھی بھاگ متی کی داستان عشق کی طرف اشارے کیے ہیں۔ خافی خاں 'منتخب اللباب' میں اعتراف کرتا ہے کہ اس نے ابوالقاسم فرشتہ کی 'تاریخ گلشن ابراہیمی' پر تکیہ کیا ہے۔ عبدالباقی نے 'ماثر رحیمی' (1025ھ) میں فرشتہ کی تاریخ سے معلومات اخذ کی ہیں۔ محمد قلی کے بارے میں اس کا بیان ہے کہ اس نے اپنی محبوبہ بھاگ متی کے نام پر ایک شہر آباد کیا ہے جس کا نام بھاگ نگر ہے۔ عبدالباقی لکھتا ہے کہ محمد قلی کی وفات کے بعد اس کا بھائی محمد امین تخت نشین ہوا حالانکہ محمد قلی کی وفات کے بعد اس کا بھتیجا اور داماد سلطان محمد قطب شاہ تخت نشین ہوا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شہر حیدرآباد اور فرماں روائے شہر کے بارے میں عبدالباقی کی معلومات کتنی غلط اور گمراہ کن تھیں۔ عبدالباقی نے بھاگ متی کے لیے 'رقاصہ' کا لفظ استعمال کیا ہے کیونکہ اس نے فرشتہ کی تاریخ پر اپنے بیانات کی بنیاد رکھی تھی۔ قطب شاہی دور سے متعلق خود فرشتہ کے بیانات قابل تصحیح ہیں وہ بھاگ متی کو 'فاحشہ کہنہ' بتاتے ہوئے لکھتا ہے کہ محمد قلی اس کی محبت میں گرفتار ہوگیا ہے۔ 5

فرشتہ ایک ایسا مورخ ہے جس نے اکثر جگہ صحیح معلومات پر تخیل کی اونچی اڑانوں اور انشاپردازی کو ترجیح دی ہے اور تاریخ نویسی میں زبانی روایات (Oral Traditions) اور افواہوں کو بھی جگہ دی ہے۔ اپنے دیباچے میں مورخ نے افسوس ظاہر کیا ہے کہ قطب شاہی خاندان کے سلسلے میں اس کی معلومات تشنہ اور ناکافی ہیں۔ فرشتہ دراصل مورخ بیجاپور ہے اس نے قطب شاہی عہد کے جو حالات قلمبند کیے ہیں وہ زیادہ تر سماعی ہیں۔

جب ہم فرشتہ کی ہم عصر تاریخوں پر نظر ڈالتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس دور کی تاریخوں میں خواہ وہ احمد نگر میں لکھی گئی ہوں یا بیجاپور اور گولکنڈہ میں ہمیں کہیں بھاگ متی اور بھاگ نگر کا تذکرہ نظر نہیں آتا۔ 'برہان ماثر' 1038ھ مطابق 1620 میں لکھی گئی تھی جس میں گولکنڈہ کے حالات شرح وبسط کے ساتھ لکھے گئے ہیں لیکن کہیں بھاگ متی کا ذکر ہے نہ اس کے نام پر بسائے ہوئے شہر کا نام ونشان موجود ہے۔ 'تاریخ قطب شاہ' میں بانی سلطنت قطب شاہیہ سلطان محمد قلی قطب الملک سے لے کر 1025ھ مطابق 1616 تک کے حالات درج ہیں اور حیدرآباد کی عمارتوں اور آثار کا مفصل بیان موجود ہے لیکن یہ تاریخ بھی بھاگ متی اور بھاگ نگر کے ذکر سے خالی ہے اس کے برخلاف یہ ہمعصر مورخ محمد قلی کے آباد کیے ہوئے شہر کا نام حیدرآباد بتاتا ہے اور رقم طراز ہے:

''بازار ہائے وسیع و چہاردہ ہزار دوکان در پیش ہر دوکان ایوان وحمامات، خانقاہ و مدرسہ، لنگر و مہمان خانہ... وہ جانب شمال مرکز دولت و مستقر سلطان قرار داد... واین شہر خجستہ راموسوم بہ حیدرآباد کردند۔'' 6

نظام شیرازی نے 'حدیقۃ السلاطین' 1054ھ مطابق 1644 میں مرتب کی تھی۔ نظام الدین نے 'حدیقۃ السلاطین' میں اور علی ابن طیقور بسطامی نے 'حدائق السلاطین فی کلام الخواقین' (1092ھ مطابق 1681) میں محمد قلی کے حالات بیان کیے ہیں لیکن ان تاریخوں میں بھاگ متی کا ذکر موجود نہیں اور ان میں بھاگ نگر کا نہیں شہر حیدرآباد کا حال درج کیا گیا ہے۔ علی ابن طیقور لکھتے ہیں:

''شہر حیدرآباد مسکن ارباب علم وسواد و مامن اصحاب رشید وارشاد است۔'' 7

رفیع الدین شیرازی نے اپنی مشہور تاریخ 'تذکرۃ الملوک' اسی سال مکمل کی تھی جس سال فرشتہ کی تاریخ پایہ تکمیل کو پہنچی تھی لیکن رفیع الدین شیرازی نے کہیں اس معاشقے کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا ہے۔ 8

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ ہمعصر تاریخیں بعد کی لکھی ہوئی تاریخوں سے زیادہ مستند تصور کی جاتی ہیں اور مستند ہمعصر تاریخوں میں بھاگ متی کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ اس افسانے کی ان مورخین نے نشان دہی کی جنھوں نے فرشتہ کی تاریخ کو اپنا ماخذ بنایا تھا اور بقول پروفیسر عبدالمجید صدیقی 'مقامی تاریخوں کی خاموشی اس روایت کی صداقت میں بہتیرے شبہات پیدا ہوجاتے ہیں۔'' 9 مغل مورخین نے عمداً اسی رقعہ رنگین میں اضافے کیے، پھر آصفیہ مورخین

میں سب سے پہلے 'حدیقۃ العالم' (1214ھ مطابق 1799) کے مصنف نے دونوں نظریوں کو پیش کرتے ہوئے فیصلہ قارئین پر چھوڑ دیا ہے۔ ماہ لقابائی چندا کی فرمائش پر جب حاجی غلام حسین نے تاریخ 'ماہ نامہ' مرتب کی تو اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی اور وہ منعم خان ہمدانی کے محاکموں کو بے بنیاد قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''خواجہ منعم خان ہمدانی در سوانح رکن مرقوم فرمودہ کہ بھاگ متی نام یاتری بود و سلطان محمد قلی قطب شاہ بر و تعشق دارد این اصلح نیست۔'' 10

'گلزار آصفیہ' میں غلام حسین جوہر لکھتے ہیں کہ جب ابراہیم قطب شاہ کو شہزادے محمد قلی کے بارے میں معلوم ہوا کہ بھاگ متی سے ملنے کے لیے اس نے متلاطم دریا میں گھوڑا ڈال دیا تھا تو بادشاہ نے موسیٰ ندی پر ایک پل بنوا دیا۔''

پروفیسر عبدالمجید صدیقی اور دوسرے مورخین رکن اس بات پر متفق ہیں کہ محمد قلی کا سنہ ولادت 972ھ مطابق 1565 تھا اس پل کی تعمیر کے وقت شہزادے کی عمر بمشکل آٹھ سال قرار پاتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ محمد قلی ایک منچلا اور عاشق مزاج شہزادہ تھا لیکن ایک آٹھ سالہ لڑکے کا جذبہ عشق کے ہاتھوں مجبور ہو کر دریا کی طوفان خیز موجوں سے گرم ستیز ہونا قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا۔ ڈاکٹر زور 'کلیات محمد قلی قطب شاہ' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''محمد قلی عنفوان شباب ہی (یعنی چودہ سال کی عمر میں) بھاگ متی پر عاشق ہوا اور اس کی خاطر طغیانی رودِ موسیٰ میں اپنا گھوڑا ڈال دیا۔ جب اس خطرناک جرأت کی خبر اس کے باپ ابراہیم کو ہوئی تو اس نے ندی پر پل بنوایا۔'' 11

پل کے اختتام تعمیر کے وقت شہزادے کی عمر چودہ سال تھی لیکن آغاز تعمیر کے وقت اس نے اپنی زندگی کے صرف آٹھ سال مکمل کیے تھے۔ پل کی تعمیر کی ابتدا اور اس کے پایہ تکمیل کو پہنچنے کے سنین سے متعلق ڈاکٹر زور کو اشتباہ ہوا ہے اور انھوں نے اس نکتے کی طرف توجہ نہیں کی۔ پل کی تعمیر کا آغاز سنہ 1573 میں ہوا تھا اور اس وقت شہزادہ محمد قلی کی عمر صرف آٹھ سال تھی۔ پل کی تکمیل 1578 میں ہوئی۔

ڈاکٹر زور نے یہ بھی لکھا ہے کہ چونکہ بھاگ متی پچیلم کی رقاصہ تھی اس لیے شاعر نے دانستہ طور پر کلیات میں اس کے ذکر سے گریز کیا ہے۔ ڈاکٹر زور کا یہ بیان اس لیے قابل قبول نہیں معلوم ہوتا کہ محمد قلی نے اپنے کلیات میں جن محبوباؤں کے حسن دل آرا کی تعریف کی ہے ان میں کوئی 'پاتر' ہے تو کوئی 'کسبن' اور وہ ان ہی الفاظ سے انھیں یاد کرتا ہے۔ بعض مورخین کا بیان ہے کہ بھاگ متی کو اپنے حرم میں داخل کرنے کے بعد محمد قلی نے اس کو 'حیر محل' کا خطاب عطا کیا تھا اور اسی مناسبت سے شہر کا نام بھاگ نگر کے بجائے حیدر آباد رکھا تھا۔ اگر حیر محل اور بھاگ متی جسے وجہی کی مشتری سمجھ لیا گیا ہے ایک ہی محبوبہ کے دو نام ہیں تو اپنے کلیات میں محمد قلی ان کا علیحدہ علیحدہ ذکر نہیں کرتا اور اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ بھاگ متی ہی حیر محل تھی تو پھر کلیات کی داخلی شہادتیں اس کی تردید کرتی ہیں اس لیے کہ محمد قلی نے اپنی بارہ مخصوص محبوباؤں کو 'بارہ پیاریوں' سے موسوم کیا ہے اور کہتا ہے:

نبی صدقے بارہ اماماں کرم سوں
کرو عیش جم بارہ پیاریاں سوں پیارے

مختصر یہ کہ محمد قلی قطب شاہ کے کلیات میں ایک مصرعہ بھی ایسا نہیں ملتا جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ محمد قلی قطب شاہ کی محبوبہ بھاگ متی کو قطب مشتری بھی کہتے تھے۔ اور بھاگ متی کے نام پر بھاگ نگر آباد ہوا تھا اور بعد میں جب وہ حیر محل بنی تو اس شہر کا نام بدل کر حیدر آباد رکھا گیا۔ محمد قلی قطب اپنے شہر کو بھاگ نگر نہیں کہتا اس کے برخلاف جہاں کہیں بھی شہر کا ذکر آیا ہے شاعر نے شہر حیدر کے نام سے اس کی نشان دہی کی ہے:

رتن قطبا کے ہیں نرمول نئیں کئیں شہر میں مول اس
لے کر آوں جو بکھرا ہوئے اس سا شہر حیدر میں
بریاں نظراں تھے اس کو اپسندا تا رو
کہ حیدر نگراں آنداں بھرا

غواصی نے بھی 'حیدر آباد' کی نشان دہی کی ہے اور شہر کا نام 'حیدر آباد' بتایا ہے۔

بہرحال بھاگ متی کا وجود تاریخ میں ایک سوالیہ نشان بن گیا ہے۔

'کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ' ڈاکٹر زور کی گرانقدر تحقیقی کاوش ہے۔ انھوں نے پہلی بار 'سلسلہ یوسفیہ' کی جانب سے یہ کلیات شائع کیا تھا اس کے بعد راقمۃ الحروف کی کلیات محمد قلی قطب شاہ کے NCPUL سے دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ میں نے یہ سوچا کہ محمد قلی قطب کے کلام کا مطالعہ ایک بدلے ہوئے زاویے سے کرنا چاہیے۔ پہلے تو میں نے کلیات میں جو غزلیں سالار جنگ کے مخطوطے میں موجود ہیں لیکن ڈاکٹر زور کی نظر جن پر نہیں پڑی اپنے کلیات میں شامل کر دیے ہیں۔ مجھے لندن کے برٹش میوزیم اور انڈیا آفس لائبریری میں محمد قلی قطب کے کلام کا کوئی نمونہ نہیں ملا۔ لندن کے ایک تاجر نوادرات کے ذخیرے سے محمد قلی قطب کی بارہ غزلیں دستیاب ہوئیں اس طرح کل چودہ تخلیقات کا میں نے اضافہ کیا ہے۔ محمد قلی کے جمالیاتی شعور کا تجزیہ کرتے ہوئے میں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ شرنگار رس اس کے کلام میں رواں دواں ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کے کلام میں ہندوی شعریات کا اثر نمایاں ہے۔ شاعر کے جمالیاتی وژن اور شعری حسیت میں ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب نفوذ کر گئی ہے۔ محمد قلی نے کام شاستر کی اصطلاحوں کی بڑی آزاد خیالی اور بیباکی کے ساتھ اپنے مطالب کی تشریح کے لیے استعمال کیا ہے۔ مثلاً عورتوں کی چار قسموں کا ذکر کام شاستر سے ماخوذ ہے۔ وہ 'پدمنی' اور 'چیتنی' کے حسن کو سراہتا ہے۔ محمد قلی نے ہندوستانی معاشرت، لباس، زیورات طرز فکر اور رسومات وغیرہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس کی نشان دہی ضروری تھی۔ میں نے اس کی تحقیق پہلی بار کی ہے۔

حواشی

1. تاشیر الصبح فیضی کے خطوط کا مجموعہ ہے جس کا دوسرا نام 'انشائے فیضی' ہے۔
2. فیضی: تاشیر الصبح۔ مخطوطہ، کتب خانہ سالار جنگ، ص 31
3. پروفیسر ہارون خان شروانی، ہسٹری آف دی قطب شاہی.....
4. نظام الدین احمد، طبقات اکبر شاہی، صفحہ 444
5. ابوالقاسم فرشتہ: گلشن ابراہیمی، جلد دوم، ص 173
6. مخطوطہ اسٹیٹ سنٹرل لائبریری حیدر آباد، ص 248
7. مخطوطہ کتب خانہ سالار جنگ حیدر آباد ورق 114 الف
8. مخطوطہ اسٹیٹ سنٹرل لائبریری، حیدر آباد.....
9. تاریخ گولکنڈہ، ص 217
10. ماہ نامہ مخطوطہ کتب خانہ سالار جنگ، حیدر آباد ورق 35 ال
11. ڈاکٹر زور: کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ، ص 83

Ms. Sayyada Jafar, 9-1-24/1, Langer Nagar, Hyedrabad-500008 (AP)

مقصود دانش

اردو افسانہ
بیانیہ کا ارتقائی سفر

بعض ناقدین راست بیانیہ پر مبنی افسانے کو 'بیانیہ افسانے' سے تعبیر کرتے ہیں گویا علامتی، واستعاراتی اور تمثیلی افسانوں سے بیانیہ کا رشتہ منقطع ہوگیا ہو جبکہ کوئی بھی افسانہ بیانیہ کے وصف سے آزاد نہیں ہوسکتا۔

دراصل بیانیہ اور تکنیک کے درمیان فرق کو نہ سمجھنے کی صورت میں اس طرح کا کنفیوژن پیدا ہوتا ہے۔ جس طرح ایک ماہر مصور اپنے ذہن میں منعکس بلو پرنٹ کے پیش نظر چند رنگوں کی مدد سے مصوری کرتا ہے اسی طرح ایک تخلیقی فنکار کسی مجرد خیال کو لفظی پیراہن عطا کرنے سے قبل ذہنی طور پر کسی ہیئت کے تشکیلی عناصر سے اپنے تخلیقی شعور کو ہمرشتہ کرتا ہے۔ ایسی صورتحال میں وہ جن تکنیکی عناصر سے مدد لیتا ہے ان میں پلاٹ، واقعہ، مکالمہ، منظر نگاری کے علاوہ طرز احساس کلیدی اہمیت کے حامل ہیں۔ ہیئت کی روشنی میں فن پارے کی شکل منور ہوتی ہے نیز ہیئتی بنیاد پر شعری و نثری تفریق کا احساس قائم ہوتا ہے۔ بیانیہ محض فکشن سے مختص نہیں، شعری انصاف سے بھی سروکار رکھتا ہے۔ جس شعر میں کسی وقوعے کی نشاندہی کی جاتی ہے، بیانیہ ازخود اس کے ساتھ ہولیتا ہے۔ شعر، نظم اور مثنوی، تینوں اصناف اس قضایا سے مشروط ہیں۔ بیانیہ کی تشکیل میں حکایت اور طرز احساس اہم عناصر ہیں۔ حکایت کی مرغوب غذا وقوعے ہیں، وقوعوں کا سلسلہ خواہ کتنا ہی دراز کیوں نہ ہو، نامیاتی ربط کا لحاظ ضروری ہے۔ نامیاتی ربط کا احساس فنکار سے زیادہ قاری کو ہوتا ہے۔ کسی کھیل کا اچھا پارکھ کھلاڑی کے بجائے تماشائی ہوتا ہے۔ نامیاتی ربط پر گرفت کمزور ہونے کی بنا پر ہی پریم چند اور کرشن چندر کے 70 فیصد افسانے اپنی فنکارانہ اہمیت کھو بیٹھے، ان حقائق کا احساس فنکار کے بجائے قاری کو ہوا۔ مذکورہ مباحث کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ بیانیہ کسی حکایت، کسی طرز احساس کے اظہار کا وسیلہ ہے نیز نامیاتی ربط اس کا جوہر خاص ہے۔

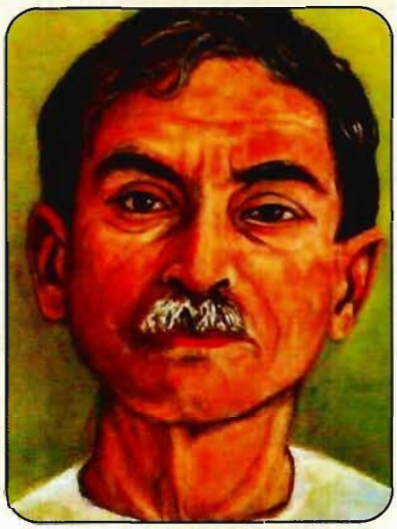

کرشن چندر کمیٹیڈ فنکار تھے۔ انسان دوستی، امن پسندی، حقیقت پسندی، کرشن چندر کے خاص موضوعات ہیں۔ لیکن افسانے کے بیانیہ کی تشکیل و تعمیر میں انھوں نے زیادہ تجربے کیے۔ ان کی بعض کہانیوں کا پیرایہ بیان آنے والی نسل کے لیے مشعل راہ بھی ثابت ہوا۔ مثلاً انھوں نے کردار کی قلب مائیت کی۔ ان کے افسانوں میں کہیں، غالیچہ، کردار کی صورت میں ظاہر ہوا تو کہیں 'دو فرلانگ لمبی سڑک' اور کہیں 'پشاور ایکسپریس'۔ تخلیقی طور پر یہ افسانے نئے ذائقے کا احساس ضرور دلاتے ہیں۔ ان سے قبل اردو افسانے میں سڑک، ریل گاڑی اور غالیچہ جیسے ذی روح عناصر کردار کی صورت میں کمیاب تھے۔

پریم چند وہ پہلے تخلیقی فنکار ہیں جنھوں نے افسانے کا ایک مخصوص پیرایۂ بیان وضع کیا۔ بیانیہ کے اجزاء ترکیبی کے طور پر انھوں نے پلاٹ، واقعہ، کردار، مکالمہ اور منظر نگاری کو ناگریز تصور کیا۔ افسانے کے ارتقائی سفر میں یہ محسوس کیا گیا کہ پریم چند کے افسانوں کے بیانیہ کی چولیں ڈھیلی ہیں جس پر گہری نظر منٹو نے ڈالی۔ پریم چند اور کرشن چندر کے افسانوں کا بیانیہ ہر وہ لباس زیب تن کرلیتا ہے جس کی تراش خراش اور فٹنس پر توجہ نہیں دی گئی ہو جبکہ منٹو کا بیانیہ نہ صرف ہیئت بلکہ گٹھا ہوا نظر آتا ہے۔ تاہم ایک منفرد اسلوب کا شناخت نامہ ہے کار لائل کا خیال ہے کہ اسلوب کسی ادیب کا کوٹ نہیں کہ جب چاہا اتار دیا، جب چاہا پہن لیا بلکہ یہ انسان کی جلد سے مشابہ ہے۔

کرشن چندر نے فکری سطح پر ایک ہی افسانے کو بار بار تخلیق کیا۔ وہ کمیٹیڈ فنکار تھے۔ انسان دوستی، امن پسندی، حقیقت پسندی، کرشن چندر کے خاص موضوعات ہیں۔ لیکن افسانے کے بیانیہ کی تشکیل و تعمیر میں انھوں نے زیادہ تجربے کیے۔ ان کی بعض کہانیوں کا پیرایہ بیان آنے والی نسل کے لیے مشعل راہ بھی ثابت ہوا۔ مثلاً انھوں نے کردار کی قلب مائیت کی۔ ان کے افسانوں میں کہیں، غالیچہ، کردار کی صورت میں ظاہر ہوا تو کہیں 'دو فرلانگ لمبی سڑک' اور کہیں 'پشاور ایکسپریس'۔ کرشن چندر کے تجرباتی افسانے گرچہ فن کا اعلیٰ نمونہ ثابت نہیں ہوئے لیکن تخلیقی طور پر یہ افسانے نئے ذائقے کا احساس ضرور دلاتے ہیں۔ ان سے قبل اردو افسانے میں سڑک، ریل گاڑی اور غالیچہ جیسے ذی روح عناصر کردار کی صورت میں کمیاب تھے۔

'آنندی' غلام عباس کا معروف افسانہ ہے۔ کرشن

چندر نے جس تکنیک کو فروغ دیا اسی تکنیک کا استعمال کرتے ہوئے غلام عباس نے افسانہ 'آنندی' میں شہر کو بطور کردار پیش کیا۔ افسانہ 'آنندی' بازار حسن کی تصویر کشی پر مبنی نہیں بلکہ فنکار نے 20 سالوں پر مشتمل ایک نئے شہر کے قیام اور اس کی آبادکاری کو رستے بستے دکھایا ہے۔

بیانیہ کی تشکیل عناصر میں مزید اضافہ حسن عسکری، احمد علی اور عزیز احمد نے کیا۔ عسکری کا 'حرامزادی'، چیخوف کے افسانہ 'اسکول مسٹریس' کی طرز پر تخلیق کیا گیا ہے جس میں شعور کی رو کی تکنیک سے مدد لی گئی ہے۔ عسکری نے چیخوف کے ایک اور افسانہ 'اسٹیپ' سے متاثر ہو کر افسانہ 'چائے کی پیالی' تخلیق کی۔ ان دونوں افسانوں میں ہیئتی تجربے کیے گئے ہیں۔ احمد علی اور عسکری سے قبل اردو افسانے کا طرز اظہار راست بیانیہ سے مملو تھا جبکہ مذکورہ افسانہ نگاروں نے تخلیقی سطح پر خیال کے آزاد تلازمے (Free Association of though) کو فنکارانہ طور پر پیش کیا۔

اردو افسانے کے ارتقائی سفر میں 'انگارے' کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس مجموعے میں 10 کہانیاں شامل ہیں لیکن یہ کہانیاں روایتی طرز اظہار سے مماثل نہیں، فنکارانہ سطح پر ان افسانوں کا اہم مقام نہیں لیکن مجموعے میں شامل احمد علی اور سجاد ظہیر کے افسانوں کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ افسانے کا بیانیہ ایک نئے مدار میں داخل ہونے پر آمادہ ہے۔ سجاد ظہیر اور احمد علی نے افسانے سے پلاٹ کو منہدم کرنے کی سعی کی لیکن کردار اور وقوعے کی نفی نہیں کی۔ انھوں نے شعور کی رو کی تکنیک کی مدد سے افسانے کو تخلیقی طور پر ایک نئے ذائقے سے روشناس کرایا۔ اس تناظر میں احمد علی کے افسانہ ''بادل نہیں آنے'' کا درج ذیل اقتباس ملاحظہ کریں:

''عورت کمبخت ماری بھی کیا جان ہے۔ چھڑی سے بدتر، کام کرے، کاج کرے، سینا پرونا، کھانا پکانا، صبح سے رات تک جلے پاؤں بلی کی طرح ادھر پھرنا ادھر پھرنا۔ اور اس پر طرہ یہ کہ بچے جنا جی چاہے یا نہ چاہے۔ جب میاں مولے کا جی چاہا، ہاتھ پکڑ کے کھینچ لیا۔ ادھر آؤ میری جان، میری پیاری، تمھارے نخرے میں گرم مصالحہ، دیکھو تو کمرہ میں کیسی ٹھنڈک ہے..... ورے آؤ، ہٹو پرے، تم پر ہر وقت کمبخت شیطان ہی سوار رہتا ہے نہ دیکھو دن نہ رات، ہائے۔ مار ڈالو، کٹاری مارو نا، ہاتھ نگوڑا مروڑ ڈالا، توڑ ڈالا، کہاں بھاگی جاتی ہو؟ سینے سے چمٹ کر لیٹ جاؤ! دیکھ کٹاری کا مزہ چکھ لو۔ وہ ہی موے دودھوں پر ہاتھ چل پڑے۔ سخت سخت انگلیوں سے مسل ڈالا، وسل

ڈالا، کمبخت نے گھنڈی کو کس زور سے دبایا کہ ہل بھی نہ سکی۔ مواجوانا مرے، کوٹھے والیوں کے ساتھ بھی کوئی ایسا برتاؤ نہ کرتا ہوگا۔''

درج بالا اقتباس میں روایتی طرز اظہار سے ایک نوع کا انحراف کیا گیا ہے۔ راست بیانیہ، ماجرا سازی اور پلاٹ سے ہٹ کر احمد علی نے شعور کی رو کی تکنیک کی مدد سے ایک عورت کے شب و روز کی مصروفیات کا فنکارانہ اور تخلیقی اظہار کیا ہے۔ انگارے کے دیگر افسانوں کے مزاج و منہاج اور اسلوب نگارش، ماقبل افسانوں کے بیانیہ سے مختلف نظر آتے ہیں۔

عزیز احمد نے انگریزی ادب کے اثرات کو قبول کرتے ہوئے اپنے تخلیقی شعور کو اساطیر سے ہم آہنگ کیا ہے۔ عاشق اور معشوق کے رابطوں میں آئی کشمکش، وقت کی آندھی کے زیر اثر عورت مرد کے رشتوں کا بکھراؤ، مغربی و مشرقی تہذیب و ثقافت میں تفاوت جیسے موضوعات کے تحت عزیز احمد نے افسانے تخلیق کیے۔ لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کے افسانوں کا بیانیہ روایتی طرز اظہار سے مماثل ہے، بلکہ انھوں نے 'زریں تاج'، 'مدن سینا اور صدیاں'، 'تصور شیخ' جیسے افسانے تخلیق کرکے جہاں قرۃ العین حیدر کے تخلیقی عمل کے آتش کدے کو مہمیز لگایا وہیں انتظار حسین کے ذریعے تخلیق کردہ اساطیری چراغوں کو روشن کرنے کے لئے روغن فراہم کیا۔ حالانکہ عزیز احمد کے افسانوں میں جنسی ٹریٹمنٹ پر زور زیادہ ہے جبکہ قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین نے مذکورہ ٹریٹمنٹ سے اجتناب برتا۔ ان فنکاروں نے لاشعوری طور پر عزیز احمد کی تحریروں سے اثرات قبول کرتے ہوئے اپنی انفرادیت قائم کی۔ موضوع کی سطح پر عزیز احمد کا دائرہ محدود ہے جبکہ قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین کے افکار و خیالات کی سرحدیں لامحدود ہیں نیز انھوں نے متعدد تکنیکی تجربات کیے جن سے ان کا انفراد قائم ہوتا ہے۔

احمد علی اور حسن عسکری نے افسانے کے بیانیہ کو لاماجرائی صفت سے مملو کیا۔ بعد میں کرشن چندر نے افسانہ ''مردہ سمندر'' اور منٹو نے 'پھندنے' تخلیق کیا۔ یہ کہانیاں بھی لاماجرائی وصف سے مامور ہیں نیز علامتی طرز اظہار کا مظہر۔ افتخار جالب نے افسانہ 'پھندنے' کو نئی لسانی تشکیل کا نمونہ قرار دیا۔ بعض ناقدین نے اسے جدیدیت کا پیش رو افسانہ بھی کہا ہے لیکن اس خیال کی حمایت نہیں کی جاسکتی کیونکہ احمد علی، عزیز احمد، کرشن چندر اور حسن عسکری کے ساتھ ساتھ منٹو نے بھی بامعنی ہیئتی و تکنیکی تجربے کیے۔ ان تجربوں کے پیش نظر بیانیہ کی بنیادی ساخت (Basic Structure) تشبیہات و استعارات، علامت و اساطیر اور رمز و کنایہ جیسے نئے لوازمات کے تخلیقی استعمال کے باوصف افسانے کا بیانیہ گہری ساخت (Deep Structure) میں مبدل ہوا نیز افسانوں کے فکری و معنوی تناظر میں وسعت آئی۔

بیانیہ کی یہ گہری ساخت اس وقت بکھراؤ کا شکار ہوگئی جب 'جدیدیت' کی سرپھری آندھی چلی اس عہد میں اسلوب کی بازیافت کے پیش نظر افسانوں کا بیانیہ نئی ہیئتی تشکیلات سے متصادم نظر آتا ہے۔ بیانیہ کی سالمیت کو جن افسانہ نگاروں نے مجروح کیا ان میں انور سجاد اور بلراج

میز اشامل ہیں۔ اینٹی اسٹوری کے زیر اثر روایتی بیانیہ کے ساتھ ساتھ بیانیہ کی گہری ساخت کی سالمیت بھی شکست و ریخت سے دو چار نظر آتی ہے لیکن منتشر ساختیوں کے تحت نمو پذیر بیانیہ کا عبوری دور بہت جلد اختتام پذیر ہوگیا۔ جن افسانہ نگاروں نے انور سجاد اور بلراج مینرا کی تقلید کی، منھ کے بل گرے، انتظار حسین کی امت میں آئی نسل کے بیانیہ کی سالمیت کو از سر نو بحال کیا گیا، اس سلسلے کی اہم کڑی نیر مسعود ہیں جنھوں نے موضوع پر کم، بیانیہ کی تشکیل نو پر زیادہ زور دیا۔ داستان

> ساجد رشید نے افسانے کے بیانیہ کی تشکیل نو میں ایک نیا تجربہ کیا۔ انھوں نے افسانے کو کئی شقوں میں تقسیم کرتے ہوئے ہر شق کے لیے ایک عنوان تجویز کیا۔ یہ تجربہ داستانوں اور ناولوں سے ماخوذ ہے جسے افسانے میں برتنے کی کہیں کامیاب تو کہیں ناکام کوشش کی گئی۔ چونکہ نئے افسانہ نگاروں نے منظم پلاٹ کی پیروی کرنے سے انکار کیا ہے۔ لہٰذا کثیر موضوع کو بکھراؤ سے تحفظ فراہم کرانے کے لیے فنکاروں نے ذیلی عنوانات کا سہارا لیا ہے۔ ایسے افسانوں کی فکری و معنوی جہتیں یقیناً باہم آمیز نظر آتی ہیں لیکن بیانیہ کی ظاہری ساخت بکھراؤ کا شکار نظر آتی ہے۔ نیز تخلیقی بہاؤ کو ایک نوع کا صدمہ پہنچتا ہے۔

اور حکایت نے نیر مسعود کے ہاں آکر تخلیقی سطح پر نئے ملبوسات زیب تن کیے تاہم ان کے کرداروں نے عہد وسطیٰ کی وادیوں کی سیر کی۔ سیر کرتے ہوئے شاہ کو فقیر بنتے دیکھا، آفتاب سے ہمکلام عمارتوں کے کھنڈرات تو کہیں ملبے دیکھے، زرق برق ملبوسات پر منعکس تاریخی جبر کے نقوش دیکھے۔ نیر مسعود کی تصوراتی و تخیلاتی آنکھیں جس طرح عہد وسطیٰ میں اودھ کی تہذیبی دیوی کو تار تار ہوتے ہوئے دیکھتی ہیں اسی طرح قاری کو دکھاتی بھی ہیں نیز فنکار نے اپنے مشاہدات و تجربات کو پیش کرنے کے لیے طویل بیانیہ کو فروغ دیا۔

شمس الرحمٰن فاروقی کے افسانوں کا بیانیہ بھی 'طویل بیانیہ' سے عبارت ہے۔ فاروقی صاحب نے ایک کامیاب افسانے کی پہلی شرط 'افسانوی زبان' اور 'تخلیقی نثر' کو ٹھہرایا ہے۔ ان کے افسانوں کے مجموعے 'سوار اور دوسرے افسانے' میں شامل افسانے تخلیقی نثر اور افسانوی زبان کی عمدہ مثال ہیں۔ افسانوی زبان اور تخلیقی نثر کے علاوہ 'سوار' میں شامل افسانوں کی اہم خصوصیت 'حاضراتی بیانیہ' ہے۔ فنکار نے جہاں تاریخی شہر دلی اور شہر دلی کا جانشین شہر لکھنو کے عہد زریں کی بازیافت پر زور دیا ہے وہیں میر، مصحفی اور غالب کے ادوار حیات کو منور کرنے کی فنکارانہ سعی کی ہے۔ بیانیہ کی نبت کاری میں جہاں تاریخی حقائق سے تخیل کو ہم آمیز کیا گیا ہے وہیں منظر سازی کے بجائے جزئیات نگاری پر توجہ صرف کی گئی ہے۔ تاہم فنکار کی عمیق نگہی کا ثبوت یہ ہے کہ بیانیہ میں پیوست ہر وہ جز پیکر میں ڈھلتا ہوا محسوس ہوتا ہے جو عموماً قاری کی نگاہوں سے اوجھل رہتا ہے۔ بعض مقامات پر ثقیل الفاظ کے لغوی معنی (براکٹ میں) رقم کرنے سے تخلیقی بہاؤ متاثر ضرور ہوتا ہے لیکن فنکار کا نصب العین ایک، ایک عہد کی سچی تاریخ کو فنکارانہ طور پر منعکس کرنا ہے۔

سید محمد اشرف، خالد جاوید، مشرف عالم ذوقی اور صدیق عالم کے بیشتر افسانوں کا بیانیہ طویل بیانیہ کے زمرے میں آتا ہے۔ لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ ان افسانہ نگاروں کے افکار و خیالات میں کسی قسم کی مماثلت ہے۔ نیر مسعود اگر مسلمانوں کی گمشدہ، نایاب ماضی کی بازیافت پر اصرار کرتے ہیں تو سید محمد اشرف اخلاقی و ثقافتی قدروں کے زوال کا نوحہ خواں ہیں، مشرف عالم ذوقی اگر صارفی نظام کے تحت معاصر عہد کے سفاک پہلوؤں کو اجاگر کرنے پر قادر رہیں تو خالد جاوید انسان کے باطن میں شعلہ زار تندور پر چڑھی کڑھائی میں ابلتی آدمی کی ہڈیوں کو بے نقاب کرتے ہیں۔ اس کے برعکس صدیق عالم کا مسئلہ نہ ہندوستان ہے نہ پاکستان، تقسیم ہند ہے نہ ہی ہجرت، شہر دہلی ہے نہ ہی لکھنو، بلکہ وہ اپنے جنم بھومی سے وابستہ ہیں جس طرح ایک شیر خوار بچہ ماں کی چھاتی سے چپکا رہتا ہے۔ چارنک کے ذریعہ بسائے گئے شہر کلکتہ کی زبوں حالی کی تصویر کشی صدیق عالم کا اہم تخلیقی وصف ہے۔

ساجد رشید نے افسانے کے بیانیہ کی تشکیل نو میں ایک نیا تجربہ کیا۔ انھوں نے افسانے کو کئی شقوں میں تقسیم کرتے ہوئے ہر شق کے لیے ایک عنوان تجویز کیا۔ یہ تجربہ داستانوں اور ناولوں سے ماخوذ ہے جسے افسانے میں برتنے کی کہیں کامیاب تو کہیں ناکام کوشش کی گئی۔ چونکہ نئے افسانہ نگاروں نے منظم پلاٹ کی پیروی کرنے سے انکار کیا ہے۔ لہٰذا کثیر موضوع کو بکھراؤ سے تحفظ فراہم کرانے کے لیے فنکاروں نے ذیلی عنوانات کا سہارا لیا ہے۔ ایسے افسانوں کی فکری و معنوی جہتیں یقیناً باہم آمیز

خالد جاوید اور صدیق عالم نے مزید تجربہ کرتے ہوئے اپنے افسانوں کے عنوانات کے نیچے ادب عالیہ سے ماخوذ خیال پاروں کو چسپاں کیا ہے۔ ظاہر ہے مطالعے کے دوران قاری پیش کردہ خیال پاروں سے اجتناب نہیں برت سکتا۔ نتیجہ بھی ظاہر ہے، تخلیقی بہاؤ کی اسیری، افسانے کا مقدر ٹھہرتی ہے۔ افسانہ نگار اپنے مشاہدات و تجربات بیان کرنے کے بجائے پیش کردہ خیال پارے کی صراحت پر اصرار کرتا ہے۔ نیز قاری کو بھی پابہ زنجیر کردیتا ہے۔ قاری افسانے سے محصول افکار و خیالات کا انسلاک آزادانہ طور پر قائم کرنے کے بجائے مذکورہ خیال پارے کی روشنی میں کرتا ہے۔

داستانوں میں جن، پری، بھوت، پریت، چڑیل، پیڑ پودے، پھول پتے، ندی، پہاڑ اور جانور جیسے عناصر بھی شامل رہے ہیں۔ بعد میں حقیقت نگاری کے تحت تخلیق کردہ ناولوں اور افسانوں میں متذکرہ بعض عناصر سے پہلوتہی کی گئی ہے لیکن بعض عناصر فنی لوازمات میں اضافے کا سبب بھی بنے ہیں جن میں جانور کو خاص طور پر اہمیت دی گئی۔ جانور، انتظار حسین اور سید محمد اشرف کی شناخت کا اہم وسیلہ ہیں۔ لیکن ان سے قبل سید رفیق حسین نے 'آئینہ حیرت'، 'نیم کی نمکولی'، 'گڑھا نہیں بھرتا اور 'فنا' جیسے افسانوں کی تخلیق کی جن میں جانور نہ صرف تخلیقی سطح پر منظر عام پر آئے بلکہ بعد کے افسانوں میں علامت و تمثیل کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئے۔

مذکورہ پس منظر میں کہا جاسکتا ہے کہ پریم چند سے لے کر منٹو تک، تخلیق کیے گئے افسانوں کے بیانیہ میں کوئی انقلابی تبدیلی رونما نہیں ہوئی لیکن گزشتہ نصف صدی میں افسانہ نگاروں نے بیانیہ کی تبدیلی کی سطح پر متعدد تجربے کیے۔ شعور کی رو کی تکنیک کی مدد سے جہاں بیانیہ کو گہری ساخت (Deep Structure) میں مبدل کیا گیا وہیں داستان و حکایتی طرز اظہار کو تمثیل، متھ، اساطیر، کتھا، صوفیوں کے ملفوظات، رشیوں کے اشلوک کے علاوہ عصری حقائق سے ہمرشتہ کرتے ہوئے افسانے کے بیانیہ کو ایک نئے سانچے میں منقلب کرنے کی فنکارانہ سعی کی گئی ہے جسے بلا شبہ امتزاجی ساخت (Composite Structure) سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

Maqsood Danish
13/H/46, Mayur Bhanj Road, Khidirpur, Kolkata-23

عمیر منظر

شجاع خاور اور 'دوسرا شجر'

آزادی کے بعد شعر و ادب کے منظر نامے پر فکری اور فنی دونوں سطح پر نہ صرف بہت سی تبدیلیاں ہوئیں بلکہ ہیئت کے نئے تجربے بھی کیے گئے۔ جدیدیت نے نئے افکار و خیالات کو تقویت بخشی اور فنی تجربوں کے لیے مہمیز کا کام بھی کیا۔ اس تناظر میں جہاں نئی نظم کو فروغ ملا وہیں اسلوب بیان اور ہیئت کے نت نئے تجربے کیے گئے۔ اس ضمن میں طویل نظموں کا سلسلہ شروع ہوا۔ ان طویل نظموں میں تجربے اور طریقۂ اظہار دونوں میں نیا پن ہے۔ 1960 کے بعد طویل نظم نگاروں کی فہرست میں عمیق حنفی، کمار پاشی، شجاع خاور اور زبیر رضوی کا نام خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔

شجاع خاور کی وفات (21 جنوری 2012) کو دو سال ہو چکے ہیں۔ 'دوسرا شجر' شجاع الدین ساجد/شجاع خاور (1948-2012) کی اولین تخلیقی کاوش ہے۔ یہ ایک طویل رزمیہ ہے جس کا اسلوب فارسی آمیز ہے نیز اس نظم پر اقبال کے اثرات بھی محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ خدا سے مکالمہ اردو کی شعری روایت میں کوئی نئی چیز نہیں، میر، غالب اور اقبال کے یہاں تو پوری قوت کے ساتھ خدا سے مکالمہ ہے۔ یہ مکالمہ کہیں اپنی بے بسی کا اظہار ہے تو کہیں اس وسیع و عریض کائنات میں انسان کی حیثیت کے بیان پر مشتمل ہے۔ انسان کا وجود کیا معنی رکھتا ہے اس احساس نے فن کاروں کو خدا سے مکالمہ کے لیے مہمیز کیا۔ ان مکالموں میں فکر اور فن کاری دونوں کے بہت عمدہ نمونے موجود ہے۔ البتہ ن م راشد، میراجی اور جوش ملیح آبادی بسا اوقات اس سطح سے بہت نیچے آ گئے اور مکالمہ کے بجائے ان کے یہاں اظہار کی وہ سطح در آئی جس سے انکار اور عام انسانوں جیسے برتاؤ کا معاملہ نظر آنے لگا۔ شجاع خاور کی یہ نظم گرچہ انہی حوالوں سے ترتیب پاتی ہے لیکن انہوں نے فن اور بیان کی ایک خاص سطح قائم رکھنے کی ضرور کوشش کی ہے۔ ماضی، تہذیبی اور مذہبی اسطور اور داستانوی کرداروں سے طویل نظم نے زندگی کے بہت سے پہلو حاصل کیے ہیں اور یہی ان کا بنیادی محرک رہا ہے لیکن اس کے باوجود فن کار کا اپنا آپ بھی ان نظموں میں شامل ہے۔ اسی چیز نے ان نظموں کو تخلیقی وقار عطا کیا ہے۔

شجاع خاور کی طویل رزمیہ نظم 'دوسرا شجر' 644 مصرعوں پر مشتمل ہے جس میں نظم کی تینوں ہیئتوں کا استعمال کیا گیا ہے۔ یہ نظم دراصل انسان کی بے چارگی اور حرماں نصیبی کی داستان بھی کہی جا سکتی ہے۔ کیونکہ نظم جن بنیادوں پر قائم ہے اور خدا سے جس طرح کلام کیا جا رہا ہے اس کا لازمی نتیجہ محرومی اور محزونی ہی ہے۔ نظم میں آدم اور خالق کائنات کا مکالمہ فنی قدر و قیمت کے ساتھ ادا کیا گیا ہے۔ نظم کا آغاز زوال آدم کے واقعہ سے ہوتا ہے۔ لیکن فن کار نے اسے زوال کا نام نہیں دیا ہے بلکہ اسے تخلیق کی ایک دوسری دنیا سے تعبیر کیا ہے جہاں خود انسان اس مثالی دنیا اور اس کی جنت تعمیر کرے گا:

آگہی وہ مری قلوپطرہ
کبھی جس کے درشبستاں سے
میں نے پردہ اٹھا کے دیکھا تھا
اور میرے خدا نے جنت سے
مجھے باہر نکال پھینکا تھا
میری معصومیت کی یہ لغزش
سرکشی کا گناہ ہو جیسے

یہ وضاحت ضروری ہے کہ زوال آدم دانۂ گندم کھانے کی وجہ سے ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں کو منع کیا تھا مگر شیطان نے انھیں بہکا دیا اور آدم و حوا غلطی کر بیٹھے مگر فوراً ہی اس کا احساس ہوا اور وہ خدا سے معافی مانگنے لگے۔ قرآن میں اس واقعہ کا ذکر اس طرح ہے:

''اور ہم نے کہہ دیا کہ اے آدم! تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو اور جہاں کہیں سے چاہو بافراغت کھاؤ پیو، لیکن اس درخت کے قریب بھی نہ جانا ورنہ ظالم ہو جاؤ گے لیکن شیطان نے ان کو بہکا کر وہاں سے نکلوا ہی دیا اور ہم نے کہہ دیا کہ اتر جاؤ۔ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اور ایک وقت مقرر تک تمھارے لیے زمین میں ٹھہرنا اور فائدہ اٹھانا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے رب سے چند باتیں سیکھ لیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی۔ بے شک وہی توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔'' (البقرۃ: 37-35)

لیکن اس نظم کا مرکزی خیال اسلامی عقیدے کے بجائے مسیحی روایت سے مستعار ہے۔ انجیل میں اس درخت کو شجر آگہی قرار دیا گیا ہے اور اسی مسیحی روایت کو شجاع خاور نے نظم کا بنیادی خیال بنایا اور اسی لیے وہ غم نہیں کرتا بلکہ امکانات کی بشارت دیتا ہے۔ وہ جنت سے نکالے جانے کا ماتم نہیں کرتا بلکہ خود ایک بہشت کی تعمیر کا خواب دیکھتا ہے:

جنت گم شدہ کا غم کیوں ہو
میں نے بھی اک بہشت ڈھالی ہے
خواب زاروں کی بات کیا معنی
میری جنت ہے چشم وا کی طرح (30 تا 33)

اسے وہ اپنی فتح مندی کا نشان تصور کرتا ہے کیونکہ اس کے نزدیک دونوں جنت ہی ہیں بس فرق فاصلے کا ہے۔ یہ لغزش جس نے اسے جنت سے نکلنے پر مجبور کیا اس کے نزدیک قابل تعریف ہے۔ داستانوی کردار قلوپطرہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ صبح کو اپنے ہم بستر کو قتل کروا دیتی تھی۔ یہاں انسان کے لیے آگہی کی خاطر قلوپطرہ کی رفاقت کو تسبیح کا رنگ دیا گیا ہے۔

نظم کا دوسرا حصہ خدا اور بندے کے درمیان خود کلامی کو پیش کر رہا ہے۔ آدمی کے دعووں کو بیان کرتا ہے۔ اس میں غصہ اور حقارت ہے۔ یعنی (آدمی) ہر قید سے آزاد ہونا چاہتا ہے:

ہر قید سے/ ہر روایت سے/ قید زماں سے
حدود و مکاں سے/ ہر اک خوف سے
ہر عقیدے سے/ اور خود ہمارے تصور سے

پھر خدا کہتا ہے کہ ہماری خدائی کو ہرگز یہ گوارا نہیں ہے

کیونکہ آدمی تو ہمارا بنایا ہوا ہے۔ پھر خدا کہتا ہے:

ہم کبھی بھول سکتے نہیں
آدمی جو ہمارا گنہگار ہے
ایک مجرم تھا یہ
ہم نے اپنی خود آثار قدرت کے گنج گراں مایہ
پھر بھی دیے تھے اسے
آج خود اک بہشت کبیر اس نے تعمیر کر لی ہے
کیا یہ بہشت کبیر اس کا زنداں نہیں؟

انسان آگہی کے ہم آغوش ہونے پر جس قدر فخر کر رہا ہے یہی اس کی تباہی کا سبب بھی بنے گی یعنی یہ آگہی جرم بھی ہے اور جرم کی تعزیر بھی ہے۔(267)

نظم کے اگلے حصے میں انسان کی خود کلامی کو ایک بار پھر دکھایا گیا ہے۔ یہاں اجتماعیت کی مختلف شکلیں ہیں۔ انسانی ترقیات اور علوم کی فراوانی نے اک نئی دنیا دریافت کی ہے جہاں اس نے سمندروں کو تسخیر کیا، پہاڑوں کے جگر کاٹ چکا ہے اور اب اسے یہ احساس ہو چلا ہے کہ میں کتنا قوی، کتنا ذکی اور کتنا بڑا ہوں لیکن ایک مرحلے پر یہی چیزیں اس کی تباہی کا سبب بھی بنتی ہیں۔ البتہ یہاں فن کار نے جو تصویر پیش کی ہے وہ کسی ایک زمانے یا عہد کی نہیں بلکہ اس میں تاریخ کا پورا تسلسل ہے۔ انسانی ترقی اور اس کی تمدنی تاریخ کا اجتماعی احساس ان مصرعوں میں ظاہر ہوا ہے۔ وہ اپنی بنائی ہوئی صلیبوں سے مصلوب ہوا اور پہاڑوں میں جوئے شیر لانے والا تیشہ بھی اسے غارت کرتا ہے۔ یہی خود اعتمادی انسان کو آگے چل کر نہ صرف بغاوت اور سرکشی کا سبب بنتی ہے بلکہ وہ یہ بھی کہتا ہے:

میں اپنی پرستش کا خدا ڈھونڈ رہا ہوں
میں اپنا خدا اپنا خدا اپنا خدا ہوں

(467)

اس کے بعد خدا کی دوبارہ خود کلامی شروع ہوتی ہے۔ اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

نہیں نہیں میں خدائے کل ہوں
نہیں کسی نے مری خدائی کی تمکنت کو
نزار و نالاں
نہیں کیا ہے
کسی نے بھی شرمسار اب تک نہیں کیا ہے

اس خود کلامی میں یہ واضح اشارہ موجود ہے کہ آدمی کی یہ ترقی اس کی تباہی کا سبب بنے گی۔ بہشت اوّلین سے تو صرف انسان کو نکالا گیا تھا مگر زمین پر اس کے اعمال کے سبب اسے جنت ارضی نہ صرف چھوڑنی پڑے گی بلکہ یہاں کا سب کچھ تباہ و برباد ہو جائے گا:

بس اب وہی لمحہ آ رہا ہے
کہ رفعتوں کا ہی پیر پھسلے
اسی بلندی کے نقطۂ ارتفاع سے
آدمی گرے اور اپنے ملبے میں دب کے رہ جائے

——

یہی گھڑی ہے
کہ آدمی کے قد آور اثبات کی نفی ہو
کہ اس کا سویا ہوا تلون بھی جاگ جائے
یہی گھڑی ہے
کہ ہم زمیں کی ادھوری جنت کو
حسن تکمیل سے نوازیں
بلندیوں کا یہ نقطۂ ارتفاع خود
اس ادھوری جنت کا شجر ممنوعہ بن کے رہ جائے

(548 تا 541)

نظم کے مختلف مراحل میں ایک مرحلہ وہ بھی آتا ہے جب انسان علم و سائنس اور مدنی تمدن کے عروج کو شجر آگہی کے سرخ پھولوں کا سبب سمجھتا ہے مگر اندیشہ شجر آگہی کے ان کالے پھلوں کا ہے جسے اگر چکھ لیا تو جنت ارضی برباد ہو جائے گی۔ سرخ پھول کو ایٹمی دریافت کہا جا سکتا ہے مگر کالا پھل ایٹمی توانائی کا منفی استعمال ہے جس کا انجام تباہی کے سوا کچھ نہیں۔ انسان کی تخریب کاری ہی بہشت سے نکلنے کا سبب بنی تھی جس کے کچھ کچھ اندیشے جنت ارضی میں بھی ظاہر ہونے لگے ہیں۔ البتہ انسانی جبلت کی تلون مزاجی اسے کبھی ایک حال پر قائم نہیں رکھتی، نئے نئے تجربے اور اس سے حاصل ہونے والی مسرت رنج انسانی خمیر کا ناگزیر حصہ ہیں اسی لیے جنت ارضی کی مستقل آسائش اور دنیاوی ترقی جو کہ اس کے معمول کا حصہ بن گئی تھی وہ اس کیفیت سے نکلنے کا خواہش مند نظر آتا ہے۔ اسی لیے وہ اس عارضی ابدیت کو بدلنے کا خواہاں نظر آتا ہے اور اسے اک شکل مختلف کی تلاش ہے:

وہ اس بہشت کی تخریب کے دھماکے ہوں
کہ اُس زمین کی ناداریوں کے ویرانے
کسی بھی طور کوئی شکل مختلف تو ملے

(624 تا 622)

نظم کا اختتام مایوس کن ہے۔ آدمی کی خود کلامی کا یہ آخری حصہ اضطراب اور بے چینی کا اظہار ہے۔ اس نے جس آزادی اور جوش کے ساتھ آغاز کیا تھا اختتام ایک ایسی منزل کی نشاندہی کر رہی ہے جس میں حیرانی اور تذبذب کا عنصر نمایاں ہے۔ انسان کی فعالیت اور اس کا جنون یہاں عنقا ہے۔ وہ جس تبدیلی کا خواہش مند تھا وہ پوری نہ ہو سکی اور آدمی ابھی تک ایٹمی توانائی کی تباہی کے درمیان گھرا ہوا ہے۔ نظم کا آخری مصرعہ ہیں:

خیال گاہ مقدس میں
یہ ایک چھوٹا خیال
یہ ایک خدشۂ ناپاک و ناخلف
کہاں سے آیا یہ منحوس وسوسہ
کہ اس سجی ہوئی جنت کے خون سے آگے
وہاں — ادھر
کسی شے کا اگر
نشان ہی نہ ملا
نئی زمین نئی دنیا اگر ملی ہی نہیں!

شجاع خاور کی اس نظم کی جہاں پذیرائی ہوئی وہیں اس پر سوال بھی قائم ہوئے۔ نظم کے مطالعے سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اس میں مکالمہ کے بجائے مقابلے کی نوعیت در آئی ہے۔ نظم میں مختلف ہیئتوں اور بحور کا استعمال ضرور کیا گیا ہے مگر مجموعی طور پر اس سے نظم کو بہت زیادہ تقویت نہیں ملتی۔ بقول انور صدیقی:

''نظم دوسرا شجر میں مختلف بندوں میں مختلف بحریں استعمال کی گئی ہیں۔ یہ تکنیک کچھ زیادہ نئی نہیں ہے۔ اس سے پہلے بھی بہت سے شاعر کامیابی کے ساتھ اسے برت چکے ہیں۔ یہ تکنیک اس وقت اور بھی کارگر ہو جاتی جب بحر کی ان تبدیلیوں کا مطالبہ جذبے کی لہروں میں تبدیل کرتی۔'' (دوسرا شجر، ص30)

دوسرا شجر پر تبصرہ کرتے ہوئے شمس الرحمٰن فاروقی نے لکھا تھا کہ ''اس شاعری میں ظاہری طمطراق ہے۔''

(شب خون اگست 1972، ص45)

جب کہ محمد حسن نے لکھا تھا کہ ''اس میں کسی حد تک شکوہ جواب شکوہ کا اندازہ پایا جاتا ہے۔''

شجاع خاور کی یہ پہلی تخلیق ہے۔ انھیں اس سے جذباتی لگاؤ بھی تھا مگر ان کا یہ شعری تجربہ ان کی آئندہ تخلیقی زندگی کو راس نہیں آیا بلکہ اس تجربے کی نوعیت صرف تجربے تک ہی محدود رہی۔ فن کار خود اپنے تجربے سے بہت کچھ سیکھتا اور فائدہ اٹھاتا ہے مگر شجاع خاور کی تخلیقی زندگی میں 'دوسرا شجر' ماضی کا حصہ بن کر رہ گیا۔ انھوں نے غزلوں میں آزادانہ روی اور بے تکلف پن کے جس سلسلے کی بنیاد ڈالی ہے۔ 'دوسرا شجر' کو پڑھنے والا مشکل سے ہی یقین کرے گا کہ یہ بھی شجاع خاور کی تخلیقی زندگی کا حصہ ہے۔

Dr. Omair Manzar, Asst. Prof. Dept of Urdu, Maulana Azad National Urdu University,

منیر حسین حرہ

اردو نعت گوئی اور غیر مسلم شعرا

مضمون کا آغاز اس شعر سے کرتا ہوں:

کچھ عشق پیغمبر میں نہیں شرط مسلماں
ہیں کوثری ہندو بھی طلبگار محمدؐ

تاریخ گواہ ہے کہ دنیا میں جہاں جہاں حضرت رسول اکرمؐ کی سیرت و کردار کی ضیاپاشیاں ہوئیں وہاں وہاں ہر مذہب اور ہر زبان سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے دل منور ہوئے۔ اور ہر ایک نے رسول اکرمؐ کی تعریف و توصیف کی اور تمام تہذیبوں اور زبان وادب میں صنف نعت کے فصیح و بلیغ نمونے تاریخ کے سامنے پیش کیے بلکہ انقلابات کائنات کے لیے نعت و منقبت کامیابی کا ایک ذریعہ رہے ہیں۔

ہندوستان میں جب اسلام کا ظہور ہوا تو عرب و عجم اور دیگر ممالک سے آئے بزرگان دین نے توحید اور رسالت کی جو تبلیغ کی اور حضرت رسول اکرمؐ کی تعلیمات کا جو درس دیا وہ انھوں نے شعر و سخن کی صورت میں بھی دیا ہے۔ اس طرح جب ہم ہندوستان کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو یہاں کی تمام زبانوں اور بولیوں میں بزرگان دین کی اخلاقی اور روحانی شاعری کا بیش قیمت ذخیرہ موجود ہے۔

جہاں مسلمانوں نے رسول اکرمؐ کی بارگاہ میں گلہائے عقیدت نچھاور کیے وہیں غیر مسلم شعرا نے بھی بغیر تفریق شان رسول بیان کی۔ فارسی ادب سے اردو میں جتنی بھی اصناف شامل ہوئی ہیں۔ ان تمام اصناف میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ غیر مسلم شعرا نے بھی داد سخن وری دے کر اردو شاعری کو مالا مال کر دیا۔ ان اصناف میں غیر مسلم شعرا نے زیادہ تر حمد، نعت، منقبت، کربلائی مرثیہ میں اپنی عقیدت کا ثبوت پیش کیا۔ نعت ایک مخصوص صنف سخن ہے۔ اس کی کوئی شعری ہیئت مقرر نہیں ہے بلکہ کسی بھی ہیئت میں لکھی جاسکتی ہے۔ یعنی جب ہم نعت کی تعریف کرتے ہیں تو یوں کہتے ہیں کہ وہ نظم جو رسول اکرمؐ کی تعریف میں کہی جائے نعت کہلاتی ہے۔

اردو شاعری میں نعت رسول بیان کرنا ایک محبوب اور روحانی مسرت حاصل کرنے کا موضوع رہا ہے۔ کسی ایک مذہب میں نہیں بلکہ جب ہم اردو شاعری کا جائزہ لیتے ہیں تو اس صنف میں غیر مسلم شعرا کی تعداد کہیں زیادہ ہی نظر آتی ہے جو رسول کو اپنا مانتے ہیں اور بارگاہ رسول میں سرخم کر کے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اردو میں غیر مسلم شعرا کی نعت گوئی کا آغاز بدھ سنگھ قلندر سے ہوتا ہے۔ جو شمالی ہند میں ولی اورنگ آبادی سے پہلے تھا۔ مختلف تذکرہ نگاروں نے اپنے تذکروں میں ایسے غیر مسلم شعرا کا ذکر کیا جنھوں نے نعت کہی ہے۔ آج جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو ہندوستان کے نسبت پاکستان میں نعت گوئی پر زیادہ کام ہوا ہے۔ غیر مسلم شعرا جو نعت گوئی میں اہم ہیں ان میں کشن پرشاد مجروح، گردھاری لال طرز، شہو سنگھ ظہور، کبیر، تلسی داس، رحیم، لچھمی، نرائن شفیق، مہاراجہ کشن پرشاد شاد، دلورام کوثری، بالمکند عرش ملسیانی، ہری چند اختر، ہرگوپال تفتہ، منشی شنکر لال ساقی، قیس جالندھری، پنڈت رام پرتاب، رشی پٹیالوی، درگا سہائے سرور جہان آبادی، تلوک چند محروم، برج نرائن چکبست، دیا شنکر نسیم، ہری کشن کشور شرما، فراق گورکھپوری، جگن ناتھ آزاد، کالی داس گپتا رضا، رویندر جین، رگھو ہندو راؤ جذب، راجیشور راؤ اصغر، منوہر لال بہار، بہاری لال رمز، جگدیش، مہتہ درد، رتن ناتھ سرشار، نند کشور یکتا، بہاری لال صبا، چندن ٹونکی، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

آج کی اگر بات کریں تو دور حاضر میں بھی اردو کے غیر مسلم شعرا نعت و منقبت کہے بغیر آگے نہیں بڑھتے۔ یہی ایک ایسی صنف ہے جہاں غیر مسلم شاعر اپنی عقیدت سے مسلمان نظر آتا ہے اور انسان کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ مسلمان کا حق کیا ہے اور غیر مسلم کا کیا۔

برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی ایک باکمال شاعر گزرے ہیں۔ جو نعت رسولؐ کے بغیر اپنے تمام کلام کو ادھورا تصور کرتے ہیں۔ ایک نعت بطور نمونہ ملاحظہ ہو:

ہو شوق کیوں نہ نعت رسول دوسرا کا
مضموں ہو عیاں دل میں جو لولاک لما کا

تھی بعثت رسولؐ خداوند کو منظور
تھا پھل وہ بشارت کا نتیجہ تھا دیں کا
پہنچا ہے کسی اوج سعادت پہ جہاں کو
پھر رتبہ ہو کم عرش سے کیوں غارِ حرا کا
معراج ہو مومن کی نہ کیوں اس کی زیارت
ہے خلد بریں روضہ پرنور کا خاکا
دے علم و یقیں کو مرے رفعت شہ عالم
نام اونچا ہے جس طرح صفا اور حرا کا
یوں روشنی ایمان کی دے دل میں کہ جیسے
بطحا سے ہوا جلوہ فگن نور خدا کا
ہے حامی و ناصر جو مرا شافع عالم
کیفی مجھے اب خوف ہے کیا روز جزا کا

کبیر نے رسولؐ اکرم کی خدمت میں پیش بہا پھول برسائے ایک قطعہ ان کا مشہور ہے جس میں یہ کہا گیا کہ دنیا کے تمام الفاظ سے محمدؐ کا عدد 92 حاصل ہوتا ہے:

عدد نکا لو ہر چیز سے چو گن کر لو دا ئے
دو ملا کر پنچ گن کر لو بیس کا بھاگ لگائے
باقی بچے کو نو گن کر لو دو اس میں اود و ملا ئے
کہت کبیر سنو بھئی سا دھو نا م محمدؐ آ ئے

چودھری دلورام کوثری نعت گوئی میں ایک بہترین شاعر مانے جاتے ہیں جیسا کہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے انھیں بہترین نعت گو شاعر تسلیم کیا ہے۔ نمونے کے بطور ایک نعت ملاحظہ ہو:

عظیم الشان ہے شان محمدؐ
خدا ہے مرتبہ دان محمدؐ
کتب خانے کیے منسوخ سارے
کتاب حق ہے قرآن محمدؐ
شریعت اور طریقت اور حقیقت
یہ تینوں ہیں کنیزان محمدؐ
فرشتے بھی یہ کہتے ہیں کہ ہم ہیں
غلامان غلامان محمدؐ
نبیؐ کا نطق ہے نطق الٰہی
کلام حق ہے فرمان محمدؐ
ابوبکرؓ و عمرؓ، عثمانؓ و حیدرؓ
یہی ہیں چار یاران محمدؐ
علیؑ ان میں وصی مصطفیٰ ہے
علیؑ ہے رنگ بستان محمدؐ
علیؑ و فاطمہؑ شبیرؑ و شبیر
بسا ان سے گلستان محمدؐ
خدا کا نور ہے نور پیمبرؐ
خدا کی شان ہے نور محمدؐ
بتاؤ کوثری کیا شغل اپنا
میں ہوں ہر دم ثنا خواں محمدؐ

تلوک چند محروم بھی ایک قابل قدر شاعر تھے۔ انھوں نے بھی صنف نعت کے بغیر اپنے کو مکمل نہیں پایا۔ کئی نعتیں کہی ہیں۔ بطور نمونہ ایک شعر ملاحظہ ہو:

مبارک پیشوا جس کی شفقت دوست دشمن پر
مبارک پیش رو جس کا سینہ صاف کینے سے

قیس جالندھری نے حضور پاک کی خدمت میں عقیدت کے گل برسائے ہیں ایک شعر ملاحظہ ہو:

حیات سادہ کے اسباق دے کے عالم کو
تکلفات کے پردے اٹھا دیے تو نے

پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے بھی بہت سی نعتیں کہی ہیں:

سلام اس ذات اقدس پر سلام اس فخر دوراں پر
ہزاروں جس کے احسانات ہیں دنیائے امکاں پر
سلام اس پر جو آیا رحمۃ للعالمیں بن کر
پیام دوست بن کر صادق الوعد و امیں بن کر
سلام اس پر جلائی شمع عرفان جس نے سینوں میں
کیا حق کے لیے بے تاب سجدوں کو جبینوں میں
سلام اس پر بنایا جس نے دیوانوں کو فرزانہ
مئے حکمت کا چھلکا یا جہاں میں جس نے پیمانہ
بڑے چھوٹے میں جس نے اک اخوت کی بنا ڈالی
زمانے سے تمیز بندہ و آقا مٹا ڈالی
سلام اس پر فقیری میں نہاں تھی جس کی سلطانی
رہا زیر قدم جس کے شکوہ و فر خاقانی
سلام اس پر جو ہے آسودہ زیر گنبد خضرا
زمانہ آج بھی ہے جس کے در پر ناصیہ فرسا
سلام اس ذات اقدس پر حیات جاودانی کا
سلام آزاد کا آزاد کی رنگیں بیانی کا

مہاراجہ کشن پرشاد شاد راجہ ہری کرن کے فرزند اور راجا نریندر پرشاد، پیش کار کے نواسے تھے۔ راجا نریندر پرشاد کی کوئی اولاد نہ تھی۔ ان کے انتقال پر کشن پرشاد ہی ان کے جانشین اور وارث ہوئے۔ میر محبوب علی خان آصف سادس نے انھیں پیش کاری کی موروثی خدمت عطا کی۔ 1901 میں مدارالمہامی کے عہدے پر فائز کیے گئے۔ مہاراجہ اگرچہ ہندو تھے لیکن وہ تمام مذاہب کے بنیادی عقائد کو مانتے تھے۔ ان کی زندگی پر کسی خاص مذہب و مسلک کی چھاپ نہیں دکھائی دیتی تھی۔ وہ تمام مذاہب کو مقبول و محترم مانتے تھے۔ سر نظامت جنگ ریاست حیدرآباد کی یہ ایک ممتاز اور محترم شخصیت تھی۔ وہ ایک قابل قدر اڈمنسٹریٹر، ایک ممتاز دانشور، فلسفی، انگریزی اور اردو کے شاعر اور ادیب کی حیثیت سے بھی بڑی شہرت رکھتے تھے۔ انھوں نے نظم و نثر کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی۔ صنف نعت میں بھی حضور اکرمؐ کی شان میں اپنی عقیدت کا اظہار کیا:

کان عرب سے نعل نکل کر تاج بنا سرداروں کا
نام محمدؐ اپنا رکھ سلطان بنا سرداروں کا
باندھ کے سر پر سبز عمامہ کاندھے پہ رکھ کر کالی کملی
ساری خدائی اپنی کرلی، مختار بنا دلداروں کا
تیرا چرچا گھر گھر ہے، وہ جلوہ دل کے اندر ہے
ذکر ترا ہے لب پر جاری، دلدار بنا دلداروں کا
روپ ہے میرا رتی رتی، نور ہے تیرا پتی پتی
مہر و مہ کو تجھ سے رونق، نور بنا سیاروں کا
بوبکرؓ و عمرؓ عثمانؓ و علیؓ، چاروں تھے عناصر ملت کے
کثرت وحدت میں جیسے حال وہ تھا ان چاروں کا
کسب تجلی کرتے ہیں چاروں مہر نبوت سے
بخت رسا تھا برج شرف میں تیرے چاروں یاروں کا
بادۂ عرفاں ملتی ہے ساقی کے میخانے سے
شاد مقدر فضل خدا سے جاگا اب میخواروں کا

ایک دوسری نعت میں اس طرح کہا ہے:

لازم ہے مجھ کو نغمہ سنجی رکھتا ہے یہ آرزو بھی
ممدوح کی مدح لکھ رہا ہوں مداح حبیب مصطفیٰ ہوں
معراج میں حضور جو مدعوئے خدا تھے
خلوت تھی کوئی اور واں مہمان نہیں تھا
کافر نہ کہوں شاد کو ہے عارف و صوفی
شیدائے محمدؐ ہے وہ شیدائے مدینہ

جگدیش مہتہ درد کو بھی حضور اکرمؐ کے ساتھ بڑی عقیدت تھی۔ انھوں نے شان رسولؐ اس طرح بیان کی ہے:

یا شاہ عرب غم سے عجب حال ہوا ہے
مرنے میں ہے کچھ لطف نہ جینے میں مزا ہے
بے کل ہوں جدائی سے ہے بے تاب مری جاں
بے علم ہوں کیوں حال سے یہ رنج سوا ہے
پیدل ہی میں گھبرا کے چلا آؤں مدینہ
پر تاب و تواں مجھ میں کہاں ایسا رہا ہے
خادم ہوں میں آپ کا تاخیر یہ کیسی
للہ بتا دو مجھے کیا مری خطا ہے؟

چندر پرکاش جو ہر بجنوری کو حضرت سول اکرمؐ کے ساتھ کافی عقیدت ہے چند متفرق اشعار ملاحظہ فرمائیے:

میں کافر ہو کے بھی ایمان رکھتا ہوں محمدؐ پر
کوئی انداز تو دیکھے مری کافر ادائی کا

نہیں ذکر محمدؐ کے لیے تخصیص مذہب کی
یہ کس نے کہہ دیا آخر کہ مسلم کی زبان تک ہے
تخصیص کوئی مذہب و ملت کی نہیں ہے
اس رحمت عالم کی دعا سب کے لیے ہے

پنڈت ہری چند اختر نے رسول اکرمؐ کو انسانیت کا سب سے بڑا ہادی مانا ہے۔ انھوں نے بہت سی نعتیں کہی ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کس نے ذروں کو اٹھایا اور صحرا کردیا
کس نے قطروں کو ملایا اور دریا کردیا
آدمیت کا غرض ساماں مہیا کردیا
اک عرب نے آدمی کا بول بالا کردیا
زندہ ہوجاتے ہیں جو مرتے ہیں اس کے نام
اللہ اللہ موت کو کس نے مسیحا کردیا
کس کی حکمت نے یتیموں کو کیا دریتیم
اور غلاموں کو زمانے بھر کا مولا کردیا
سات پردوں میں چھپا بیٹھا تھا حسن کائنات
اب کسی نے اس کو عالم آشکار کردیا
کہہ دیا لاتقنطوا! اختر کسی نے کان میں
اور دل کو سربسر محو تمنا کردیا

پنڈت بالمکند عرش ملسیانی نے صنف نعت میں ایک الگ پہچان بنائی ہے۔ وہ ایک نعت گو شاعر نظر آتے ہیں۔ ان کی نعتوں کا مجموعہ 'آہنگ حجاز' شائع ہو چکا ہے۔ بطور نمونہ ایک شعر ملاحظہ ہو:

کہہ دل کا حال شاہ رسالت مآب سے
ہو بے نیاز ذکر عذاب و ثواب سے

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر رسول اکرمؐ کی محبت کو دل و روح کی تسکین سمجھتے ہیں اور اس محبت کو ہمیشہ کے لیے قائم رہنے کی خواہش میں چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہو:

تکمیل معرفت ہے محبت رسولؐ کی
ہے بندگی خدا کی اطاعت رسولؐ کی
اتنی سی آرزو ہے بس اے رب دوجہاں
دل میں رہے سحر کے محبت رسول کی
عشق ہوجائے کسی سے کوئی چارہ تو نہیں
صرف مسلمانوں کا محمدؐ پہ اجارہ تو نہیں

فراق نے جو نعتیں کہی ہیں ان میں ایک نعت سے یہ شعر ملاحظہ ہوں:

معلوم ہے تم کو کچھ محمدؐ کا مقام
وہ امت اسلام میں محدود نہیں

کالی داس گپتا رضا نے بھی صنف نعت میں بیش قیمت سرمایہ چھوڑا ہے۔ چند اشعار پیش خدمت ہیں:

دوست اور دشمن پہ یکساں مہرباں تو ہی تو ہے
روزگار زیست میں جوئے رواں تو ہی تو ہے
بے قراروں کو تیرا آسرا بعد خدا
روح دل تو ہی تو ہے تسکین جاں تو ہی تو ہے

منشی روپ چند جناب رسولؐ خدا کے اسم گرامی کا اعجاز اس طرح بیان کرتے ہیں:

آیا جو نام پاک محمدؐ زبان پر
صل علیہ کا شور اٹھا آسمان پر

منشی درگا سہائے سرور جہان آبادی رسول خداؐ کی شان کی عظمت اس طرح بیان کرتے ہیں، ایک بند ملاحظہ ہو:

دل بے تاب کو سینے سے لگا لے آجا
کہ سنبھلتا نہیں کمبخت سنبھالے آجا
پاؤں ہیں طول شب غم نے نکالے آجا
خواب میں زلف کو مکھڑے سے لگا لے آجا
بے نقاب آج تو اے گیسوؤں والے آجا

جاوید وششٹ ایک اچھے شاعر ہیں۔ انھوں نے شان رسولؐ میں اس طرح مدح سرائی کی چند اشعار درجہ ذیل ہیں:

اک برہمن ہند تجھے یار کرے ہے
چوٹی سے ہمالہ کی نمسکار کرے ہے
جو برہم کو جانے اسے کہتے ہیں برہمن
رحمت ہے دو عالم کے لیے تیری تجلی
تجھ پر ہی بھروسا یہ گنہگار کرے ہے
ہے اور ہی عالم میں ترا عاشق جاوید
تیری ہی محبت ہے جو سرشار کرے ہے

کرشن موہن نے کافی شاعری کی ہے وہ کہتے ہیں کہ جناب محمد مصطفیٰؐ تمام مذاہب کے ماننے والوں کو ایک کردیتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

ایک ہوں کیوں کر نہ محمود و ایاز
ساغر وحدت ہے جام مصطفیٰؐ

گلزار دہلوی نے بھی شان رسالت بیان کی ہے ایک شعر میں جناب رسولؐ کی مبعوث رسالت بیان کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

کذب اور کفر کو مٹانے کو
سرور کائنات آئے تھے

کرشن بہاری نور بھی اپنی عقیدت کا اظہار یوں بیاں کرتے ہیں:

یہ ربط نبوت اور وحدت ہر حال میں یکتا ہوتا ہے
جھکتی ہے جبیں کعبہ کی طرف اور دل میں مدینہ ہوتا ہے

بدھ پرکاش جو ہر روز محشر کے حساب و کتاب کو مانتے ہیں وہاں حضور اکرمؐ کی عنایت کا ذکر کرتے ہیں:

جلائے گا کیا مجھ کو خورشید محشر
کہ بیٹھا ہوں زیر ردائے محمدؐ

پنڈت مہابیر ایک اچھے شاعر گزرے ہیں یہ بھی قیامت کو روز حساب مانتے ہیں اور یہ بھی مانتے ہیں کہ رسول اکرمؐ سے محبت رکھنے والوں کو جنت ملے گی فرماتے ہیں:

سامنے حق کے قیامت میں نہ عزت ہوتی
بیر اگر امت محمدؐ میں نہ داخل ہوتا

ستیش چندر سکسینہ طالب دہلوی بھی محبت رسول اس طرح بیان کرتے ہیں:

حلقہ ہے مہ نو کا گریبان محمدؐ
ہے مطلع انوار یہ دامان محبت

سالک رام سالک ایک اچھے شاعر گزرے ہیں وہ بھی دل کی آنکھ کھول کر کہتے ہیں:

کیوں کر نہ دل و جاں سے مجھے بھائے مدینہ
آنکھوں میں بسا ہے مرے مولائے مدینہ
سرمے کی طرح آنکھ میں سالک میں لگالوں
ہاتھ آئے اگر خاک در مولائے مدینہ

گرسرن لال ادیب نے بھی یہ محسوس کیا ہے کہ رسولؐ اکرم کائنات میں پیار و محبت بانٹنے کے لیے آئے ہیں۔ انھوں نے اس طرح یاد کیا ہے:

آؤ سب مل کر بیٹھیں پیار کی باتیں کریں
سرزمین یثرب و سرکار کی باتیں کریں
پریم کی گنگا بہائی جس نے ریگستان میں
روح تازہ پھونک دی مٹتے ہوئے ایمان میں

ایک جین شاعر رویندر جین بھی اپنی عقیدت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

آپؐ تکمیل مساوات امین و صادق
آپؐ ہیں افضل الانسان رسول اکرمؐ

اس طرح اگر غیر مسلم نعت گو شعرا کی فہرست اور ان کا کلام ایک جگہ جمع کیا جائے تو اس کے لیے کافی وقت درکار ہے۔ کیونکہ ابھی بھی بہت سے شعرا گمنامی کے عالم میں ہیں اور کلام بھی ابھی تک نایاب ہے۔ کائنات میں صرف جناب رسول خدا کی شان و عظمت ہی ہے جس کو ہر مذہب اور ہر قوم کے لوگ بیان کرتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ آپ کی شان میں مدح سرائی کرنا باعث نجات مانتے ہیں۔ اس طرح غیر مسلم شعرا بھی رسول رحمتؐ کی شان عظمت بیان کرنے میں کسی سے کم نہیں

Muneer Hussain Hurrah, Mallabuchan
Magam - 193401

محمد ارشد جمال

اردو شاعری میں علم الجراحت کے مشمولات

ادب خواہ کسی بھی زبان سے متعلق ہو زندگی اور سماج سے وابستہ ہوا کرتا ہے۔ یہ انسانی زندگی کے تجربات کا نچوڑ پیش کرتا ہے۔ انسان دنیا میں جن اشیا کا ادراک کرتا ہے، جو چیزیں اس کے مشاہدے اور تجربے میں آتی ہیں، وہ جن کیفیات سے دوچار ہوتا ہے اور جو کچھ سوچتا اور سمجھتا ہے اس کا اظہار ادبی شہپاروں سے کرتا ہے۔ ادبی تخیلات بالعموم زندگی کی مختلف سطحوں کو واشگاف کرتے ہیں اس میں خاص طور پر سماج اور معاشرے کی روایات، ملبوسات، ماکولات و مشروبات اور مختلف ساز و سامان کا تذکرہ ملتا ہے۔ ادب زندگی سے ہر حال میں جڑا رہتا ہے، اس کی جڑیں کسی نہ کسی تہذیب، عقیدہ و اقدار اور علوم وفنون سے وابستہ ضرور ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مشہور مفکر ڈی بونائیڈ نے ادب کو معاشرے کا وسیلہ اظہار بتایا ہے؛ "literature is the expression of society" اور جارج ایلیٹ نے اسے زندگی سے قریب تر کہا ہے۔

ادب نہ صرف یہ کہ زندگی اور سماج سے اثر قبول کرتا ہے بلکہ یہ اس پر اثر انداز بھی ہوتا ہے، یہ صرف سماج سے حاصل ہی نہیں کرتا بلکہ اسے عطا بھی کرتا ہے اور حسب ضرورت اس کی اصلاح بھی کرتا ہے:

طبیبوں کے مطب میں صرف مرہم ہی نہیں ملتا
جراحت کی ضرورت ہو تو پھر نشتر بھی لگتے ہیں

دیگر اصناف ادب کی طرح اردو شاعری بھی ہمیشہ ہی معاشرے اور حیات سے منسلک رہی ہے۔ اس نے کہیں مذہبی تعلیمات کو عام کیا ہے، کہیں اخلاقیات کا درس دیا ہے، کہیں سیاسی رجحانات کی پیروی کی ہے، کہیں تہذیبی اقدار کو اجاگر کیا ہے، کہیں سماج کی خامیوں پر نشتر زنی کی ہے، کہیں معاشی صورتحال کی تصویر کشی کی ہے، کہیں صنعت و حرفت کی تشہیر کی ہے تو کہیں علوم وفنون کو اپنے دامنِ وسعت میں جگہ دی ہے۔ چنانچہ انھیں علوم و فنون میں طب کی ایک اہم شاخ علم الجراحت یعنی سرجری بھی ہے۔ جسے علاج بالید یا دستکاری سے بھی موسوم کیا جاتا ہے اور عموماً ایسے وقت میں جب دوا، غذا اور دیگر تدابیر اپنے اثرات مرتب کرنے میں ناکام ثابت ہوتی ہیں تو جراحت کی ضرورت پڑتی ہے۔ دور حاضر میں علم الجراحت نے ایک بہت ہی اہم شاخ کی حیثیت اختیار کر لی ہے بالخصوص ایمرجنسی میڈیسین میں اس کی اہمیت سے کسی طور سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اردو شاعری میں دیگر علوم وفنون کی طرح علم الجراحت کو بھی جگہ حاصل ہے اور خاص طور سے غزلیہ شاعری میں اس کی مختلف اصطلاحات، اس کے آلات، اس کے طریقہ کار اور اس کے لوازمات کا کثرت سے تذکرہ ملتا ہے۔ جن میں جراحت، جراح، زخم، نشتر، پھپھولے، آبلے، چھالے، رفو، ٹانکے، داغ، مرہم، پھوڑا، فصد، پھاہا، پٹی اور ناسور وغیرہ شامل ہیں۔ ان اصطلاحات کا استعمال اشعار میں کیفیت، سوز و گداز اور اثر آفرینی پیدا کرنے کے لیے بطور استعارہ کیا گیا ہے اور بیشتر شعرا نے ان تلازموں سے اپنا جہان معانی تعمیر کیا ہے۔

جراحت/جرّاح: جرحہ یا جراحت کے لفظی معنی زخم یا چوٹ کے آتے ہیں اور چونکہ سرجری میں یا تو زخموں کا علاج کیا جاتا ہے یا زخم پہنچا کر یعنی آپریشن کے ذریعے علاج کیا جاتا ہے اس وجہ سے اسے علم الجراحت کہتے ہیں۔ اس عمل کو انجام دینے والا بالعموم جراح کہلاتا ہے لیکن بعض مقامات پر female surgon کے لیے جراحی کا لفظ بھی استعمال میں لایا گیا ہے۔ بہرکیف یہ اصطلاحات اردو شاعری میں جا بجا اپنی معنویت بکھیرتی ہوئی نظر آتی ہیں:

یہ کس مقام پہ لائی ہے زندگی کہ جہاں
ہر ایک تازہ جراحت کا نام مرہم ہے (عامر عثمانی)

ناوک مژگاں سے دل پر وہ جراحت کھائی ہے
چشم سوزن کو بھی جو اے بخیہ گر ملتی نہیں (رند)

جرّاح میرے زخم کے ٹانکے نہ کاٹ ڈال
رہ رہ کے کچھ ادھیڑ کہ ایذا بھی کم رہے (داغ)

عشق میں جراحی کی اپنے دل کو آپ نے
ہے بنایا جانصاحب جان کا پھوڑا عبث (جانصاحب)

پھر پرشش جراحت دل کو چلا ہے عشق
سامان صد ہزار نمک داں کیے ہوئے (غالب)

زخم: جراحت کے ساتھ زخم کا چولی دامن کا ساتھ رہا

ہے۔ اگر یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اردو غزلیہ شاعری کا ایک چوتھائی حصہ (لفظی و معنوی دونوں لحاظ سے) زخم آلود ہے اور ان میں زیادہ تر مواقع پر جگر و دل زخمی ہوئے ہیں ساتھ ہی ساتھ زبان کا زخم بھی بہت نمایاں مقام رکھتا ہے اور بڑی مشکل سے بھرتا ہوا نظر آتا ہے۔ شعری کائنات میں یہ زخم الگ الگ لحاظ سے وارد ہوئے ہیں کبھی یہ تبسم ریز ہوکر اپنی خندہ زنی کی داد طلب کرتے ہیں تو کبھی اپنی اذیت سے اس قدر لطف اندوز کرتے ہیں کہ صاحب زخم مزید سرور کی خاطر اس میں نمک ڈالنے لگتا ہے۔ کبھی یہ مسکرا کر لوگوں کو رونے پر مجبور کر دیتے ہیں تو کبھی خود اس قدر مجبور ہو جاتے ہیں کہ 'شور الاماں' بلند کرنے لگیں:

بھر جاتے ہیں سب زخم سناں و تبر و تیر
اک زخم زباں ہے جسے بھرنا نہیں آیا (جلیل)

گھڑیوں روئے ہیں ہم امیر لہو
زخم کوئی جو مسکرایا ہے (امیر)

ٹانکے ٹوٹیں گے تو آئے گی صدائے انفراق
زخم بولے گا تو 'شور الاماں' ہو جائے گا (قدر)

مزہ ملا ہے مجھے دل کی بے قراری میں
کہ بھر رہا ہوں نمک اپنے زخم کاری میں (امیر)

مرہم: زخم و جراحت کے ساتھ مرہم کا بھی علاقہ ہے کیونکہ یہ اپنے اندمال کے لیے اسی کے مرہون منت ہوتے ہیں اور ہر طرح کی جراحت میں خواہ وہ پھوڑے اور ناسور کی ہی شکل کیوں نہ اختیار کر چکے ہوں مرہم کا استعمال واجب ہوا کرتا ہے، پھر بھلا اردو شاعری کا زخم اس کے احسان سے کیوں کر خالی ہو؟ ۔طرہ تو یہ ہے کہ شعرا نے اس کا استعمال زخموں کو ہرا کرنے اور داغوں کو چمکانے کے لیے بھی کیا ہے، کبھی انھوں نے ریزہ الماس (جو زخموں کو مزید گہرا کر دیتا ہے) کو مرہم کا جز اعظم بنایا ہے تو کبھی خنجر کو بذات خود مرہم سے استعارہ کیا ہے:

مرہم سبز لگاتے ہیں جو وہ
میرے زخموں کو ہرا کرتے ہیں (وزیر)

زخم دل کے بھر گئے ابروئے قاتل دیکھ کر
بخت نے میرے لیے خنجر کو مرہم کر دیا (ناسخ)

نہ پوچھ نسخہ مرہم جراحت دل کا
کہ اس میں ریزہ الماس جزو اعظم ہے (غالب)

آفتاب صبح کا عالم دل زخمی میں ہے
داغ غم چمکا جو رکھا مرہم کافور کو (ناسخ)

ٹانکے: زخم اگر بڑے ہوں اور ان کے منھ کھلے ہوں تو پھر ان کو ٹانکے لگانے کی ضرورت ہوتی ہے یا آپریشن کی غرض سے اگر کسی عضو کو نشتر کے ذریعے کھولا جاتا ہے تو بعد میں اسے ٹانکوں کے ذریعے سل دیا جاتا ہے تاکہ زخم تعفن سے پاک رہے اور اندمال کا عمل جلد سے جلد انجام پا سکے۔ چنانچہ اردو شاعری میں مستعمل زخموں کی بھی رفوگری کی گئی ہے اور حسب ضرورت ان میں ٹانکے بھی لگائے گئے ہیں لیکن کمال ہنر یہ ہے کہ یہ ٹانکے عام دھاگوں سے نہیں لگائے گئے بلکہ اس کے لیے کبھی محبوب کے پیرہن کے تار کا استعمال کیا گیا تو کبھی اس کی تلوار کی ڈور کا مگر اس کے باوجود ٹانکے ٹوٹتے رہتے ہیں اور زخم ہرا کا ہرا رہتا ہے:

> دیگر اصناف ادب کی طرح اردو شاعری بھی ہمیشہ ہی معاشرے اور حیات سے منسلک رہی ہے۔ اس نے کہیں مذہبی تعلیمات کو عام کیا ہے، کہیں اخلاقیات کا درس دیا ہے، کہیں سیاسی رجحانات کی پیروی کی ہے، کہیں تہذیبی اقدار کو اجاگر کیا ہے، کہیں سماج کی خامیوں پر نشتر زنی کی ہے، کہیں معاشی صورتحال کی تصویر کشی کی ہے، کہیں صنعت و حرفت کی تشہیر کی ہے تو کہیں علوم و فنون کو اپنے دامنِ وسعت میں جگہ دی ہے۔

میرے زخموں کے اگر ٹانکے تجھے منظور ہیں
اے بت خونریز اپنے پیرہن کے تار کھینچ (ناسخ)

میرے زخموں کو اگر ٹانکے لگانا ہے تجھے
پہلے لا جراح ڈورا یار کی تلوار کا (ناسخ)

روز ٹانکے ٹوٹتے ہیں زخم کیونکر خشک ہو
خوں ہوا جاتا ہے دل کیا دیدۂ تر خشک ہو (آتش)

نشتر: عمل جراحت یا آپریشن کو انجام دینے کے لیے نشتر کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ ایک دھار دار آلہ ہوتا ہے جس کے ذریعے مقام ماؤف پر چیرا لگا کر اس کو فساد سے پاک کیا جاتا ہے جو حسب ضرورت اپنے حجم میں کم و بیش اور اپنی ساخت میں مختلف ہوا کرتا ہے۔ شعرا نے اپنے خیالات کی عمارت کی تشکیل کے لیے اس لفظ کا بھی خوب سہارا لیا ہے چنانچہ کبھی دل کو پھوڑا تصور کر کے اس کی نشتر زنی کی آرزو کی ہے تو کبھی وحشت کے نشتر سے رگوں کے منھ کھولے ہیں:

درد پہلو سے یہ معلوم ہوا اے جرّاح
دل نہیں ہے کوئی پھوڑا ہے اسے نشتر دے (بحر)

رگ خلط دموی نشتر وحشت سے کھلی
ریم و خوں موجزن آنکھوں سے دم چندر ہا (رشک)

داغ: داغ لگانے کو طبی اصطلاح میں عمل کئی بھی کہتے ہیں۔ علم الجراحت میں مستعمل یہ ایسی تدبیر ہے جس میں کسی دھات یا کسی دوا کو گرم کر کے مقام ماؤف کو داغا جاتا ہے تاکہ عضو فاسد ٹھیک ہو جائے اور مرض کا پھیلاؤ رک جائے۔ جدید دور میں اس غرض کے لیے الکٹرانک آلے کا استعمال کیا جاتا ہے جس کو cautery کہتے ہیں اور اس کا استعمال سرجری کے دوران جریان خون کو روکنے کے لیے عروق شعریہ کے دہنوں کو بند کر کے کیا جاتا ہے۔ لیکن اس منظر نامے میں عموماً داغ لگانے کے لیے سوزش عشق اور گرمی حسن سے کام لیا گیا ہے:

لالہ رخ کہہ کر لگاتے ہیں گل اندام کو داغ
روز محشر شاعروں کا پوست کھینچا جائے گا (آتش)

میں نے کبھی جو داغ جگر کا کیا ہے ذکر
انگارا رکھ دیا ہے کسی نے زبان پر (بحر)

داغوں سے اس عشق نے میرا سارا دل بیکار کیا
ایسے پاپڑ بیلے جن سے جینا بھی دشوار کیا (شوق قدوائی)

پھوڑا: جراحت یا چوٹ اگر جلد کی داخلی سطحوں میں یا اندرون اعضا ہوتی ہیں اور ان کا درست علاج نہیں کیا جاتا ہے تو ان میں مواد اور پیپ جمع ہو جاتی ہے اس وقت اسے پھوڑا یا abscess کہتے ہیں۔ اس کی موجودگی میں لازمی بخار ہوتا ہے اور رہ رہ کر اس میں شدید قسم کے درد کی لہریں اٹھا کرتی ہیں۔ بالعموم اس کے ازالے کے لیے اس میں نشتر لگا کر مواد کو خارج کرنے کی ضرورت ہوتی ہے یا پھر ایسی دوائیں استعمال میں لائی جاتی ہیں جو اسے پکا دیں اور وہ پھوٹ کر خود بہہ جائے۔ اردو شاعری کی بیاض میں خاص طور سے یہ پھوڑا دل و جگر کو ہی اپنا مسکن بنائے ہوئے ہے۔ گو کہ یہ براہ راست بیرونی ضرب و جراحت سے نہیں پیدا ہوتا بلکہ سوزش غم اور گرمی آہ و فغاں سے وجود میں آتا ہے لیکن اپنی فطرت کے مطابق یہ پھوٹ کر بہتا بھی ہے اور رہ رہ کر ٹپکتا بھی ہے:

کوئی دن میں خونناب ہو کر بہے گا
دل اب پک کے پھوڑا ہوا جاتا ہے

یہ پھوڑا جو پھوٹا تو اچھا نہ ہوگا
سمجھ بوجھ کر دل دکھانا ہمارا (بحر)

ستم اے گرمی ضبط فغاں و آہ چھاتی پر

کھو بس پڑ گیا چھالا کبھو پھوڑا نکل آیا (مومن)
سوزش دل سے ہے اف اف شب تنہائی میں
ہائے رہ رہ کے ٹپکتا ہے یہ پھوڑا کیا کیا (صبا)

ناسور: پھوڑے کا اگر صحیح علاج نہ کیا جائے تو اس میں ایک غیر طبعی سوراخ بن جاتا ہے جس سے ظاہر جلد کی طرف مستقل پیپ رستی رہتی ہے اسے ناسور یا fistula کہا جاتا ہے۔ ناسور کا علاج بہت مشکل ہوتا ہے اسی لیے اس کو عسیر العلاج زخموں میں شمار کیا جاتا ہے اور عموماً اس کے اندمال کے لیے دواؤں کی بتّی بنا کر ناسور میں رکھی جاتی ہے۔ شعرا نے اس طبّی لفظ کو بھی مختلف مقامات پر برت کر شعری کائنات کے مفاہیم میں وسعت اور معنویت پیدا کی ہے اور اس سے بڑے خوبصورت خوبصورت استعارے نکالے ہیں۔ کوئی سوچ سکتا ہے کہ ناسور کی بتّی سے کوہ طور کے چراغ روشن کیے جاسکتے ہیں مگر ناسخ کا حوصلہ تو دیکھیں:

وادی ایمن ہے اک مدّت سے تاریک اے کلیم
رکھ چراغ طور میں بتّی مرے ناسور کی (ناسخ)
کہتا ہے چارہ ساز مرے دل پہ رکھ کے ہاتھ
پھوڑے نے منھ بنایا ہے ناسور کے لیے (راسخ)
اب کسے طاقت بیاں ہے شعور
عشق نے دل میں کردیا ناسور (شعور)
جرّاح مرے زخم جگر بہتے ہیں دن رات
ناسور نہیں ہیں تو یہ پھر کیوں نہیں بھرتے (رند)

فصد/فصّاد: فصد بھی علم الجراحت کی ایک قسم ہے جس میں نشتر یا کسی تیز دھار دار آلے کے ذریعے چند مخصوص رگوں کے دہانے کھول کر ان سے خون کو خارج کیا جاتا ہے تاکہ اس کے ذریعے فاسد مادوں کا استفراغ ہو سکے۔ اس عمل کو انجام دینے والا شخص فصّاد کہلاتا ہے۔ ماضی بعید میں اس طریقہ علاج کا کافی چلن تھا لیکن پچھلی کچھ دہائیوں سے یہ عمل تقریباً متروک سا ہو گیا تھا۔ فی الوقت بعض مقامات مثلاً نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسین، بنگلور اور آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج، قرول باغ اس کو دوبارہ رائج کرنے کی کوشش جاری ہے۔

شعر گوئی نے اپنی ترسیل کے لیے اس اصطلاح سے بھی استفادہ کیا ہے اور اس کے تلازمے کو لفظی و معنوی اعتبار بخشا ہے:

جذب وحشت نے دکھایا اثر مقناطیس
رگ پھڑکتے نہ لگی دیر کہ فصّاد آیا (بحر)
شوق مژگاں یہ ہے جب ہم فصد کھلوانے لگے
نوک نشتر دیکھتے ہی منھ رگوں کا کھل گیا (شاد)
عشق میں موئے کمر کے مجھ کو سودا ہو گیا
کیا تعجب ہے جو رگ ملتی نہیں فصّاد کو (شعور)
کھلوائی فصد یار نے میں قتل ہو گیا
کم تھی لہو کی دھار نہ خنجر کی دھار سے (ناسخ)
خشک ہو جائے لہو کھولے جو مجھ وحشی کی فصد
ہاتھ کٹواؤں جو دم میں دم رہے فصّاد کے (شرف)
جائے گا جنوں نہ سر سے بے ذبح
ہو فصد مری رگ گلو کی (امیر)
اللہ رے حرارت جوش جنونِ عشق
پانی لہو سے نشتر فصّاد ہو گیا (برق)

آبلہ/پھپھولا/چھالا: مذکورہ تینوں ہم معنی الفاظ جو اردو شاعری میں کثرت سے مستعمل ہیں مختلف حالات میں بطور علامت کے پائے جاتے ہیں مثلاً حرق وسلق، herpez، چیچک اور دیگر جلدی امراض وغیرہ۔ عام زبان میں انھیں blisters کہا جاتا ہے جو 5 ملی میٹر سے بڑے ہوتے ہیں اور ان میں مائی رطوبت بھری ہوتی ہے اور جب یہ پھوٹتے ہیں تو شدید اذیت کا باعث ہوتے ہیں۔ گلشن سخن میں ان اصطلاحات نے بھی خوب گل بوٹے کھلائے ہیں۔ زیادہ تر مواقع پر یہ آبلے دشوار گزار راہوں میں گزرنے والے عاشق کے قدموں میں نمودار ہوئے ہیں لیکن رہروان شوق نے ان کی اذیت سے ہمیشہ حظ ہی حاصل کیا ہے اور راہ اگر پرخار ہو تو پھر اس کا کیا کہنا:

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پرخار دیکھ کر (غالب)
دشت وحشت میں مرے ساتھ سے ایسا کھٹکے
پاؤں پڑ پڑ کے ہوئے آبلوں سے خار جدا (صبا)
کیا گلے ہوں گے یار سے مل کے
آج پھوٹیں گے آبلے دل کے (رند)
دل کے پھپھولے پھوٹے تو ابھرے جگر کے زخم
جنت لگی رہی میرے بیت الحزن کے پاس (راسخ)
چرخ کا پاؤں ہے مدت سے یوں ہی گردش میں
ہے بجا گر کہے خورشید کو چھالا اپنا (داغ)

بالا اصطلاحات کے علاوہ اور بھی دیگر لوازمات ہیں جو علم الجراحت سے منسلک ہیں اور بساط شعر پر ان کو بطور مہرہ استعمال کیا گیا ہے ان میں زخموں کی پٹّی کرنا، ان پر پھاہا رکھنا، ان پر مشک چھڑکنا، ان میں صوف بھرنا اور ان پر پرطاؤس باندھنا وغیرہ قابل ذکر ہیں:

رومال اس پری کا ہوا پٹّیوں میں صرف
اس پر بھی خون بند نہ فصّاد سے ہوا (شرف)
باندھ دیں پٹّی جو اس محبوب کے مؤباف کی
کیا ہی بر آئے مرے زخم کہن کی آرزو (ناسخ)
زخم دل پر میرے پٹّی زہر کی اے چارہ گر
چڑھ چکی ہے بارہا اور بارہا چڑھ جائے گی (ظفر)
چھڑک کر مرے زخم پر مشک بولا
گل زخم ہیں واہ کیا رنگ و بو ہے (ناسخ)
سخت دل بہنے لگے کٹ کٹ کے پھوڑے کی طرح
داغ ہجر آخر کو پھاہا ہو گیا زنگار کا (شرف)
صوف بھرنا کون سا دیوانوں کے زخموں میں ہے
کس کی خاطر تو م کر اپنا گریباں لے چلے (شرف)
دلِ مجروح پر میرے نہ سمجھو داغ حسرت کا
پرطاؤس اس زخمی نے ہے اے دوستاں باندھا (ذوق)

اردو شاعری میں مستعمل علم الجراحت کی اصطلاحات کے لیے مذکورہ بیشتر مثالیں ایک مخصوص دور کے شعری ورثے سے ماخوذ ہیں جبکہ اس کے علاوہ اور کئی دیگر ادوار کی شاعری بھی ان مشمولات سے بھری پڑی ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ماضی بعید میں جس تواتر کے ساتھ ان اصطلاحات سے استفادہ کیا گیا ہے اور یہ شعری سرمائے کا حصّہ ہوئے ہیں ماضی قریب اور حال میں ان کا ورود اس تناسب سے کم ہوا ہے۔ اس کی مختلف وجوہات ہو سکتی ہیں لیکن اس کا سب سے اہم سبب دور حاضر میں مروجہ علمی اختصاص کا دستور ہے جس کے سبب دیگر علوم سے واقفیت کم ہی نصیب ہوا کرتی ہے اور یہ شخصیت اور فن کی ہمہ گیریت کے لیے سم قاتل ہے۔

کتابیات:

1. پروفیسر الطاف احمد اعظمی: طب یونانی اور اردو زبان و ادب: سینٹر فار ہسٹری آف میڈیسین اینڈ سائنس، جامعہ ہمدرد، نئی دہلی: 2004
2. حکیم سید ظل الرحمٰن: دلی اور طب یونانی: اردو اکادمی، دہلی: 1995
3. نور الحسن نیر: نور اللغات: جلد اول، دوم، سوم و چہارم: قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو، نئی دہلی: 1998
4. مولوی سید احمد دہلوی: فرہنگ آصفیہ: جلد اول، دوم و سوم: قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو، نئی دہلی: طبع چہارم: 1988
5. سید تصدق حسین: لغات کشوری: دارالاشاعت، اردو بازار، کراچی، سال طبع نامعلوم۔
6. حکیم سید ظل الرحمٰن: منظوم طبی رسائل: ابن سینا اکاڈمی، علی گڑھ: 2013

Mohd.Arshad Jamal, Department of Moalajat, National Institute of Unani Medicine, Kottigepalya Magadai Main Road, Bangalore-560091

محمد زاہد

بنگلہ زبان کا باغی شاعر

قاضی نذرالاسلام

اردو اور بنگلہ دونوں جدید ہندوستانی زبانیں ہیں۔ بنگلہ ایک مخصوص خطہ یعنی مغربی بنگال اور مشرقی بنگال تک محدود ہے جب کہ اردو کسی خاص خطے کی پابند نہیں۔ ملک و بیرون ملک میں بھی یہ ہندوستانیوں کے رابطے کی زبان ہے۔ سلاطین دہلی کے عہد میں بنگالہ ایک بڑا صوبہ تھا۔ یہاں کی مٹی نے باہر سے آنے والوں کو بھی اپنے دامن میں پناہ دی۔ معتدل آب و ہوا، زرخیز زمین، صنعتوں کے فروغ اور کچھ عرصے تک ہندوستان کی راجدھانی ہونے کے سبب آس پاس کے علاقوں سے بڑی تعداد میں لوگ یہاں آباد ہوئے۔ اس نقل مکانی نے یہاں کی زبان اور تہذیب پر خاصا اثر ڈالا۔ بالخصوص اردو اور بنگلہ کے درمیان مفاہمت کا رشتہ استوار ہوا۔ بنگلہ بولنے والوں نے اردو شاعری اور صحافت کے فروغ میں ایک کردار ادا کیا وہیں اردو داں طبقے نے یہاں کے قدرتی مناظر، تہوار، پوجا پاٹ، دیہی رسم و رواج، میلوں ٹھیلوں، چرند و پرند، پھل، پھول، مٹھائی، پاٹ، مچھلی وغیرہ کا ذکر اپنی شاعری میں کیا ہے اور اس سرزمین سے والہانہ لگاؤ کی عکاسی کی ہے۔

اردو اور بنگلہ میں ترجمے کی روایت بھی پرانی ہے۔ نندلال شیل (1869 تا 1930) نے بنکم چندر چٹرجی کے ناول 'کرشنا کانتیر ویل' کا اردو ترجمہ 'بروگ' کے نام سے کیا۔ ناگیندر ناتھ بنرجی نے اپنے ڈرامے 'ہیم لتا' کا ترجمہ 'شبستان عاشقی' خود کیا جو 1877 میں لکھنؤ سے شائع ہوا۔ عبدالحلیم شرر نے بنکم چندر چٹرجی کے ناول 'درگیش نندنی' کا ترجمہ کیا۔ دیگر مترجمین میں سید امیر رضا کاظمی، سالک لکھنؤ، عین رشید، شانتی رنجن بھٹا چاریہ، یونس احمر، محمد امین، قیصر شمیم، نصر غزالی، بدرالحسن، ظہیر انور، فیروز عابد، کمال احمد، سعید پریمی، علقمہ شبلی، شوکت عظیم، معصوم مشرقی، خورشید اختر فرازی، رفیق نعیم، کلیم حاذق، فہیم انور، عاصم شہنواز شبلی، شبیر احمد وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

مشرقی اور مغربی بنگال کے علاقوں میں پال خاندان نے 250 سال (750 - 1100) اور سین خاندان نے ایک سو سال (1100 - 1200) تک حکومت کی۔ اُس زمانے میں یہاں سنسکرت سرکاری اور تہذیبی زبان تھی۔ مسلمانوں کی آمد سے قبل بنگلہ زبان و ادب کے آثار برائے نام ہیں۔ صرف ایک کتاب 'چریا چریا وی نش چے' ملتی ہے جس میں بدھوں کے صوفیانہ گیت اور دوہے ہیں۔ 1192 میں شہاب الدین محمد غوری نے پرتھوی راج چوہان کو شکست دے کر ہندوستان میں ایک نئی تاریخ کی بنیاد ڈالی۔ مسلمان پیر، فقیر اور صوفی ملک کے دیگر حصوں کی طرح بنگال میں بھی تشریف لائے اور اپنے حسن عمل سے لوگوں میں انسانوں سے محبت اور خدا سے قربت کا جذبہ پیدا کیا۔ شیخ جلال الدین تبریزی، شیخ علاء الحق پانڈوی، شیخ جلال سلہٹی وغیرہ ان بزرگوں میں سے ہیں جو 1201 میں بختیار خلجی کے بنگال فتح کرنے سے پہلے یہاں موجود تھے اور اپنے ملفوظات اور درس سے ایک نئی زبان کا راستہ ہموار کر رہے تھے۔ مسلم سلاطین نے کامیابی سے بنگال پر حکومت کی اور علاقائی زبان یعنی بنگلہ کی سرپرستی کی جس میں حسین شاہ خاندان (1493 - 1538) کا ذکر ضروری ہے۔ انھوں نے سلاطین دہلی کے برعکس بنگالی تشخص کا تصور ابھارا۔ اِسی زمانے میں پہلی بار کرتی داس نے بنگلہ میں رامائن لکھی۔ مشہور رزمیہ 'مہابھارت' کا ترجمہ کیا گیا۔ مسلم شعرا نے بنگلہ زبان میں شاعری کا آغاز کیا۔ چاند قاضی، شیخ کبیر، شیخ چاند، سید سلطان، زین الدین، نصراللہ خاں وغیرہ نے اپنی تخلیقات سے بنگلہ زبان کو توانائی عطا کی۔ 1576 میں بنگال میں مغلوں کی حکومت قائم ہوئی تو ایرانیوں کی ایک بڑی تعداد ڈھاکہ اور مرشد آباد میں آباد ہوئی۔ ان کی وجہ سے مرثیہ خوانی کا رواج عام ہوا جس نے یہاں کے عوام پر خاصا اثر ڈالا۔ فارسی زبان عوام کے قریب آئی۔ راجہ رام موہن رائے نے فارسی کا اخبار نکالا۔ رابندر ناتھ ٹیگور کے والد فارسی شاعری کے دلدادہ تھے۔ خود ٹیگور رومی، جامی اور حافظ سے متاثر نظر آتے ہیں۔ صوفیت اور جمال پسندی کے اس ماحول میں نذرالاسلام کا بچپن گزرتا ہے لیکن جلد ہی ان کی انفرادیت کا رنگ جھلکنے لگتا ہے۔

نذرالاسلام کی پیدائش آسنسول سب ڈویژن کے ایک گاؤں چُرولیا میں 25 مئی 1899 کو ہوئی۔ یہ کہا جاتا ہے کہ ان کے جداعلیٰ پٹنہ سے اس گاؤں میں قاضی بن کر آئے تھے لیکن ان کی پیدائش سے پہلے ہی سارا اثر و رسوخ، زمین اور جاگیر ختم ہو چکی تھی صرف قاضی کا لقب باقی رہ گیا تھا۔ ان کے والد قاضی فقیر احمد ایک غریب آدمی تھے۔ وہ آٹھ سال کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اس گاؤں میں صرف ایک مکتب تھا جہاں فارسی اور عربی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ انھوں نے چند برس اسی مدرسے میں تعلیم حاصل کی۔ ہندوؤں کی کتابیں رامائن، مہابھارت، پران وغیرہ دلچسپی اور سنجیدگی سے پڑھیں۔ ساتھ ہی سادھوؤں، باؤل گیت گانے والے فقیروں اور صوفیوں کی محفلوں میں بھی شرکت کی۔ ڈراموں سے بھی انھیں دلچسپی رہی۔ گاؤں میں ڈرامہ کرنے والی ایسی پارٹیوں کے لیے انھوں نے گیت لکھے اور یہیں سے انھیں بنگلہ سر اور تال سے واقفیت ہوئی۔

نذرالاسلام نوجوانی کے ایام میں آسنسول چلے آئے۔ کچھ عرصے بعد رانی گنج کے ایک ہائی اسکول میں ان کا داخلہ ہوا۔ ہوسٹل میں مفت رہنے اور کھانے کا انتظام تھا۔ ساتھ ہی سات روپیہ ماہانہ وظیفہ ملتا۔ انھوں نے یہاں آٹھویں سے دسویں تک تعلیم حاصل کی۔ انگریز حکمرانوں نے بنگال کے نوجوانوں پر مشتمل ایک رجمنٹ تیار کی تو نذرالاسلام تعلیم چھوڑ کر اس میں شامل ہو گئے۔ 1917 سے 1919 تک وہ کراچی جیسے بڑے شہر میں رہے اور ایک پنجابی مولوی کی مدد سے فارسی زبان اور شاعری کا اچھا مطالعہ کیا۔ اسی دوران انھوں نے رباعیات حافظ کے ترجمے کا کام شروع کیا جو بعد میں مکمل ہوا اور 1930 میں شائع ہوا۔

1919 سے ان کی تحریروں کی اشاعت کا آغاز ہوتا ہے۔ ان کی پہلی کہانی 'باؤنڈولیر آتم کتھا' (ایک سیلانی کی روداد) کلکتہ کے بنگلہ رسالہ 'سوگت' میں چھپی۔ اِسی

سال ان کی نظم 'مکتی' (نجات) رسالہ 'بنگیا مسلمان ساہتیہ پتریکا' میں اشاعت پذیر ہوئی اور اس سے ان کی شعری صلاحیتوں کا انکشاف ہوا۔ اس نظم میں ایک فقیر کی زندگی اور موت نیز فقیر کی نظرِ عنایت سے ایک درخت میں نئے پتوں کے لگنے کی کہانی ہے۔ کامریڈ مظفر احمد اس رسالے کے روحِ رواں تھے۔ انھوں نے اس نئے شاعر کی ہمت افزائی کی اور انھیں مزید تخلیقات بھیجنے کی دعوت دی۔ اس تعلق نے اشتراکی اندازِ فکر کے حامل نذرالاسلام کے جذبات کو مزید مہمیز کیا۔ مارچ 1920 میں انھیں فوج کی خدمت سے سبک دوش کردیا گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انگریزوں کے خلاف ہندوستانی عوام بالخصوص مسلمانوں میں بڑا اشتعال تھا۔ جلیان والا باغ کے قتل عام کا واقعہ تازہ تھا۔ گاندھی جی ستیہ گرہ کی تحریک شروع کررہے تھے۔ مسلم ممالک پر انگریز ظلم ڈھا رہے تھے۔ نذرالاسلام نے ارادہ کرلیا کہ اب وہ برٹش حکومت کے خلاف لڑیں گے اور قوم و ملک نیز ادب کی خدمت کریں گے۔

اپریل 1920 میں نذرالاسلام کا پہلا قسط وار ناول 'بندھن ہارا' (بندھنوں سے آزاد) رسالہ 'مسلم بھارت' میں شائع ہونا شروع ہوا۔ ناول کے ساتھ ان کی نظمیں بھی اِس رسالہ میں نیز دوسرے رسائل 'سوگت' (سوغات)، 'اُپاسنا' اور 'بجلی' میں اشاعت پذیر ہوئیں۔ ان نظموں میں 'بودھن' (افتتاح)، 'برہ بدھورا' (جدائی کے عذاب میں) 'سینہہ بھیتو' (محبت گزیدہ)، 'ہارامی' (جاس دل)، قربانی، محرم، شط العرب، فتویٰ دوازدہم وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ان تخلیقات نے ادبی حلقے کو بہت متاثر کیا۔ اسلامی موضوعات کی حامل نظموں کو مسلم حلقے میں پسند کیا گیا۔ 'شط العرب' میں عراق میں مقیم ایک بنگالی فوجی اپنے وطن اور عراق دونوں کی غلامی پر کفِ افسوس ملتا ہے۔ ظاہر ہے یہ فوجی کوئی اور نہیں خود شاعر ہے جو ہندوستان اور عراق دونوں کے بے دست و پا ہونے پر رنجور ہے اور غلامی کی بیڑیاں کاٹنے کے لیے جدوجہد کررہا ہے۔ یہ نظم نذرالاسلام کی ابتدائی نظموں میں ہے اور شاعر کے مستقبل کے سفر کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

1921 میں نذرالاسلام کی شاعرانہ سرگرمیاں عروج پر رہیں۔ ان کے گیتوں کی بڑی شہرت ہوئی۔ وہ اپنے گیت اور ٹیگور کے گیت گانے میں ماہر تھے۔ ان کی حیثیت ایک شاعر اور گلوکار کی تھی جس کی بدولت وہ ہندو گھرانوں میں بھی مقبول تھے۔ ان کے ساتھ دوسرے شاعر و ادیب مثلاً ستیند رناتھ دت، منی لال گنگولی، پریم انکورا تارتھی، موہت لال مجمدار وغیرہ قریب آگئے تھے۔ ہندوستان میں عوام آزادی کے متوالے ہورہے تھے۔ گاندھی جی کے وعدے کے مطابق 'سوراج' ایک سال میں ملنا تھا۔ سیاسی ہلچل بڑھتی جارہی تھی۔ انگریزوں نے گھبراہٹ کے عالم میں سیاسی تحریک پر روک لگانا اور کانگریس کی سرگرمیوں کو ختم کرنا ضروری سمجھا۔ گاندھی جی کے علاوہ دوسرے بڑے لیڈر حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، موتی لعل نہرو، چترنجن داس وغیرہ کو گرفتار کرلیا گیا۔ اِس پس منظر میں رسالہ 'بانگلار کتھا' کے لیے

> بنگلہ شاعری میں رابندرناتھ ٹیگور اور قاضی نذرالاسلام دو الگ دھاراؤں کی طرح ہیں۔ ٹیگور اُس وقت کی سیاسی تحریک سے پوری طرح مطمئن نہیں تھے اور نذرالاسلام اس تحریک کے صف اول کے شاعروں میں تھے۔ ٹیگور کو گاندھی جی کے نظریات عدم تعاون، مغربی تعلیم کا بائیکاٹ وغیرہ سے اتفاق نہیں تھا اور نذرالاسلام گاندھی جی کے ساتھ تھے۔

نذرالاسلام نے ایک گیت 'بھنگار گان' (بربادی کا گیت) لکھا جس میں ایک نئے باغیانہ مزاج کی عکاسی ملتی ہے۔

''کارار اوٹی لوہو کپاٹ، بھینگے پھل کرے لپٹ،
رکت حمت، شِکل پوجار پاشان بیدی'' (اس جیل کے آہنی دروازوں کو توڑدو۔ خوں میں نہائے پتھر کے اس چبوترے کو تہس نہس کردو جو بیڑیوں کی دیوی کی پوجا کے لیے بنایا گیا تھا)

اس گیت کی للکار نے قومی جذبات میں نئی روح پھونک دی۔ اس پر پابندی عائد کرنے کی بھی کوشش کی گئی۔ شاعر کا جوش اور جذبہ بڑھ چکا تھا۔ دسمبر 1921 کے آخری ہفتے میں انھوں نے اپنی مشہور زمانہ نظم 'بدروہی' (باغی) لکھی جس کی شروعات خون میں حدت اور روانی پیدا کردیتی ہے۔

''بولو بیر، بولو اُنتہ مموشیر..''

(بولو اے بہادر بولو۔ میرا سر اونچا ہے۔)

یہ ناقابل فراموش نظم رسالہ 'بجلی' کے 6 جنوری 1922 کے شمارے میں شائع ہوئی اور ہاتھوں ہاتھ لی گئی۔ یہ نظم عوام کے غیظ و غضب کا اظہار اور شاعر کے انکشاف ذات کا نیا وسیلہ بنتی ہے۔ جس طرح سودیشی تحریک کے دوران رابندر ناتھ ٹیگور اس کی پہچان تھے اسی طرح سوراج کی پہچان قاضی نذرالاسلام بن گئے۔ 1922 میں ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'بیتھر دان' (درد کی نذر) مارچ میں، مضامین کا مجموعہ 'یگ وانی' اکتوبر میں اور شعری مجموعہ 'اگنی بینا' (بربطِ آتش) اشاعت پذیر ہوئے۔ ان کے گیتوں کا مجموعہ 'بلبل' 1928 میں، چوکھیر چاتک (محبت کی ایک جھلک 1929 میں اور 'نذرل گیتیکا' (نذرل کے گیت) 1930 میں منظر عام پر آئے جنھوں نے پورے بنگال میں ایک منفرد گیت کار کی حیثیت سے ان کا سکہ منوالیا۔ 1942 تک ان کا تخلیقی سفر جاری رہا۔ 9 جولائی 1942 کو وہ کلکتہ ریڈیو اسٹیشن سے ایک تقریر نشر کررہے تھے کہ اچانک اپنی قوت گویائی کھو بیٹھے۔ اس کے بعد وہ کبھی پوری طرح صحت یاب نہیں ہوئے۔ آزادی کے اس سرگرم سپاہی اور جدید بنگال کے اہم ترین شاعر نے 29 اگست 1976 میں انتقال کیا۔

بنگلہ شاعری میں رابندرناتھ ٹیگور اور قاضی نذرالاسلام دو الگ دھاراؤں کی طرح ہیں۔ ٹیگور اُس وقت کی سیاسی تحریک سے پوری طرح مطمئن نہیں تھے اور نذرالاسلام اس تحریک کے صف اول کے شاعروں میں تھے۔ ٹیگور کو گاندھی جی کے نظریات عدم تعاون، مغربی تعلیم کا بائیکاٹ وغیرہ سے اتفاق نہیں تھا اور نذرالاسلام گاندھی جی کے ساتھ تھے۔ ٹیگور کی شاعری میں حسن پسندی اور جمالیات کا خاصا دخل ہے جب کہ نذرالاسلام کے خیالات باغیانہ اور انداز انقلابی ہے۔ ٹیگور کا تعلق زمین دار گھرانے سے تھا جب کہ نذرالاسلام محنت کش طبقے کے فرد تھے۔

اردو کے شعرا کے ساتھ نذرالاسلام کی فکر اور کلام میں موازنے کی کافی گنجائش ہے۔ علامہ اقبال جس طرح عالم اسلام اور اہل ہند کے مسائل کا ذکر کرتے ہیں، اس کا عکس یہاں بھی نظر آتا ہے۔ جوش ملیح آبادی، ساغر نظامی اور مولانا ظفر علی خاں کی انقلابی گھن گرج اِس باغی شاعر کی فطرت میں ہے۔ ہاں، بنگال سے باہر اس منفرد شاعر کی آواز کا سنا جانا ضروری ہے۔

□

Dr. Mohd Zahid
B-5, Garden Reech, Kolkata 24 (WB)

تسنیم بانو

دو متضاد راہوں کا مسافر مجاز

ہمارے شعرا گلشن شاعری کو ہمیشہ نئے رنگ و آہنگ بخشتے رہے ہیں۔ اسے زیب و زینت، نئی تازگی اور رعنائیاں عطا کرتے رہے ہیں۔ کبھی اسے نئی گلکاریوں سے مزین کرتے رہے، کبھی اس کی بہاروں میں اٹکھیلیاں کرتے رہے، کبھی اس کے پھولوں اور پتوں کو زمانے کے مزاج کے مطابق سجاتے رہے۔ کبھی اس میں معنی آفرینی کی چاشنی ڈالتے رہے تو کبھی اس میں دل کی شگفتگی، روح کی بیداری، اخلاقی استواری کی شمیم راحت افزا سے گلہائے بہاراں پیدا کرتے رہے۔ غرضیکہ دلکشی، دل نشینی اور اثر آفرینی سے گلشن شاعری کو رشک جناں بناتے رہے۔ اسی سلسلے کی کڑی میں ایک نیا مسافر بھی اس گلشن میں شہید بن کر قدم رکھتا ہے اور یوں گاتا چلا جارہا ہے:

مسافر یوں ہی گیت گائے چلا جا
سر رہ گزر کچھ سنائے چلا جا
تیری زندگی سوز و ساز محبت
ہنسائے چلا جا رلائے چلا جا
تیرے زمزمے ہیں خنک بھی تپاں بھی
لگائے چلا جا بجھائے چلا جا
کوئی لاکھ روکے کوئی لاکھ ٹوکے
قدم اپنے آگے بڑھائے چلا جا

(آہنگ، نظم مسافر، ص 75)

آخر یہ شہید نامی نیا مسافر کون ہے، جو متضاد عزم رکھتا ہے۔ اس کے تخیل کے پردے پر متضاد صورتیں کیوں قائم ہوئیں اور وہ اس متضاد راہ پر کیوں بے فکر گامزن رہنا چاہتا ہے۔ ان سوالات کے جواب کے لیے اس کی زندگی میں جھانک کر دیکھنا ضروری ہوجاتا ہے کیونکہ ہر شاعر اپنے خاندان اور ماحول کا پروردہ ہوتا ہے۔

جب اس کے خاندانی زندگی پر نظر ڈالی جاتی ہے تو ہم پاتے ہیں کہ اس کا خاندان عیش پرست اور آزاد طبعی میں مشہور تھا۔ جیسا کہ شاعر کی بہن حمیدہ سالم کی تحریر سے ثابت ہوتا ہے:

''کبھی خاندانی جنات دادا کسی کی دلہن اڑا لائے تھے۔ ایک منچلا لڑکا بار بار جاتا اور کہتا ''جنات دادا دلہن دکھاؤ'' جنات دادا آخر کو جھنجھلا اٹھے اور ایک کنکری اٹھا کر پھینکی جو اس لڑکے کے ماتھے پر لگی۔ اس وقت سے اس خاندان کی ہر نسل میں ایک دیوانہ پیدا ہونے لگا۔''

(بحوالہ نئی تنقید، نئے اقدار پروفیسر علی احمد، ص 134)

اقتباس بالا سے ثابت ہے کہ خاندانی و نسلی اعتبار سے شاعر آزاد طبع، مست اور وارفتہ رفتار ہے لیکن علم کی دولت، جید علما و شعرا کی صحبت نے شاعر کو دیوانہ سے فرزانہ بنا دیا۔ پھر بھی یہ دیوانگی اور فرزانگی کی متضاد کیفیت شاعر کے گوشۂ ذہن پر برابر قائم رہی اور وہ متضاد راہوں پر سفر کرتا رہا جس کا اقرار وہ بذاتِ خود کرتا ہے:

رشک صد ہوش ہے مستی میری
ایسی مستی ہے کہ ہشیار ہوں میں
دیر و کعبے میں میرے ہی چرچے
اور رسوا سر بازار ہوں میں
مجھ پہ برہم ہے مزاج پیری
مجرم شوخیِ گفتار ہوں میں
محفل دہر پہ طاری ہے سکوت
اور وارفتۂ رفتار ہوں میں

(آہنگ ص 54-53، نظم: تعارف)

مجاز ردولی کے ایک زمیندار گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ اکتوبر 1911 میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد دو بھائی تھے۔ ان کے چچا لاابالی طبیعت کے عیش پرست اور رنگین مزاج تھے جب کہ ان کے والد سنجیدہ مزاج، حقیقت پسند، کم سخن اور پڑھے لکھے انسان تھے، ان کی والدہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ نہایت ذہین، شوقین مزاج، تفریح پسند مگر اَن پڑھ تھیں۔ والد نوکری کرتے تھے۔ گھر پر ماں کی تربیت، لاڈ و پیار اور چچا کی صحبت کے اثر نے مجاز کو رنگین مزاج، عیش و طرب کا دلدادہ اور ضدی طبیعت کا فرد بنا دیا اور یہ اثر ان پر زیادہ رہا لیکن باپ کے نسلی اخلاق، نیک نیتی، حقیقت پسندی کا جوہر بھی مجاز کے ذہن ناطق پر اثر انداز ہوا جیسا کہ شاعر کی بہن حمیدہ سالم لکھتی ہیں:

''باپ کی طرف سے نیک نیتی، کم سخنی، حقیقت پسندی اور طبیعت میں گہرائی پائی، ماں کی طرف سے طبیعت میں حسن پرستی، زود حسی اثر پذیری اور جذباتیت ملی۔''

(بحوالہ نئی تنقید نئے اقدار، ص 134 پروفیسر علی احمد فاطمی)

1929 میں مجاز کا داخلہ آگرے کے سینٹ جانس کالج میں ہوا۔ گھر کے ماحول سے حسن و نشاط کا شیدائی مزاج لے کر آنے والے مجاز کو یہاں شعری اور ادبی ماحول پورے لوازمات کے ساتھ سرگرم ملا۔ تنہائی کا عالم، آزادی کے ماحول نے انھیں بے راہ روی کا راستہ دکھایا۔ پوری پوری رات مشاعروں کی محفلیں اور دوستوں کی صحبتیں، خود بینی و خود آرائی کے جذبے نے مجاز کو رومانی شاعر بنا دیا اور یہ وقت کا تقاضا بھی تھا کیونکہ علی گڑھ

تحریک کے عقلیت پسندی سے تنگ آ کر ادب میں بغاوت کی صورت پیدا ہو چکی تھی جس کے امام حسرت موہانی اور سجاد حیدر یلدرم تھے۔ یہ رومانی شاعری جذبۂ تخیل اور فطرت سے وابستگی پر زور دیتے ہوئے نشاط پرور فضا میں سیر کراتی ہے۔ غرضیکہ اپنے ذوق وشوق میں دوبالا ہو کر شاعر رومان کی راہ پر چل پڑتا ہے اور اپنی پہلی رومانی غزل انجمن اردوئے معلیٰ کے جلسے میں پڑھتا ہے اور داد و تحسین کا حقدار ہوتا جس کا مطلع اور چند اشعار یوں ہے:

یوں ہی بیٹھے رہو بس درد دل سے بے خبر ہو کر
بنو کیوں چارہ گر تم کیا کرو گے چارہ گر ہو کر
دکھا دے ایک دن اے حسن رنگین جلوہ گر ہو کر
وہ نظارہ جو ان آنکھوں میں ہو جائے نظر ہو کر
دل سوز آشنا کے جلوے تھے جو منتشر ہو کر
فضائے دہر میں چمکا کیے برق و شرر ہو کر

(آہنگ، ص20)

اس غزل پر شاعر کو انجمن کی طرف سے گولڈ مڈل ملا جس سے شاعر کا ذوق وشوق دوبالا ہو گیا اور وہ پوری مستعدی سے عشقیہ انداز میں غزلیں کہنے لگا۔

شاعر کے نام پر غور کریں تو بھی دو متضاد صورتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ غالباً باپ کی سنجیدہ مزاجی اور حقیقت پسندی نے شاعر کو اسرارالحق کا نام دیا ہوگا جب کہ والدہ کی تربیت، چچا کی عیش پسندی اور خود کی رنگین مزاجی نے ہی شاعر کو پہلے شہید اور پھر مجاز نام رکھنے پر آمادہ کیا ہوگا۔ یہ بات اس واقعے سے بھی ثابت ہوتی ہے کہ جب لوگوں نے جذبی اور مجاز سے حالات حاضرہ پر سیاسی نظم لکھنے کی فرمائش کی تو جذبی نے بغیر چوں چرا قلم اٹھائی اور 'اے سپاہی کھینچ اپنی خوں فشاں تلوار کو' نظم لکھ دی۔ مگر طبیعت پر رومان پسندی کے غلبے کے سبب مجاز خاموش رہے اور بعد کو اپنی نظم 'آج بھی' لکھ دی:

میں ہوں مجاز آج بھی زمزمہ سنج و نغمہ خواں
شاعر محفل وفا، مطرب بزم دلبراں
آج بھی خارزار غم خلدِ بریں میرے لیے
آج بھی رہ گزار عشق میرے لیے ہے کہکشاں
آج بھی گا رہا ہوں ساز جنوں لیے ہوئے
سوز نہاں سے آج بھی روح تپاں سے دل تپاں

(آہنگ، ص127)

اس طرح ورثے میں ملی رنگین مزاجی، آگرے کی روح پرور فضا، غنائیت کے جوہر، عنفوان شباب کا زمانہ تنہائی کا عالم آزادی طبعی و وارفتگی، شعرا کی صحبت اور رومانیت کی تیز اور تند ہوائے دلنشیں، داد و تحسین کا ملنا ان سب وجوہات نے مل کر مجاز کو رومانیت کی راہ پر گامزن کیا۔ شاعر نے اپنی زیادہ رومانی غزلیں اسی دور میں کہیں۔

غزل کے علاوہ رومانی انداز میں کہی گئی نظمیں بھی ان کی شاعری کے حریم میں داخل ہو گئیں۔ جن میں 'طفلی کا خواب'، 'نذر دل'، 'جشن'، 'نورا'، 'کس سے محبت'، 'ایک غمگین یاد'، 'آج کی رات' وغیرہ بہت مقبول ہوئیں۔ ان نظموں میں ان کی رومان پسندی کا منفرد اور دلکش انداز دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس سلسلے میں منفرد چند اشعار ملاحظہ ہوں:

میں قسم کھاتا ہوں اپنے نطق کے اعجاز کی
تم کو بزم ماہ و انجم میں بٹھا سکتا ہوں میں
سر پہ رکھ سکتا ہوں تاج کشورِ نورانیاں
محفل خورشید کو نیچا دکھا سکتا ہوں میں

(آہنگ، ص59)

شاعر رومان اپنا تعارف بھی اُسی انداز میں کراتا ہے:

خوب پہچان لو اسرار ہوں میں
جنس الفت کا طلب گار ہوں میں
عشق ہی عشق ہے دنیا میری
فتنۂ عقل سے بیزار ہوں میں
خواب عشرت میں ہیں ارباب خرد
اور ایک شاعر بیدار ہوں میں

(آہنگ، ص53)

جب شاعر نے جنس الفت کا طلب گار ہونے اور اپنے رومانی راہ پر چلنے کا برجستہ اعلان کر ہی دیا تو اس کا رومانی شاعر ہونا ثابت ہو جاتا ہے۔

اگرہ کے سینٹ جونس کالج میں دوستوں کے ساتھ (مجاز بائیں سے دوسرے)

آگرے میں شاعر نے شعر و شاعری کے میدان میں کامیابی کی منزل طے تو کی لیکن تعلیم کے میدان میں فیل ہونے کے سبب انھیں علی گڑھ بلا لیا گیا۔ اس طرح جہاں آگرے میں شاعر ارباب خرد کے ساتھ خواب عشرت میں ڈوبا ہوا تھا وہیں علی گڑھ دانش گاہ پہنچ کر شاعر بیدار ہونے لگتا ہے اور زمانے کا مشاہدہ و مطالعہ کرتا ہے۔ ایک طرف روسی انقلاب، چین و ہندوستان کی ہڑتالیں، مفلس و مزدور کی جراتیں شاعر کے ذہن پر اثر ڈالتی ہیں تو دوسری طرف سجاد ظہیر اور رشید جہاں وغیرہ اور ان کے شائع شدہ انگارے ان کے دل کو گرماتے ہیں اور علی گڑھ کے ہمعصر دانشور اور ارباب خرد کے تبادلۂ خیال کے اثرات سے شاعر قومی اور عالمی سطح پر انسانی زندگی اور اس کے مسائل پر غور کرنا شروع کرتا ہے۔ اس طرح اس کی ادبی زندگی میں سیاسی اور سماجی شعور روشن ہونے لگتا ہے۔ جیسا کہ ان کی بہن حمیدہ سالم لکھتی ہیں:

''علی گڑھ کے قیام کا دور جگن بھیا (مجاز) کی ادبی زندگی اور سیاسی، سماجی شعور کا روشن ترین دور ہے۔''

(بحوالہ: ترقی پسند شعری و فکری رویے، نفیس بانو، ص85)

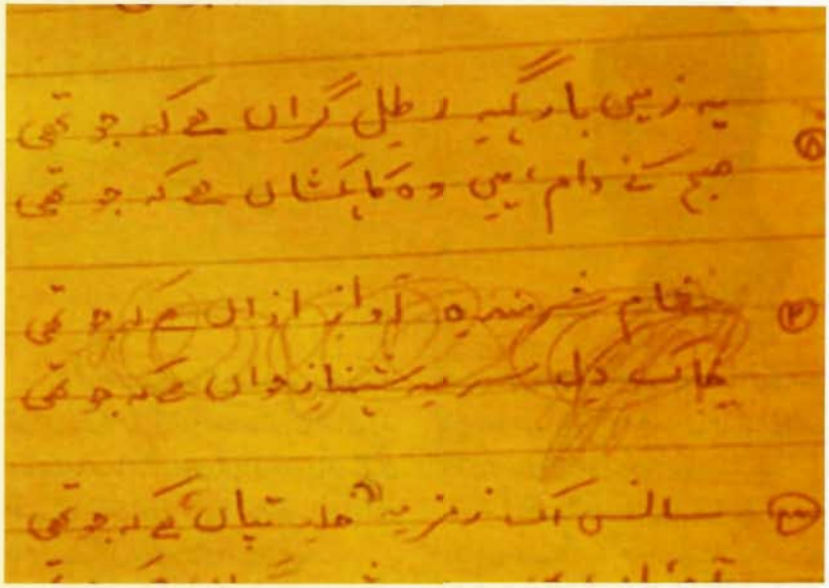

مجاز کی ڈائری کا ایک صفحہ

انھیں وجوہات کے سبب شاعر حقیقت پسندی کی جانب مائل ہوتا ہے اور دوسری راہ پر چلنے کا اعلان یوں کرتا ہے:

یہ جا کر کوئی بزم خوباں سے کہہ دے
کہ اب درخور بزم خوباں نہیں میں
مبارک تمھیں قصر ایواں تمھارے
وہ دلدادۂ قصر ایواں نہیں میں
جوانی بھی سرکش محبت بھی سرکش
وہ زندانیِ زلف پیچاں نہیں میں

(آہنگ، ص114)

غرضیکہ شاعر کے فکر ونظر پر سیاسی وسماجی شعور روشن ہوتا ہے تو وہ آزادی کا راز اور بیداری کا ساز تلاش کرتا ہے اور کہہ اٹھتا ہے:

ہاں بتا دے ہم کو بھی اے روح ارباب نیاز
کس طرح مٹتا ہے آخر رنگ و خوں کا امتیاز
دل پر کیونکر فاش ہوجاتے ہیں آزادی کے راز
چھیڑتے ہیں کس طرح محفل میں بیداری کے ساز
تیری آنکھوں میں سرور عشرت جمہور ہے
آہ یہ جوہر ہماری دسترس سے دور ہے

(آہنگ، ص39)

اور اس طرح شاعر حقیقت پسندی کی راہ پر گامزن ہوتا ہے جس کی نشان دہی نفیس بانو کے خیال میں یوں ہوتی ہے:

''بہرحال عمر کا تقاضا انھیں رومان پرور راہوں پر لے گیا اور وقت کی پکار انھیں انقلابیوں کی جھرمٹ میں لاکر اس طرح کھڑا کردیتی ہے کہ وہ دور سے پہچان لیے جاتے ہیں۔''

(ترقی پسند شعری وفکری رویے، نفیس بانو، ص93)

اور شاعر کہنا شروع کردیتا ہے:

چھوڑ دے مطرب بس اب واللہ پیچھا چھوڑ دے
کام کا یہ وقت ہے کچھ کام کرنے دے مجھے

(آہنگ، ص46)

اب شاعر کی نظر مفلس ونادار اور دردر مارے پھر رہے غریب عوام کی طرف اٹھتی ہے اور وہ پکار اٹھتا ہے:

آخر زمانہ ان کو ستائے گا کب تلک
کب سے جلا رہا ہے جلائے گا کب تلک
کب سے مٹا رہا ہے مٹائے گا کب تلک
اُن کے لہو کو جوش نہ آئے گا کب تلک
مایوسیوں کی تہہ میں جنوں خیزیاں بھی ہیں
افلاس کی سرشت میں خوں ریزیاں بھی ہیں

(آہنگ نظم خانہ بدوش، ص58)

یہی نہیں حقیقت کا ترجمان شاعر دین کی رہنمائی کے پردے میں ہونے والے قومی استحصال پر بھی بے باکانہ طور پر آواز اٹھاتا ہے:

رہبری جاری رہی پیغمبری جاری رہی
دین کے پردے میں جنگ زرگری جاری رہی

شاعر کی حقیقت پسندی کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ وہ اپنی برائیوں کو بھی نہیں چھپاتا ہے اور اس کا برجستہ اعلان کرتا ہے۔ وہ دو فروری سن 45 میں جب الہ آباد کا سفر کرتا ہے تو کہتا ہے:

الہ آباد میں ہر سو ہیں چرچے
کہ دلی کا شرابی آگیا ہے
بصد آوارگی باصد تباہی
بصد خانہ خرابی آگیا ہے
یہاں کے شہر یاروں کو خبر دو
کہ مردِ انقلابی آگیا ہے

اس مرد انقلابی نے اپنی ایک مشہور نظم 'انقلاب' لکھی ہے لیکن اس میں نعرہ بازی نہیں بلکہ حقیقت پسندی کا اظہار ملتا ہے جب کہ ان کے پیش رو جوش کا 'انقلاب' سیاسی نعرہ بازی کے قریب تر ہے جیسا کہ فیض احمد فیض لکھتے ہیں۔ مجاز انقلاب کا ڈنڈھورچی نہیں انقلاب کا مطرب ہے۔ اس کے نغمے میں برسات کے دن کی سی سکون بخش خنکی ہے اور بہار کے رات کی سی گرم جوش تاثر آفرینی!''

(دیباچہ، آہنگ، ص18)

جہاں جوش خود کو انقلاب کا نقیب اور پیغمبر سمجھتے ہیں وہیں مجاز عوام اور مزدور کو انقلاب کا بانی ورہبر سمجھتے ہیں۔ جو حقیقت ہے۔ مثال کے طور پر۔ جوش کہتے ہیں:

قسم اُس جوش کی جو ڈوبتی نبضیں ابھارے گا
کہ اے ہندوستاں جس وقت تو مجھ کو پکارے گا
میری تیغ رواں باطل کے سر پر جگمگائے گی
تیرے ہونٹوں کی جنبش ختم بھی ہونے نہ پائے گی

(مجاز حیات اور شاعری، منظر سلیم، ص163)

اور مجاز کہتے ہیں:

بڑھ رہے ہیں دیکھ وہ مزدور دراتے ہوئے
اک جنوں انگیز لے میں جانے کیا گاتے ہوئے
بھوک کے مارے ہوئے انساں کی فریادوں کے ساتھ
فاقہ مستوں کی جلوں میں خانہ بربادوں کے ساتھ
ختم ہوجائے گا یہ سرمایہ داری کا نظام
رنگ لانے کو ہے مزدوروں کا جوش انتقام

(آہنگ، ص48)

اس طرح شاعر دو متضاد راہوں کا مسافر ہے، اور اپنی لے میں یوں گاتا ہوا جلا جاتا ہے:

فضا میں موت کے تاریک سائے تھرتھراتے ہیں
ہوا کے سرد جھونکے قلب پر خنجر چلاتے ہیں
گزشتہ عشرتوں کے خواب آئینہ دیکھاتے ہیں
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

(آہنگ اندھیری رات کا مسافر، ص76)

Tasneem Bano, Research Scholar, Dept of Urdu, Allahabad University, Allahabad (UP)

عبدالعزیز سہیل

تہذیبی روایات کا امین محمد قلی قطب شاہ

پیا باج پیالا پیا جائے نا
پیا باج یک تل جیا جائے نا

اردو زبان کے آغاز اور ارتقا کے بعد جس شاعر کو اردو زبان کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہونے کا اعزاز حاصل ہے وہ دراصل محمد قلی قطب شاہ جو گولکنڈہ کا پانچواں حکمراں تھا، 1565 میں گولکنڈہ میں پیدا ہوا اور 1580 میں تخت نشین ہوا۔ جبکہ اس کی عمر صرف 14 سال کی تھی شہر حیدرآباد اور چارمینار دراصل محمد قلی قطب شاہ کی یادگار ہے۔ اس نے ہی حیدرآباد جیسے بہترین اور مثالی گنگا جمنی تہذیب وتمدن کے شہر کی بنیاد رکھی۔ قلی قطب شاہ اردو زبان اور شعر وادب کا زبردست چاہنے والا تھا۔ وہ ایک قادرالکلام شاعر تھا۔ اس کے کلیات میں پچاس ہزار اشعار ملتے ہیں۔ قلی قطب شاہ کا دیوان گنگا جمنی تہذیب کا علمبردار اور ہندو مسلم اتحاد کی عظیم تر تہذیبی روایات کا امین و پاسدار ہے جس کا تذکرہ بعد کے آنے والے محققین ڈاکٹر زور اور پروفیسر سیدہ جعفر وغیرہ نے قلی قطب شاہ سے متعلق اپنی تحقیق میں کیا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کی ادبی خدمات سے متعلق ڈاکٹر زور رقمطراز ہیں:

''محمد قلی قطب شاہ اردو زبان وادب کا محسن اعظم تھا۔ اس نے اس زبان کی ایسے وقت میں دستگیری کی جبکہ وہ اس کی بہت محتاج تھی۔ محمد قلی نے اردو شاعری پر وہ احسان کیا ہے جو بعد کے کسی بادشاہ یا شاعر یا ادیب سے نہ ہوسکا۔ اس نے نہ صرف اردو شاعروں اور فنکاروں کی قدرافزائی کی بلکہ خود بھی اس کا ایسا رسیا بن گیا کہ اس زبان میں پچاس ہزار شعر لکھے۔ اس کے اردو کلام کی وسعت وہمہ گیری سے پتہ چلتا ہے کہ کاروبار سلطنت کے بعد اگر اس کو کسی چیز سے دلچسپی تھی تو وہ اردو شعر وسخن ہی تھا۔ یہ کوئی تعجب کی بات بھی نہ تھی۔ شاعری ہی عشق ومحبت کے جذبات اور عیش وعشرت کے تخیلات کی بہترین ترجمانی کرسکتی تھی۔''

(ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، محمد قلی قطب شاہ، اردو بنیادی کورس، مانوس 119 تا 120)

محمد قلی قطب شاہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر تھا، جس نے شاعری کی تمام اصناف میں طبع آزمائی کی۔ اردو کے ساتھ ساتھ تلگو زبان میں بھی شاعری کی۔ محمد قلی قطب شاہ بنیادی طور پر غزل کا شاعر تھا۔ اس کی اردو شاعری سے متعلق پروفیسر محمد علی اثر لکھتے ہیں:

''محمد قلی کی شاعری کا ایک نمایاں وصف سادگی بیان ہے وہ اپنے جذبات اور تجربات زندگی کو سادگی کے ساتھ پیش کرنے کا عادی ہے۔ محمد قلی نے مختلف موضوعات پر مسلسل اور مربوط غزلیں کہی ہیں جن میں بڑی دیانتداری کے ساتھ اپنی نجی زندگی کی تفصیلات پیش کی ہیں اس کا کلام گویا اس کی زندگی کا آئینہ دار ہے جس میں اس کے رنگارنگ واقعات حیات کی ترجمانی ملتی ہے۔''

(پروفیسر محمد علی اثر، دکنی ادب، تاریخ اردو زبان وادب ص 68)

محمد قلی قطب کی شاعری کا خصوصی وصف سادگی کلام ہے۔ اس نے اپنی شاعری میں جذبات اور تجربات زندگی کو پیش کیا ہے۔ اس کی شاعری کا مزاج اور ماحول خالص ہندوستانی ہے۔ قطب شاہی سلطنت کا دور اردو زبان و ادب کے ارتقا میں غیر معمولی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کے دربار کا ملک الشعرا عظیم المرتبت شاعر اسد اللہ وجہی تھا۔ محمد قلی قطب شاہ کے درباری شعرا میں وجہی اور غواصی نے خوب نام کمایا۔ وجہی کی تصانیف میں قطب مشتری، سب رس اردو فارسی دیوان کافی اہمیت کے حامل تھے جس کی وجہ سے اردو ادب کی بنیادیں مضبوط ہوئیں۔ اس کی طبع زاد مثنوی قطب مشتری ایک بے مثال تصنیف ہے وجہی کی شاہکار تصنیف سب رس ہے جو کہ قدیم اردو نثر میں اولیت رکھتی ہے۔ محمد قلی قطب شاہ نے 32 سال تک نہایت ہی شان وشوکت کے ساتھ حکمرانی کی اور اہل کمال کی قدردانی کی اور خود بھی اردو زبان میں شعر کہے اور 50 ہزار اشعار اپنے ادبی ذخیرے کے طور پر چھوڑا 1611 میں انتقال ہوگیا۔

محمد قلی قطب شاہ بڑا ہی علم دوست اور ادب نواز تھا۔ اس کو عربی، فارسی اور تلگو میں مہارت حاصل تھی اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر تھا۔ اس کی شاعری میں خصوصی محاوروں کا استعمال بہت زیادہ پایا جاتا ہے۔

محمد قلی قطب شاہ کو ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اردو زبان وادب کا محسن اعظم قرار دیا ہے محمد قلی قطب شاہ کی غزلیں تمام اصناف سخن میں مقبولیت رکھتی ہیں جس کی اہم وجہ اس کی غزلوں میں ہندی اثرات اور صنف نازک کی جانب سے محبت کے اظہار کا حسین امتزاج نظر آتا ہے اس کی غزلوں میں جذبات کی بے ساختگی اور ساتھ ہی دردوغم بھی پایا جاتا ہے اس نے غزلوں کے موضوعات میں اضافہ کیا ہے۔ محمد قلی کی غزل کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

تیری الفت کا میں سرمست ہوں متوالا ہوں پیارے
نہیں ہوتا بجز اس کے کسی مے کا اثر مجھ کو

محمد قلی قطب شاہ کی غزلوں کے موضوعات میں بڑا تنوع اور کلام میں رنگارنگی پائی جاتی ہے۔ اس نے غزلوں کے علاوہ بہترین نظمیں بھی لکھیں۔ اس کی نظموں کے موضوعات میں ہلال عید، ترکاری، پھل پھول، رسوم، شادی بیاہ اور مذہبی تہواروں پر بھی بہترین نظمیں ملتی ہیں اس کی نظموں کے اردو کلام کو نیچرل شاعری سے تشبیہ دی جاتی ہے کلام کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے اپنی شاعری میں ہندوستانی تہذیب وتمدن اور دکن کے علاقے کی کیا خوب پیکر تراشی کی ہے۔

محمد قلی قطب شاہ کی شاعری میں ہندوستانی عناصر جس میں کھیل، موسم، محلات شاہی، تہوار وغیرہ کے متعلق اشعار ملتے ہیں اس کے کلام کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ کلام میں حب الوطنی، قوم پرستی اور قومی یکجہتی اور علاقہ دکن سے متعلق رجحانات پائے جاتے ہیں ساتھ ہی دکنی تہذیب کے نمایاں خدوخال نظر آتے ہیں۔

محمد قلی قطب شاہ کے ہندوستانی مزاج سے متعلق سیدہ جعفر رقمطراز ہیں

''دکن کے رسوم وعقائد یہاں کے رہن سہن وضع قطع اور پوری سماجی وتہذیبی زندگی کے مرقعے محمد قلی کی

شاعری میں نظر آتے ہیں۔ مذہبی اور لسانی اختلافات کے باوجود ہندوستانیوں کی سماجی زندگی میں ایک وحدت نظر آتی ہے۔ محمد قلی نے اسی تہذیبی وحدت کا اپنے اشعار میں اظہار کیا ہے۔ اس کی شاعری کا اصل مزاج ہندوستانی ہے یہی وجہ ہے کہ وہ وطنیت اور قومی یکجہتی کے جذبے سے سرشار نظر آتا ہے۔''

(سیدہ جعفر، کلیات محمد قلی قطب شاہ ص 127)

محمد قلی قطب شاہ نے تہذیبی روایات کے فروغ کے سلسلے میں سنجیدہ کوشش کی ہے اس نے اپنی شاعری کے ذریعے تہذیبی عناصر کی بھرپور عکاسی اپنے کلام میں کی ہے اس نے اپنے شاعری میں ہندوستانی فضا کی بھرپور نمائندگی کی ہے ساتھ ہی اپنے عہد کی تہذیبی روایات کو اجاگر کیا ہے جس میں رہن سہن، لباس، زیورات، طرز معاشرت اور ثقافت سے متعلق معلومات اپنے کلام میں پیش کی ہے۔ ہندوستانی تہذیب کی ایک جھلک قلی قطب شاہ کے اس شعر میں ہمیں نظر آتی ہے۔

پلک کانٹے نین باندیا نہ جاوے خیال تیرے کن
رقم اس خیال موپیشانی کوں سندوا کر ساتی

محمد قلی قطب شاہ ہی وہ پہلا شاعر ہے جس کے کلام میں ہمیں اپنے دور کی تہذیب کی نمایاں چھاپ نظر آتی ہے ایک طرف وہ اپنے کلام میں تہواروں کا تذکرہ کرتا ہے تو دوسری طرف یہاں کے پھل پھول اور ترکاریوں سے اپنے کلام میں ہندوستانی تصویر کشی کرتا ہے۔ ساتھ ہی کھیل کود کا ذکر بھی ہمیں ان کے کلام میں ملتا ہے حالانکہ ہمارے یہاں دور حاضر میں مزاحیہ شاعری میں کھیلوں کا تذکرہ ہوتا ہے لیکن سنجیدہ شاعری میں اس طرح کی باتیں پیش نہیں کی جاتی۔ کھیل سے متعلق قلی قطب شاہ کا یہ شعر دیکھیں:

ہوتا آنند خوشحال سب نت گائے ناٹک سال سب
بجتے طنبورے تال سب منڈل کے دھکارے اسمیں

مرگ کو علاقہ دکن میں موسم برسات کے آغاز کے طور پر تہوار کی طرح منایا جاتا تھا جس کی عکاسی محمد قلی قطب شاہ نے اپنے اس شعر میں کی ہے:

مرگ سال آیا پھر تھے مرگ نین سنگاراں کر
جڑت مانگ بہوٹیاں لعل موتیاں لیک

موسم سرما سے متعلق محمد قلی قطب شاہ کا یہ شعر دیکھیں:

ہوا آتی ہے لے کر ٹھنڈ کالا
پیا بن سنتا تامدن بالے بالا
تن ٹھنڈت لرزت جو بن گرجت
پیا مکھ دیکھت کنچلی کس کہتے آج

بسنت سے متعلق یہ شعر:

بسنت باس چن چن کے چنزی بند ہے
جواہر کے لہراں سوں آیا بسنت

ہندوستانی ساڑی جو کہ خواتین کا لباس ہے اس کے متعلق قلی قطب شاہ کا یہ شعر:

عشق بول اپ چھاتی میا نے لکھائی
کہ نکھ چین چن چین باندھی ہے ساری

زیورات سے متعلق یہ شعر:

دن دنا گرجے جوبن بادل ممن
کنگناں جھلکار منج سناوتم

محمد قلی قطب شاہ کی شاعری ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کا بہترین نمونہ ہے۔ سیدہ جعفر نے کلیات محمد قلی قطب شاہ میں قلی کے کلام میں ہندوستانی کلچر سے متعلق لکھا ہے:

محمد قلی قطب شاہ کے کلام میں حب الوطنی اور قوم پرستی کی نمایاں جھلک نظر آتی ہے ساتھ ہی ہندوستانی اور خصوصی دکنی کلچر کی بہترین نمائندگی ہمیں محمد قلی کے کلام میں ملتی ہے۔ اس کے کلام کے موضوعات سے ہی ہندوستانی کلچر کے عناصر کی نشاندہی ہوتی ہے ساتھ ہی تہذیبی پس منظر بھی اجاگر ہوتا ہے۔

''ہندوستانی معاشرت، ہندوستانی طرز زندگی، یہاں کے رسم و رواج اور ثقافتی میلانات محمد قلی کے طرز وفکر میں اتنے رچ بس گئے تھے کہ جگہ جگہ یہ عناصر اس کے کلام میں اپنا پرتو دکھاتے رہتے ہیں۔'' (ص 128)

ہندوستانی خواتین عیدوں تہواروں کو خوشی کے موقعوں پر مہندی ہاتھوں پر لگاتی ہیں اس کی کتنی خوبصورت تصویر قلی قطب شاہ نے اپنی شاعری میں کی ہے:

رنگیلی مہندی ہت ہور پاؤں لاکر
کندن کلیاں کے ہاراں خوش گندایا
بند مہندی کے ہاتاں منے گل لال جوں پاتاں منے
موتی جھڑیں باتاں منے جھل تھے سمندر کھارے رہیں

قلی قطب شاہ کی شاعری میں ہندوستانی موسیقی کا بھی ذکر ملتا ہے۔ ہندوستانی ساز سے متعلق یہ شعر:

مرے سنگ مل بجاتی شنکھ گاتی اسنگھر اا بھرن
سری داگاں جو گاتی استری توں منکھوں بھاتی ہے

محمد قلی قطب شاہ کے کلام میں اس تہذیبی رنگارنگی کو دیکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ اس کی شاعری ہندوستان کی کثرت میں وحدت کی تہذیبی خصوصیت کی علمبردار ہے۔ اور اس سے ہر زمانے میں ہندوستان میں قومی یکجہتی کے فروغ کے لیے کام لیا جاسکتا ہے۔ سلیمان اطہر جاوید اپنے مضمون محمد قلی قطب شاہ کی شاعری میں ہندوستانی عناصر میں محمد قلی قطب شاہ کی شاعری کو ہندوستانی تہذیبی و قومی یکجہتی کے لیے مشعل راہ قرار دیا ہے وہ لکھتے ہیں:

''اردو ادب میں کلام محمد قلی قطب شاہ کی تاریخی اہمیت ہے اور اس سے زیادہ تہذیبی... ہندوستان کا تہذیبی منظر نامہ اس کے کلام میں جھلکتا ہے... آج بھی اگر ہم ہندوستانی تہذیبی یکجہتی کے خواب کی تعبیر پانا چاہتے ہیں تو محمد قلی قطب شاہ کا کلام ہماری رہنمائی کرسکتا ہے۔''

(سلطان محمد قلی قطب شاہ، مرتبہ اسلم پرویز، ص 292-293)

محمد قلی قطب شاہ کے کلام میں حب الوطنی اور قوم پرستی کی نمایاں جھلک نظر آتی ہے ساتھ ہی ہندوستانی اور خصوصی دکنی کلچر کی بہترین نمائندگی ہمیں محمد قلی کے کلام میں ملتی ہے۔ اس کے کلام کے موضوعات سے ہی ہندوستانی کلچر کے عناصر کی نشاندہی ہوتی ہے ساتھ ہی تہذیبی پس منظر بھی اجاگر ہوتا ہے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ دکنی زبان سے واقفیت کے اس دور میں دکنی زبان کے ماہرین محمد قلی قطب شاہ کے دکنی کلام کا آسان اردو میں ترجمہ کریں یا اس کے موضوعات کو مضامین کی شکل میں پیش کریں تو محمد قلی کے کلام میں موجود تہذیبی روایات اور ورثے کا تحفظ ہوسکتا ہے اور دکنی زبان سے ناواقف نئی ہندوستانی نسل اس کام سے محمد قلی کے پیغام کو سمجھ سکتی ہے۔

حواشی:

(1) ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، محمد قلی قطب شاہ، اردو بنیادی کورس، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی ص 119 تا 120
(2) پروفیسر محمد علی اثر، دکنی ادب، تاریخ اردو زبان وادب، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد، ص 68
(3) سیدہ جعفر، کلیات محمد قلی قطب شاہ، ترقی اردو بیورو نئی دہلی، ص 127
(4) سلطان محمد قلی قطب شاہ، مرتبہ اسلم پرویز، انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی، ص 292-293

Mohd Abdul Azeez Suhail, Research Scholar (Ph.D), Usmania University, House No.: 4-2-75, Majeed Manzil, Lateef Bazar, Nizamabad - 503001 (AP)

اشرف استھانوی

غلام سرور کی 88 ویں یومِ ولادت پر خصوصی تحریر

اردو کو آج بھی ہے غلام سرور کی ضرورت

غلام سرور ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جس سے سارا ملک واقف ہے۔ ان کی شخصیت کثیر الجہات تھی وہ بیک وقت بے باک صحافی، شعلہ بیان مقرر ممتاز سیاست داں، بے لوث سماجی خدمت گار اور عظیم مجاہد اردو تھے اور ان کی ہر حیثیت میں ایک نمایاں شناخت تھی اہل علم کے لیے یہ فیصلہ کرنا آج بھی مشکل ہے کہ وہ صحافی بڑے تھے یا مقرر، سیاست داں کی حیثیت سے ان کا قد اونچا تھا یا سماجی خدمت گار اور مجاہد اردو کے طور پر۔ لیکن ایک بات بالکل صاف ہے کہ ان کی شخصیت آئینہ کی طرح شفاف تھی، وہ حق پسند اور حق گو تھے اور حق کی آواز بلند کرنے سے نہیں چوکتے تھے ان کی حق گوئی اور حق پسندی نے ہی انھیں ایک کامیاب صحافی، سیاست داں، سالار اردو، شیر بہار اور نہ جانے کیا کیا بنا دیا۔

غلام سرور کی پیدائش 10 جنوری 1926 کو بیگوسرائے میں ہوئی تھی۔ غلام سرور ایک خوشحال گھرانے سے تعلق رکھنے والے اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان تھے ان کے لیے روزگار کے ذرائع مشکل نہ تھے لیکن انھوں نے مشکل راہ چنی اور یہی چیز انھیں بڑا انسان بناتی ہے انھوں نے اردو صحافت کو گلے لگایا جو آج کی طرح نفع بخش نہیں تھی خصوصاً اس صورت میں جب اخبار کا ایڈیٹر یا مالک اپنے اصولوں سے سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار نہ ہو، یہ بڑا ہی گھاٹے کا سودا ہوتا ہے ایک موقع پر انھوں نے خود ہی کہا تھا کہ میں صحافت کی خار دار وادی میں اپنا سب کچھ لٹا بیٹھا ہوں۔ اس لیے اب کسی کو اس دشت کی خاک چھاننے کا مشورہ نہیں دیتا ہوں۔ بلکہ روکتا ہوں۔ میں تو جان چکا ہوں کہ پریت کرکے دکھ ہوتا ہے۔ اس لیے ڈھنڈھورا پیٹ کر کہتا ہوں کہ پریت نہ کریو کوئی۔ سرور صاحب دانا پور کنٹونمنٹ بورڈ سے قانون ساز اسمبلی کی رکنیت اور پھر قانون ساز اسمبلی کی صدارت کے علاوہ وزارت تعلیم اور وزارت زراعت تک کی ذمے داری سنبھالیں اور جہاں بھی رہے اپنی شان کج کلاہی قائم رکھی۔ لیکن خود کو وہ آخری دم تک صحافی ہی مانتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کا بنیادی پیشہ صحافت ہی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ انھوں نے ہر جگہ اور اپنی ہر حیثیت میں خدمت خلق کے عظیم فریضے کی ادائیگی کی کوشش کی ہے اور خدمت خلق کو ہی اپنا شعار بنایا ہے۔ پھر چاہے وہ صحافت ہو یا سیاست انھوں نے خدمت خلق کا سلسلہ جاری رکھا ہے۔ دانا پور کنٹونمنٹ کے لیے جس وارڈ سے ان کا انتخاب ہوا اس وارڈ میں اکثریت نچلے اور متوسط طبقے کے لوگوں کی تھی اور شروع سے یکسر نظر انداز تھی۔ ممبر بننے کے بعد غلام سرور نے پہلی بار سڑک، نالی، بجلی، پانی اور اسکول کی طرف توجہ دی، انجمن ترقی اردو بہار کے جنرل سکریٹری، بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کے روح رواں ساتھی اور سنگم کے بانی پروپرائٹر اور ایڈیٹر کی حیثیت سے اردو کے حق میں دستخطی مہم چلائی اور ایسے حالات پیدا کیے اور 1967 میں پہلی بار بہار سے 1977 میں پہلی بار ملک سے کانگریس راج کا خاتمہ ہو گیا۔ 1967 کے انتخاب میں غلام سرور نے جو اپنے کارناموں کی بدولت آج بھی زندہ ہیں اردو کو انتخابی سیاست سے جوڑتے ہوئے یہ تحریک چلائی کہ جو اردو کے حق کی بات کرے گا مسلمانوں کا ووٹ اسی کو ملے گا۔ اور اس طرح اس چنگاری کو شعلہ بنا دیا جو 1960 میں معروف مجاہد آزادی مغفور احمد اعجازی نے مظفر پور میں اردو بچاؤ کانفرنس کا انعقاد کرکے محبان اردو کے دلوں میں بھر دی تھی۔ اس کے علاوہ کبھی تحفظ اوقاف کانفرنس کبھی تحفظ فلسطین، کبھی بہاری بچاؤ آندولن، کبھی آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس تو کبھی بہار اسٹیٹ جمعیۃ الراعین کو اسلامی خطوط پر ڈالنے کی کوشش نے غلام سرور کو ایک مقبول ہر دل عزیز اور فعال لیڈر بنا دیا۔ 1977 میں وہ پہلی بار قانون ساز کونسل کے لیے منتخب ہوئے تو انھیں وزارت ثانوی تعلیم کی ذمے داری سونپی گئی۔ محض ایک سال 8 ماہ 120 دن کی وزارت کے دوران غلام سرور نے جو کارنامہ انجام دیے وہ قابل تحسین ہیں انھوں نے ثانوی درجے تک مفت تعلیم ابتدائی درجات میں مفت کتابیں، سکنڈری اساتذہ کے وقار کی بحالی، مدارس اسلامیہ اور سنسکرت اسکولوں کی حالت میں بہتری، آزاد اور خود مختار مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کے قیام اور تمام اقلیتی پرائمری اسکولوں اور ثانوی اسکولوں کے علاوہ ٹریننگ کالجوں کو منظوری دلائی۔ جیلوں میں قید بہاری مسلمانوں کی رہائی مقدمات کی واپسی اور انھیں ہراساں کیے جانے کی کارروائی کے خاتمے کی صورت نکالی۔ عظیم آباد پبلی کیشن قائم کیا اور بہار کے پہلے اردو گرلس اسکول ایوب گرلس اسکول کے قیام میں اہم کردار نبھایا۔

> یہ بڑا ہی گھاٹے کا سودا ہوتا ہے ایک موقع پر انھوں نے خود ہی کہا تھا کہ میں صحافت کی خار دار وادی میں اپنا سب کچھ لٹا بیٹھا ہوں۔ اس لیے اب کسی کو اس دشت کی خاک چھاننے کا مشورہ نہیں دیتا ہوں۔ بلکہ روکتا ہوں۔ میں تو جان چکا ہوں کہ پریت کرکے دکھ ہوتا ہے۔ اس لیے ڈھنڈھورا پیٹ کر کہتا ہوں کہ پریت نہ کریو کوئی۔

1980 میں کانگریس کی واپسی ہوئی تو جنتا پارٹی اور اس کے رہنما جس میں غلام سرور بھی شامل تھے پس پردہ چلے گئے حالاں کہ غلام سرور سنگم کے سہارے اپنی خدمات کو جاری رکھا اور اخبار میں پہلا کالم لکھ کر قوم کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ لیکن 1980 سے 1990 کا دور ٹھہراؤ کا دور تھا۔ انھوں نے کچھ برسوں تک خود کو سرگرم سیاست سے الگ رکھا لیکن اس کے بعد وہ پھر سرگرم

ہوئے اور 1990 میں جنتا دل کی کامیابی کے ساتھ ان کی سیاسی زندگی دوسری شروع ہوئی۔ غلام سرور بہار قانون ساز اسمبلی کے اسپیکر منتخب کیے گئے تو آپ نے اس عہدے پر رہتے ہوئے کئی تاریخ ساز خدمات انجام دی جن میں قانون ساز اسمبلی میں شعبہ اردو کا قیام بھی شامل تھا یہ ایک تاریخی کارنامہ تھا جس کی تقلید بعد میں پروفیسر جابر حسین نے قانون ساز کونسل میں شعبہ اردو کے قیام کے ذریعے کی۔

سالارِ اردو غلام سرور اس حقیقت سے باخبر تھے کہ ایک بے باک اخبار کے بغیر ان کی قیادت امّتِ مسلمہ میں انقلابی بیداری اور نتیجہ خیز حرکت وعمل میں ناکام رہے گی انھوں نے اس مقصد کے حصول کی خاطر 10 اکتوبر 1953 بروز سنیچر چھ پیسوں کی قیمت کا ایک چار صفحاتی ہفتہ وار اخبار 'سنگم' جاری کیا جس کا پہلا اداریہ ہی اخبار کی مکمل پالیسی اور اس کے نصب العین کا اعلانیہ تھا۔ جس سے اخبار کے منصوبے، مقاصد، مزاج اور تیور کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ مستقبل میں یہ اخبار مسلمانوں اور اردو کے جملہ مسائل کی خاطر کسی قسم کے سمجھوتے کے لیے تیار نہیں ہے۔ 'سنگم' کا یہ اولین اداریہ ریاست بہار میں اردو صحافت کی نئی صبح کا نقیب تھا اور اہل نظر حضرات نے بھانپ لیا تھا کہ اردو صحافت کی نگری میں داخل ہونے والا یہ اولوالعزم، دور اندیش، باشعور اور نڈر و بے باک نوجوان صحافی دنیائے صحافت میں ایک انقلاب کا پیشہ خیمہ ہے۔

10 جنوری 1963 کو ہفتہ وار 'سنگم' روز نامہ میں تبدیل ہوگیا۔ غلام سرور 'سنگم' کے توسط سے مسلمانوں کے تمام مسائل کو نہایت مضبوطی اور بے باکی سے اٹھاتے رہے۔ عوام کو بھی جھنجھوڑتے اور جگاتے رہے۔ انھیں اپنے حق کے لیے آمادہ پیکار کرتے رہے۔ جلد ہی 'سنگم' ملت کا ہر دلعزیز اور مقبول ترین اخبار بن گیا۔ مسلمان اسے اپنی زبان او راپنا ترجمان سمجھ کر دیوانہ وار اس کا مطالعہ کرتے اور اس کے انتظار میں آنکھیں بچھائے رہتے۔ بلا شبہ سنگم نے اس دور میں جیسی قابل رشک شہرت اور مقبولیت حاصل کی، اسے شاذ و نادر ہی کہا جا سکتا ہے۔

سنگم کے اداریے حکومت کے لیے تلوار بے نیام کی مثل ہوتے تھے۔ لہٰذا ان کے اداریوں پر حکومت کی جانب سے چھتیس مقدمے ہوئے اور وہ چھ بار (1964، 1965، 1966، 1968، 1970، 1971) جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھیجے گئے اور ہر بار باعزت بری ہوتے رہے۔ انھیں D.I.R یعنی ڈیفنس آف انڈیا رولس کے تحت گرفتار کیا جاتا تھا جس کی سخت گیری کے سبب عوام اسے کالا قانون کہتے تھے۔ اس قانون کے تحت صرف خونی رشتہ دار ہی اسیرِ زنداں سے ملاقات کر سکتے تھے۔ ویسے ان کی گرفتاریوں کے خلاف ہر بار بڑے بڑے انقلابی جلسے ہوئے جس کے آگے حکومت جھکنے پر مجبور ہو جاتی۔

حقیقت یہ ہے کہ غلام سرور کو عوام کے دل و دماغ میں سرایت کرانے اور ایوان حکومت میں ان کی دھاک جمانے میں 'سنگم' نے نہایت اہم اور موثر کردار ادا کیا ہے۔ یہی سبب تھا کہ اس دور کے بڑے بڑے سیاسی رہنما ان کے اجڑے ہوئے دفتر میں خوشامدانہ حاضری دیا کرتے جن میں اس وقت کے وزرائے اعلیٰ مہا مایا پرساد اور کرپوری ٹھاکر بھی شامل تھے جنھوں نے کئی بار ان کے دفتر کی ٹوٹی کرسیوں پر بیٹھ کر کرسیِ وزارت کی پیش کش کی اور کچھ خدمت کرنے کی خواہش کا اظہار کیا لیکن

'سنگم' کا یہ اولین اداریہ ریاست بہار میں اردو صحافت کی نئی صبح کا نقیب تھا اور اہل نظر حضرات نے بھانپ لیا تھا کہ اردو صحافت کی نگری میں داخل ہونے والا یہ اولوالعزم، دور اندیش، باشعور اور نڈر و بے باک نوجوان صحافی دنیائے صحافت میں ایک انقلاب کا پیشہ خیمہ ہے۔

غلام سرور نے شانِ استغنا سے اسے ٹھکرا دیا۔ یہ تھی غلام سرور کی اہمیت۔

'سنگم' صرف ایک اخبار ہی نہیں بلکہ ایک مخصوص نظریے کا داعی او رنقیب تھا۔ ایک تحریک تھا، ایک مقصد تھا، ایک نصب العین تھا جس نے جہاں ایک طرف آزادی کے بعد مایوس اور پژمردہ ملت اسلامیہ میں نئی روح پھونکی۔ ملت اور اردو کے حق کے لیے مردانہ وار جدو جہد کی، وہیں دوسری طرف سنگم نے اردو کو درجنوں صحافی، ادیب اور شاعر بھی دیے۔ نہ جانے کتنے قلم کاروں کی تحریر کو جلا بخشی اور ان کے قلم کو مہمیز کیا۔

پرکھ کے علاوہ ان کے تحقیقی اور تنقیدی نوعیت کے دس مضامین کا مجموعہ، مقالات سرور، کے نام سے شائع ہوا۔ علاوہ ازیں، ان کی درج ذیل چودہ تصانیف بھی شائع ہو کر مقبول خاص و عام ہو چکی ہیں (1) جہاں بینی۔ (2) عوام کی عدالت میں (3) جہاں ہم ہیں (4) پہلا وہ گھر خدا کا (5) حرف اول (6) حرفِ آخر (7) دی لاسٹ ورڈ (انگریزی) (8) اُن بن جینا کہ جان دینا مع To be or not to be (9) گوشے میں قفس کے (10) صدادے چلے (11) چراغ مصطفوی وشرار بولہبی (12) مدارس اسلامیہ (13) خطبات سرور (14) آیت الکرسی: تفہیم وتشریح قابل ذکر ہیں۔

1995 میں وہ تیسری بار 2000 میں چوتھی اور آخری بار بہار اسمبلی کے لیے منتخب ہوئے۔ 17 اکتوبر 2004 کو اپنی وفات تک وہ وزیر زراعت کے عہدے پر فائز رہے۔ اس دوران 1998 میں انھوں نے جنتا دل کے ٹکٹ پر لوک سبھا کا انتخاب بھی لڑا۔

غلام سرور صاحب آج بیشک ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن ان کے کارنامے روشن مینار کی طرح ہماری رہنمائی کر رہے ہیں اور آج اگر بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے تو اس کا کریڈیٹ اس اردو تحریک کو بھی جاتا ہے جس کی قیادت غلام سرور کر رہے تھے۔ اردو کے مسائل آج اگر نظر انداز ہیں، اردو کی لازمیت ختم کردی گئی ہے اور ہزاروں اردو اساتذہ کے عہدے خالی پڑے ہیں، فارسی کا قتل کر دیا گیا ہے تو عربی کا گلا گھونٹ دیا گیا ہے لیکن اردو آبادی خاموش اور مطمئن ہے تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ آج کوئی غلام سرور نہیں ہے اس لیے مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجھک نہیں کہ اردو کے سلسلے میں انھوں نے جو خدمات انجام دی ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔ اور ان کی تمام خدمات پر بھاری ہیں۔ اس لیے اگر ہم انھیں سالارِ اردو کا نام دیں اور ان کے یوم پیدائش کو یوم اردو کے طور پر منائیں تو یہ نہ صرف انھیں سچا خراج عقیدت ہوگا بلکہ موجودہ اور آنے والی نسلوں کے لیے مشعل راہ کا بھی کام کرے گا۔ کیوں کہ غلام سرور اوران کے رفقا کے بعد اردو کا علم اٹھانے والا اردو کو انصاف دلانے والا اور دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے اسے باعزت مقام دلانے والا اب اور کوئی نظر نہیں آتا ہے۔ امید ہے کہ ہم غلام سرور کے ماننے والوں میں سے کوئی اردو کا مجاہد پیدا ہوگا اور اردو کا علم مضبوطی کے ساتھ لے کر آگے بڑھے گا کیوں کہ اردو اور اردو آبادی کو آج پھر غلام سرور جیسے ایک سالارِ اردو کی ضرورت ہے:

آنے والی نسلیں ہم کو بھول سکیں ناممکن ہے
نقش قدم کے مٹتے مٹتے راہ گزر بن جائیں گے

■

Ashraf Asthanvi
Faqeerbara, Bankipur, Patna- 4 (Bihar)

قاضی عبدالغفار

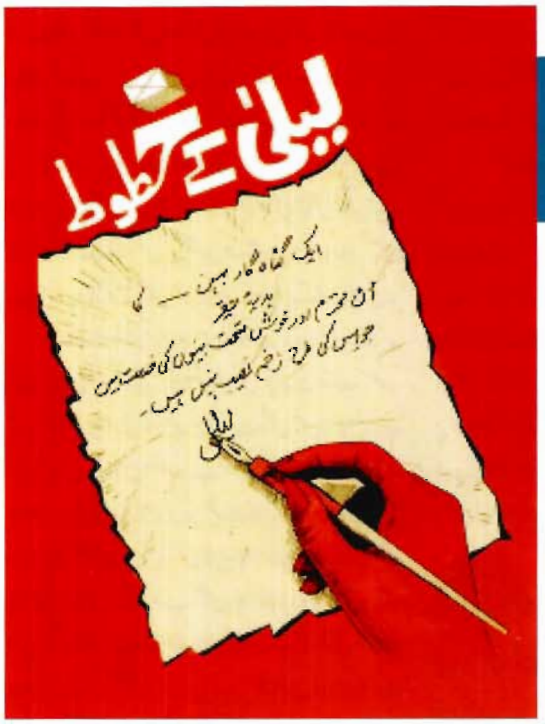

قاضی عبدالغفار ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے اپنے انشائیوں اور اداریے سے اردو ادب میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ بالخصوص 'لیلیٰ کے خطوط' اور 'مجنوں کی ڈائری' اردو زبان و ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ کا تعلق مرادآباد کے ایک شریف خانوادے سے تھا۔ ان کے آبا و اجداد سرزمین عرب سے تعلق رکھتے تھے۔ قاضی عبدالغفار کے دادا کا نام قاضی حامد علی تھا جو 1857 میں مرادآباد میں قاضی کے عہدے پر فائز تھے۔ ان کی محترمہ کا نام سلمٰی بیگم تھا جو ایک مذہبی خاتون تھیں۔ قاضی حامد علی کی اولاد نرینہ صرف ایک تھی جن کا نام قاضی ابرار احمد تھا جو مرادآباد میں اسپیشل مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز تھے۔ انگریزی حکومت نے انھیں خاں بہادر کے خطاب سے سرفراز کیا تھا۔ باقی اولاد میں پانچ لڑکیاں تھیں جن میں اب تک چار کے نام معلوم ہوسکے ہیں۔ (1) محمدی بیگم (2) موتی بیگم (3) لاڈلی بیگم (4) عجائب بیگم۔ قاضی ابرار احمد نے پانچ شادیاں کیں۔ پہلی بیوی محمدی بیگم خالہ زاد بہن تھیں۔ دوسری ہدایت النسا بیگم، تیسری بیوی کی صورت میں ہدایت النسا کی بیوہ بہن زوجیت میں آئیں چوتھی بگا بیگم کے نام سے موسوم تھیں۔ پانچویں شادی مرادآباد کی ایک خاتون قادری بیگم سے ہوئی۔ قاضی ابرار احمد کی دوسری بیوی ہدایت النسا سے تین لڑکے اور چار لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ قاضی عبدالغفار انھی کی سب سے بڑی اولاد تھے۔

قاضی عبدالغفار کی پیدائش فروری 1889 میں مرادآباد کے محلہ تمبا کو والا میں اپنے آبائی مکان میں ہوئی۔ قاضی صاحب نے اپنی ابتدائی تعلیم مرادآباد میں حاصل کی۔ 1902 میں قاضی صاحب نے مڈل امتحان پاس کیا اور یہیں سے 1905 میں دسویں جماعت کا امتحان دیا۔

قاضی عبدالغفار نے دو شادیاں کیں۔ ان کی پہلی شادی خالہ زاد بہن افضال بیگم سے 1911 میں ہوئی۔ افضال بیگم کے انتقال کے بعد سکینہ بیگم سے 28 ستمبر 1928 کو عقد ثانی کیا۔ افضال بیگم کے بطن سے چار لڑکے اور تین لڑکیاں پیدا ہوئیں۔

قاضی عبدالغفار کی ملازمت کی شروعات نائب تحصیل دار کے عہدے سے ہوئی ہے۔ اس کے بعد حیدرآباد دکن میں محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ کے ناظم مقرر ہوئے۔ 1916 میں سیاحت کی غرض سے بیرون ملک کا دورہ کیا جن میں خصوصی طور پر پیرس، لندن کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ قاضی عبدالغفار 1921 میں خلافت وفد کے سکریٹری کی حیثیت سے لندن کے لیے روانہ ہوئے۔ اسی وفد میں سر آغا خاں کے علاوہ سیٹھ چھوٹانی، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، محمد علی، شوکت علی، شبیر حسن قدوائی اور سید حسن امام بھی شامل تھے۔ 1925 میں قاضی عبدالغفار میونسپل بورڈ مراد آباد کے چیئرمین منتخب کیے گئے۔ دوسری بار بھی خدمت کا موقع ملا اور اس عہدے پر 1931 تک فائز رہے۔

قاضی صاحب نے صحافت کی زندگی کا ایک لمبا سفر طے کیا۔ کلکتہ سے شائع ہونے والے 'ترجمان'، 'صداقت'، 'جمہور' وغیرہ اخباروں کے مدیر رہے۔ ترقی پسندوں کے ترجمان 'نیا زمانہ' سہ ماہی حیدرآباد کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیے۔ انجمن صحافت اور انجمن مدیران جرائد کی حیدرآباد میں بنیاد رکھی۔ عمر کے آخری ایام میں یعنی 1949 کے قریب قاضی صاحب علی گڑھ چلے آئے اور انجمن ترقی اردو ہند کے بحیثیت سکریٹری منتخب کیے گئے۔ 'ہماری زبان' جاری ہوا تو قاضی عبدالغفار 'ہماری زبان' کے مدیر مقرر ہوئے۔

قاضی عبدالغفار کا تصنیفی سرمایہ دس کتابوں پر مشتمل ہے جس میں 'نقش فرنگ' پہلی کتاب ہے۔ قاضی صاحب شاعر بھی تھے لیکن ان کا کلام شائع نہیں ہوا۔ موصوف ایک کامیاب نثر نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے شاعر بھی ہوتے۔ آپ کی تصانیف کے موضوعات خاصے متنوع ہیں۔ قاضی صاحب عملی طور پر کسی ادبی تحریک سے وابستہ نہیں ہوئے لیکن زبان و بیان اور موضوع کے لحاظ سے آپ کا شمار رومانوی نثر نگاروں اور ترقی پسند ادیبوں میں ہوتا ہے۔

ادبی نقطۂ نظر سے موصوف کے دو شاہکار ناول 'لیلیٰ کے خطوط' اور 'مجنوں کی ڈائری' ہیں۔ بظاہر یہ دو الگ الگ کتابیں ہیں اول الذکر کا تعلق مکتوب نگاری سے ہے اور ثانی الذکر روزنامچہ سے۔ تاہم دونوں کے مواد اور موضوع میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ مثلاً 'لیلیٰ کے خطوط' میں لیلیٰ جنسی استحصال کا شکار ہوتی نظر آتی ہے اور دوسری جانب مجنوں جنس کا استحصال کرتا دکھائی دیتا ہے۔ دونوں اپنے سماج، تہذیبی اقدار اور مذہبی رسومات کے تئیں باغیانہ ذہنیت رکھتے ہیں۔ جہاں لیلیٰ اپنے جذبات و احساسات کی ترجمانی زہرنا کی لب و لہجے میں کرتی ہے۔ وہیں مجنوں اپنی معنوی کیفیات کی عکاسی جارحانہ انداز میں پیش کرتا نظر آتا ہے۔

قاضی صاحب کے یہاں صرف خوبصورت اور مزین جملوں کی بھرمار نہیں ملتی بلکہ ایک ایسا انداز یہاں ملتا ہے جو صاف ستھرا، بے باکی اور بے حجابی کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہے۔ 'مجنوں کی ڈائری' کا انداز بیاں بغاوت لیے ہوئے جذبات و احساسات سے سرشار ہے۔ تاہم جو سوز و گداز، بانکپن اور تڑپ 'لیلیٰ کے خطوط' میں موجود ہے وہ 'مجنوں کی ڈائری' میں نہیں۔

آخر کار جدوجہد کے داعی، حرکت و سیماب پائی کے یہ غازی اور مسلسل علم و عمل کے شیدائی کے دل کی دھڑکنیں 17 جنوری 1956 کو ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئیں۔

قاضی عبدالغفار

لیلیٰ کے خطوط

سترھواں خط

توبہ! توبہ! خدا اور مذہب کا نام درمیان میں کیوں لاتے ہو؟ بازی، بازی باریش بابا ہم بازی! میری تمھاری سیاہ کاریوں کو خدا اور مذہب سے کیا تعلق؟

خدا کو کیا غرض! میرے تمھارے درمیان کیوں ہو؟ تم کوئی 'مولانا یا مولوی' تو ہو نہیں کہ تمھارا عشق بھی مذہب، فقہ اور حدیث کا لباس پہن کر آئے! مذہب سے یا جس کو تم مذہب کہتے ہو میرا تعلق برائے نام ہے میں مذہب اور خدا کو کچھ یوں ہی سا جانتی ہوں۔ کوئی درجہ دوئم یا سوئم کے 'مولانا' جو کبھی پھنس گئے ہیں تو ان سے میں نے ع وش وق کو نہایت قرأت داؤدی کے ساتھ حلق کے صحیح مخرج سے ادا ہوتے ہوئے سن لیا ہے: مگر ان مولاناؤں کا عشق اکثر بھدّی قسم کا عشق ہوتا ہے آتا ہے تو اکثر نکاح کا پیغام ساتھ لے کر آتا ہے یہ بے چارے صرف ایک ہی قسم کی عیاشی جانتے ہیں— وہ جو کسی نہ کسی مذہبی اصطلاح کے تحت آسکے۔ خیر!! ان کی 'لاحول' اور 'نعوذ باللہ' سے تو میں کسی نہ کسی طرح اپنا بچاؤ کر لیتی ہوں مگر یہ تمھاری عشق بازی میں مجھے خدا کے نام کی آمیزش نہیں بھاتی۔ دنیا کے کام دنیا ہی کے لیے رہنے دو۔ آگے نہ جاؤ! مجھے تمھیں کسی کو خبر نہیں کہ آگے ہے کیا؟— ہمارے تمھارے مذہب کی حقیقت تو صرف اتنی ہے کہ جو ماں باپ کا مذہب وہ ہمارا مذہب۔ تم اور میں مذہب کو کیا جانیں۔ تم ماشاء اللہ تعلیم یافتہ ہو (چار پائے برد کتابے چند) میں غریب بھی کبھی ایک شریف خاندان کی لڑکی تھی، اتنا جانتی ہوں کہ 'مقیماں' خالق باری، اور 'راہِ نجات' پڑھی اور چند مذہبی کتابیں ختم کیں۔ اس کے بعد میرے ماں باپ نے (جن کی یاد کا چراغ آج بھی اس سیاہ قلب کے ایک گوشے میں روشن ہے) بڑا حوصلہ کر کے مجھے عربی فارسی اور اردو کی تعلیم دی۔ درس کی ابتدائی کتابیں ختم کیں اور فارسی، اردو کی سیکڑوں کتابیں پڑھ ڈالیں، اگر کتابیں پڑھ لینے سے یا نماز، روزہ اور حج کے ارکان یاد کرنے سے کوئی مسلمان بن سکتا ہے تو میں بھی مسلمان ہوں۔ مسلمانوں کے مذہب کے جو ٹھیکیدار ہیں وہ بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتے۔ اگر میں گناہ کی دنیا میں نہ دھکیل دی گئی ہوتی تو آج بھی بہت سے مفت کی روٹیاں، نکاح کے چھوہارے اور ولیمہ کے چاول کھانے والوں سے زیادہ پڑھی لکھی سمجھی جاتی مگر وہ سارا پڑھا لکھا اب میری صمت فروشی کی دکان کو چمکا رہا ہے جس طرح بڑے بڑے عمامہ والے اپنے علم و فضل کو اکثر اپنے اغراضِ فاسدہ پر دلیل لاتے ہیں، اسی طرح میں بھی اپنی تعلیم کو اپنے پیشے کی کامیابی کا معاون بناتی ہوں۔ اگر میں عورت نہ پیدا ہوئی ہوتی اور عصمت فروشی کے بازار میں نہ آئی ہوتی تو جہاں تک مکر و فریب اور دھوکہ دہی کا تعلق ہے میں بھی کوئی 'مولانا' حضرت اقدس' یا 'جناب محترم' ہوتی! کہیں مصلے پر کسی 'حجرے' میں بیٹھی ہوتی، کسی مسجد کے منبر پر کھڑی ہوتی، فتوے لکھتی، اعلانات شائع کرتی۔ تقریریں کرتی اور میرا تعلق براہِ راست عرش اعظم سے ہوتا! بدنصیبی سے عورت بن کر مرد کے دھوکے میں آئی اور اس قابل بھی نہ رہی کہ حضرت مولانا میری طرف نظر اٹھا کر دیکھیں! اس زندگی میں خدا کی کوئی نعمت میرے لیے نہیں ہے! میں اس مولویانہ معمہ کی حدود سے جس کو مذہب کہتے ہیں بالکل خارج ہوں! پھر کیوں ان الجھنوں میں اپنا وقت ضائع کروں؟ اور ان الجھنوں کو سلجھانے ہی والا کون ہے؟ کہیں ہے؟ تم سلجھا سکے؟ جبہ و عمامہ نے سلجھایا؟ تسبیح و زنار سلجھا سکی! 'حضرت' اور 'پنڈت' جی' مہاراج سلجھا سکے؟ بیٹا باپ کو نہ سمجھ سکا۔ بھائی بھائی کو نہ سمجھ سکا، بیٹی ماں کو نہ پہچان سکی، کوئی ایک انسان دوسرے انسان کو نہ سمجھ سکا۔ باوجود تمام ادعائے عقل و فہم معمولی پیش پا افتادہ حقائق بھی سمجھ میں نہ آئے۔ آپ بڑے تعلیم یافتہ، بڑے دانا، بڑے علمبردارِ تہذیب و تمدن ہیں آپ ایک ذرا سی ذلیل عورت کو نہ سمجھ سکے! پھر آگے کیوں جایئے۔ دریا کے پانی میں وہیں تک جایئے جہاں تک زمین پاؤں کے نیچے رہے!

یہ سب لوگ جو مذہب مذہب پکارتے ہیں، درحقیقت ایک قسم کے بُت پرست ہیں ان کا بت پتھر یا سونے یا چاندی کا نہیں ہے۔ تخیل اور توہم ان کا دیوتا ہے۔ ذاتی خواہش ان کا خدا ہے۔ مندر اور شوالہ کے بجائے ان کا دیوتا ان کے دماغ کے سومنات میں رہتا ہے! خدا سے زیادہ یہ سب اس دیوتا کے غلام ہیں، کوئی پوچھے کہ مذہب کی جو تعلیمات ہمارے سامنے پیش کی جاتی ہیں۔ ان تعلیمات نے ہمارے احساس اور ادراک کے کتنے پردے اٹھائے؟ ہمارے علم میں کتنا اضافہ کیا، ہزاروں لاکھوں قرن گزر گئے اور اس سیاہ پردے کا ایک کونہ بھی نہ اٹھایا جا سکا جو کائنات کے وجود پر پڑا ہوا ہے اہل مذہب ایک طرف ناچار ہیں اور اہلِ علم و سائنس دوسری طرف واماندہ ہیں۔ طوطے کی طرح چند خود ساختہ اصولوں کو رٹے جاتے ہیں! مذہب کا جو دیوتا مختلف قوموں نے بنا رکھا ہے وہ بہت ہی خوفناک چیز ہے! میں اس سے بیزار ہوں۔ اس دیوتا کے پجاریوں نے دنیا میں جس قدر فساد برپا کیا، جس قدر خون بہایا، اس کی حد و انتہا نہیں ہے یہ زندگی کے جس قدر اصول اور قاعدے بنائے جاتے ہیں سب پاؤں رہوا ہیں۔ آج ایک کلیہ قائم ہوتا ہے

کل ٹوٹ جاتا ہے، دنیا کی اور ہماری زندگی کی بس ترکیب یہی ہے کہ بگاڑے جاؤ بنائے جاؤ، بنائے جاؤ، بگاڑے جاؤ۔ ایک الجھے کو سلجھانے کی کوشش کرو اور بیس الجھے اور پیدا کردو۔ فلسفی کا فلسفہ، حکیم کی حکمت، منطقی کی منطق، ولی کی ولایت، صوفی کا تصوف یہ سب ٹوٹی ہوئی کشتیاں ہیں جو زندگی کے بحر نا پیدا کنار پر کبھی ڈوبتی ہیں، کبھی اچھلتی ہیں، ہم تم بھی لاکھوں کروڑوں ڈوبے ہوئے جہازوں کے دو ٹوٹے ہوئے ٹکڑے ہیں جو بہتے چلے جاتے ہیں۔ یہ تو ہماری آپ کی کائنات ہے پھر اس میں عشق ہے عاشقی ہے۔ محبت کے دعوے ہیں۔ اُلفت کے تقاضے ہیں۔ ہجر کی شکایتیں ہیں وصل کی خواہشیں ہیں، رقیب کے طعنے ہیں معشوق کی بے پروائیاں ہیں اور مجنوں کی لیلیٰ ہے اور لیلیٰ کے مجنوں ہیں— اور ان میں سے ایک آپ ہیں۔

اٹھارواں خط

جناب عاشق نامراد! کل جس وقت آپ کا نیاز نامہ آیا تو میں خوابِ ناز سے بیدار ہوکر دکانداری کی تیاریاں کررہی تھی۔ آئینہ میرے سامنے رکھا تھا، عطردان منگا رہی تھی اور نئی ساڑھی جو تمھارے رقیب روسیاہ سیٹھ نے کل ہی نذر کی تھی، کھول رہی تھی تاکہ اس کو پہن کر سیٹھ جی کی قدر افزائی فرمائی جائے۔ بقول ان کے 'جزہ لواجی'! سوچ یہ رہی تھی کہ کوئی بیوقوف آجائے تو کرایہ کا موٹر منگا کر باغ عامہ کے دو چار چکر لگاؤں۔ نئی ساڑھی پہن کر اگر موٹر میں ہوا خوری نہ کی جائے تو نئی ساڑھی کا اصلی مقصود فوت ہوجاتا ہے۔ ہم لوگوں کا چراغ اگر تہہ داماں رکھا جائے تو کاروبار پھر کیونکر چلے جس طرح تھیٹر اور سنیما کے اشتہار کرایہ کی گاڑیوں پر تقسیم ہوتے ہیں، یا جس طرح پنجاب کے ایک مشہور ڈاکٹر وحکیم وطبیب و دیدٔ اپنی گاڑی پر اپنا نام و پتہ بخط جلی لکھوا کر بڑے بڑے شہروں میں گھوما کرتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے حسن کے سائن بورڈ کے لیے بھی آج کل موٹر اور باغِ عامہ کی اشد ضرورت ہے! ہر روز اگر ساڑھی نہ بدلی جائے تو ایک ہی پرانے سائن بورڈ کو دیکھتے دیکھتے گاہکوں کے اکتا جانے کا اندیشہ ہے!

میں تخیل کی اس دنیا میں منہمک تھی کہ آپ کا صحیفۂ گرامی یہ مژدہ جانفزا لایا کہ خدانخواستہ آپ خودکشی پر آمادہ ہیں اور یہ کہ آج ہی شب میں یہ ارادہ درجۂ تکمیل کو پہنچے گا! آپ کی اس اضطراری تحریر کو پڑھ کر ہنس تو نہ سکی مگر رحم اور تحقیر کا مرکب ایک تبسم میرے لبوں پر پیدا ہوا جس کو دیر تک آئینہ میں دیکھتی رہی۔ میں نے اپنے تبسم کی بہت سی قسمیں مقرر کرلی ہیں۔

عاشقِ نامراد اگر روئے تو اس کے لیے ایسا تبسم ہونا چاہیے۔ سنیے تو میں اس طرح تبسم کروں۔ اگر جان دینے کی دھمکی دے تو میرے ہونٹوں پر اس انداز سے تبسم پیدا ہو اور تخلیہ میں وہ زیادہ بے تکلف ہوجائے اور میں اس کی ہمت افزائی کرنا چاہوں تو اس طرح مسکراؤں، سوال وصل کا جواب اس قسم کے تبسم سے دیا جائے اور احوالِ درد فراق سن کر میرے ہونٹوں پر تبسم اس طرح کھلے وغیرہ وغیرہ۔ ہر موقعے اور ہر ضرورت کے لیے میرے حسن کے اسلحہ خانہ میں ایک مخصوص تبسم مقرر ہے جس طرح شکاریوں کے کارتوسوں کے نمبر مقرر ہوتے ہیں۔ مرغابی کے لیے یہ اور بٹیر کے لیے یہ اور ہرن کے لیے یہ اور شیر کے لیے یہ۔ آپ کے اس دلچسپ ارادہ کی خبر پاکر جو تبسم میرے لبوں پر نمودار ہوا اس کی نوعیت بالکل وہی تھی جو پاگل خانہ کے مہتمم کے تبسم کی ہوتی ہے جو اپنی زیرِ نگرانی پاگلوں کی تمسخرانگیز حرکات کو دن میں ہزاروں دفعہ دیکھتا ہے۔

یہ خوف تو میرے دل میں نہیں کہ آپ واقعی اپنے اس ارادہ پر عمل فرمائیں گے مگر افسوس اس کا ہے کہ میں آج کی شب آپ کے اس ارادہ میں آپ کی کوئی اعانت نہیں کرسکتی۔ نہ تیمارداری کے لیے آسکوں گی۔ نہ میت پر، اس لیے کہ سیٹھ جی کی پیش کی ہوئی ساڑھی پہن کر آج تو سیٹھ جی کا سرِ عجز زانوئے ناز پر رکھنا ہے! مجھے آپ کے اس ارادہ نے ذرا بھی متعجب نہیں کیا، اس لیے کہ میں خوب جانتی ہوں کہ ہزار دفعہ اس دنیائے ناپائیدار سے منتقل ہونے کا آپ ارادہ فرمائیں گے اور ہزار دفعہ اس ارادے کو میرے وصل کی امید ملتوی کردے گی! ماہر امراض، ہر مرض کے تدریجی مدارج سے خوب واقف ہوتا ہے، واقف نہ ہو تو وہ ماہر امراض ہی نہیں— وہ جانتا ہے کہ نزلہ زکام اور دردِ سر کے بعد دردِ سینہ اور پھر نمونیہ تک کتنے مدارج ہوتے ہیں، جن سے مریض گزرتا ہے اور موت آنے تک مریض کو کیا کیا حالات پیش آتے ہیں، اسی طرح میں بھی یہ جانتی ہوں کہ ابتدائی نظر بازی کے بعد میرے عشاقِ عالی مقام کو کتنی منزلیں طے کرنی ہوتی ہے، تا آنکہ وہ خودکشی کی دھمکی تک پہنچتے ہیں اور پھر یہ بخار چڑھ کر اترتا کیوں کر ہے آپ جس کو ہیضہ سمجھ رہے ہیں۔ مجھ سے پوچھیے— یہ صرف معدہ کی خرابی کی وجہ سے معمولی بدہضمی ہے پھر میں کیسے یقین کرلوں کہ آپ مرجائیں گے یا مرسکتے ہیں! جب میری رائے میں حقیقتِ مرض اس قدر خفیف ہے تو پھر مجھے تردد کیوں ہو؟ اللہ نے تمھیں دولت دی، عقل نہیں دی! اصل یہ ہے کہ خدا نے سب کو برابر حصہ دیا ہے لیکن اس کی نعمتوں کی اقسام جدا جدا ہیں، مثلاً ایک امیر کو دولت دے کر عقل سے محروم رکھا مگر ایک مفلس کو دولت سے محروم کرکے عقل عطا فرمائی۔ عقل نہیں دی تو ایمان دیا۔ ایمان اگر زیادہ دیا تو عقل کم کردی۔ عقل اگر دی تو ایمان کم کرلیا۔ آنکھ میں زیادہ روشنی دی تو بازو کمزور کردیا۔ بازو قوی دیے مگر آنکھیں کمزور کردیں۔ وزن ہر چیز کا برابر رکھا۔ پلہ ہر فرد کا برابر رہا۔ فرق صرف نوعیت کا ہے۔ تم دولت رکھتے ہو مگر عقل و ایمان نہیں رکھتے۔ میں عصمت اور نسوانی عصبیت سے محروم ہوں مگر عقل و ایمان رکھتی ہوں! ہم دونوں کی قیمت ایک ہے۔ میری عقل کو حق حاصل ہے کہ تمھاری دولت کی خام کاریوں پر استہزا کرے، اور تمھاری دولت حق رکھتی ہے کہ میری عصمت فروشی اور رسوائی پر خندہ زن ہو! اس میں مجھے اور تمھیں برا ماننے اور خفا ہونے کا کیا موقعہ ہے؟ اس فلسفے کو سمجھ لو تو تمھاری بہت سی مشکلیں آسان ہوجائیں! پھر اس عشق و عاشقی میں جو میرے تمھارے درمیان ہنگامہ آرا ہے خودکشی کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوگا۔ جو کچھ تمھارے حصے میں آیا ہے تم اس پر قناعت کرو۔ جو کچھ قسام ازل نے مجھے دیا ہے میں اس پر صبر کروں!

تم کہا کرتے ہو کہ ایک عورت ہوکر میں کیسی کیسی باتیں بناتی ہوں! میں کہتی ہوں کہ عورت کو باتیں کرنا کس نے سکھایا، تمھاری حماقتوں نے میری عقل کو تیز کیا اور تمھاری ہوس کی مکاریوں نے مجھے چالاک بنایا۔ ہرن نے اس وقت تک جنگل میں بھاگنا اور دوڑنا نہ سیکھا جب تک کہ شیر نے اس پر حملہ نہ کیا۔ جب مردوں کی حیوانیت نے عورتوں کی نسوانیت پر حملے کیے تو ان چڑیوں نے گھنی جھاڑیوں میں چھپ کر عقاب کو دھوکہ دینا سیکھا! تم رنگ بدل بدل کر ہمیں دھوکے دیتے ہو اور ہم رنگ بدل بدل کر تمھیں بے وقوف بناتے ہیں۔ یہ سودا دست بدست ہے۔ چڑتے کیوں ہو؟ جیسی کھیتی بوتے ہو ویسی کاٹتے ہو اور اس دار مکافات میں ہونا بھی یہی چاہیے!

انیسواں خط

بہت بہت شکریہ۔ تمھاری طرف سے نکاح کا پیام اور میری طرف سے اس عزت افزائی کا شکریہ! دونوں باتیں تمسخرانگیز ہیں! تمھیں معلوم نہیں میرا نکاح ہوچکا ہے! عورت کا نکاح عمر میں ایک ہی دفعہ ہوتا ہے۔ یوں چاہے وہ ہزار دفعہ مردوں کے پہلو میں بے حجاب ہوتی رہے۔ نکاح کے متعلق مرد کا تخیل زیادہ تر جسمانی اور مادی ہوتا ہے! تم لوگ جب خطبۂ نکاح سنتے ہو تو تصور کرتے ہو ایک لڑکی یا ایک عورت کے خوبصورت جسم کا اس کی

جوانی اور رعنائی اور پھر اس آنے والی رات کا۔ جب اس ناکتخدا لڑکی کے جسم کی تمام تر نزاکت و لطافت تمھارے نفس کے دسترخوان پر پیش کی جائے گی! مگر عورت کا وجود معنوی جب کسی مرد کا انتظار کرتا ہے تو وہ مرد اس عورت کے لیے گویا خدا کا قائم مقام ہوتا ہے اس کا وجود عورت کی زندگی کا مبتدا اور منتہا ہوتا ہے۔ نہ اس سے پہلے کچھ تھا۔ نہ اس کے بعد کچھ ہوگا— ! مرد جب پہلی شب میں عورت کے پاس آتا ہے تو شاید اس سے پہلے سیکڑوں عورتوں سے اپنے نفس کو آزمودہ کار بنا چکا ہوتا ہے مگر عورت جب اس شب کو اپنے شوہر کی آغوش میں آتی ہے تو ایک نئی دنیا میں آتی ہے۔ ایک نئی سرزمین میں قدم رکھتی ہے جس سرزمین کی اس کو کچھ خبر نہیں ہوتی۔ مرد جب عورت کو مستقلاً اپنے نفس کی خادمہ بنانا چاہتا ہے تو — نکاح کر لیتا ہے۔ عورت جب سر جھکائے ہوئے اور آنکھیں بند کیے ہوئے اپنے سر کے اشارے سے کسی کو اپنا شوہر قبول کرتی ہے تو اس بدنصیب کو خبر نہیں ہوتی کہ مرد کیا چیز ہے! کیا جنس ہے؟ کیا قیامت ہے؟ کیا بلا ہے۔ اگر وہ اپنے ہونے والے شوہر سے محبت بھی کرتی ہے تب بھی اس کو خبر نہیں ہوتی کہ بکری کی کھال کے نیچے جو بھیڑیا چھپا ہوا ہے اس کے دانت کس قدر تیز ہیں۔ عورت صرف اس محبت کو جانتی ہے جس کا تعلق جسم اور حیوانیت سے بہت کم ہوتا ہے۔ وہ صرف مرد کو اتنا جانتی ہے! اس کے اندر جو حیوان چھپا ہوا ہے اس کو نہیں جانتی اور عرصے تک نہیں جان سکتی— جب تک کہ زندگی کے تلخ تجربے مرد کی حقیقت کو اس کے سامنے بے نقاب نہ کر دیں۔ سوسائٹی اور مذہب نے جس کے ٹھیکے دار صرف مرد ہیں عورت کو اس قدر گھیر لیا ہے اور بے دست و پا کر دیا ہے کہ نکاح عورت کی آخری شکست اور مرد کی فیصلہ کن فتح بن جاتا ہے اللہ اور اللہ کے رسول کے نام پر عورت، مرد کی ملکیت بنا دی جاتی ہے۔

تمھاری دولت مجھ پر برستے برستے تھک گئی مگر تم کو مجھ پر وہ قبضۂ مالکانہ حاصل نہ ہوسکا جو تم سمجھتے تھے کہ دولت کے زور پر تم کو حاصل ہوسکے گا۔ اس لیے اب اللہ اور رسول کا نام درمیان میں لا کر تم مجھ سے خطِ غلامی لکھوانا چاہتے ہو کہ میں تمھارے خلوت خانہ کے طاق پر سجا دی جاؤں— کم از کم اس وقت تک کے لیے جب تک تم کو میری ضرورت ہو، تمھارے عیش میں کام آسکوں، تمھارے پیغامِ نکاح کی یہ تشریح ہے— لومڑی کی طرح مکار، بلی کی طرح عیار، شیر کی طرح خونخوار، مرد نکاح کا پیام دیتا ہے! ازدواج شرعی کی دعوت دیتا ہے۔

یوں تو تمھارا بھائی، کوئی نہ کوئی ہر شب کو مجھ سے ایک قسم کا نکاح کرتا ہے مگر جب میرے ہر شب ہونے والے نکاحوں کا سلسلہ شروع نہ ہوا تھا جب میں انسان تھی آج سے سالہا سال پہلے۔ میں تو جب ہی منکوحہ محبت ہو چکی تھی۔ وہ نکاح جس کو کسی 'مولانا صاحب'! یا 'قاضی صاحب' نے پڑھایا تھا، بغیر کسی ثالث کی امداد کے پڑھا جا چکا تھا۔ خطبہ نہ تھا۔ چھوہارے نہ تھے۔ وکیل و گواہ نہ تھے، براتی نہ تھے، مہر کا سوال نہ تھا۔ جہیز کی بحث نہ تھی— کچھ بھی نہ تھا، محبت کی ایک نگاہ تھی وہی میرا نکاح تھا۔ ایجاب و قبول تھا اور اس عہدنامہ پر محبت کی مہر— میری طرف سے بہت پاک اور سچی محبت اور اس کی طرف سے، اس بہانہ باز، بدعہد، بے وفا، نفس پرور کی طرف سے— بہت آلودہ، جھوٹی اور کھوٹی محبت! کبھی تم سے پہلے کہہ چکی ہوں کہ میرا پہلا مرد وہی تھا اور وہی میری پہلی اور آخری محبت تھی۔ وہ مجھے چند ہی روز بعد اپنے دل سے نکال کر بازار میں پھینک گیا۔ مگر میں بدنصیب جو ہر شب کسی نہ کسی شب پرست کے بستر کی آرائش ہوتی ہوں ابھی تک اپنے کو منکوحہ سمجھے بیٹھی ہوں۔

تم جانتے ہو! اس عورت کا کیا حال ہوتا ہے جو محبت کرتی ہے؟ پناہ بخدا وہ نہیں جانتی کیا بن جائے گی! کیا ہو جائے گی، وہ اپنی محبت سے حیران اور بے بس ہو کر مرد کی طرف تکتی ہے۔ اور اس کے اشارے کا انتظار کرتی ہے جو کچھ مرد اس کو بنانا چاہتا ہے وہ بن جاتی ہے وہ اپنے تخیل میں مرد کی عجیب عجیب تصویریں بناتی ہے ان تصویروں کی پوجا کرتی ہے۔ پھر جب اس کے پیہم آنسو اُن تصویروں کے رنگ و روغن کو دھوڈالتے ہیں تب وہ مرد کی حقیقت کو عریاں دیکھتی ہے اور حیران و بدحواس ششدر رہ جاتی ہے ''یہی مرد ہے، جس پر میں مرتی تھی؟''

اس پہلی محبت کی گرم جوشی میں میری رفتار بہت تیز تھی، بہت کم عرصہ میں میں نے بہت زیادہ فاصلہ طے کر لیا، دوشیزگی کے خلوت خانے سے نکل کر بازار میں آگئی اور اب شاہراہِ عام پر اس طرح برہنہ کھڑی ہوں کہ میری تجارت کا اشتہار میرے گلے میں آویزاں ہے، میری پیشانی پر کندہ ہے دنیا استہزا کرتی ہے، منہ چڑھاتی ہے، میرے منہ پر تھوکتی ہے اور طرح طرح سے میری تحقیر کرتی ہے اور پھر مجھ ہی کو خریدتی ہے دن بھر مجھ گنہگار، سیاہ کار، زانیہ کو سنگسار کرتی ہے اور رات کو میرے قدموں پر سر رکھ دیتی ہے۔

میرا وہ پہلی شب کا بہکانے والا، اب عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر مخلوقِ خدا کے درمیان حق و ناحق کا فیصلہ کرتا ہے۔ عدل کرتا ہے، انصاف کی ترازو کے دونوں پلّے برابر رکھتا ہے، سزائیں دیتا ہے، تعددِ ازدواج کا حامی ہے۔ عورتوں کو شوہروں کی اطاعت کی تلقین کرتا ہے۔ مردوں کو عورتوں کے متعلق ان کے حقوقِ مالکانہ کی تعلیم دیتا ہے۔ مہر و نفقہ و طلاق کے مقدمات کا فیصلہ کرتا ہے۔ 'شریعت حقہ' کا حامل ہے اس کی عدل گستری کی دھوم ہے!— میں اس کے شہر میں جا کر سرِ راہ ایک بالاخانے پر بیٹھنا چاہتی ہوں! تاکہ جب وہ عدل و انصاف کا پتلا بازار میں سے گزرے تو میں اس سے پکار کر کہوں کہ او جانے والے! او سراپا عدل و انصاف! ذرا سر اٹھا کر ادھر دیکھ! ایک بیسوا بھی انصاف چاہتی ہے! ذرا آنکھیں ملا کر اس کا سلام قبول کر! اور اس محبت کو جو تو نے کبھی اس بیسوا کے دل میں پیدا کی تھی۔ روندتا ہوا ٹھکراتا ہوا گزر جا۔ اگر تیرا انصاف یہی چاہتا ہے تو اس بیسوا پر حد شرعی جاری کردے یہ بیسوا جب عورت نہ بنی تھی اور محض ناکردہ گناہ لڑکی تھی تو اے انصاف کے دیوتا تو اس کی اٹھتی جوانی سے کھیلا کرتا تھا۔ کچھ یاد ہے؟ آج تو مجھے عصمت فروش کہتا ہے؟ تیری 'تعزیرات' میں جسم کا فروخت کرنا اس قدر بڑا جرم ہے؟ تو جو زندگی کے ہر صیغہ میں، تجارت میں، سیاست میں، علم کی مسند پر بیٹھ کر عدالت کی کرسی پر اپنا دماغ بیچتا ہے، اخلاق بیچتا ہے، ایمان بیچتا ہے تو یہ کچھ بھی گناہ نہیں؟ عدالت کی میزان میں دوسروں کے گناہوں کے تولنے والے، عقل و دماغ کا مٹھی بھر آٹے کے لیے بازار میں فروخت کرنا اور اس کے معاوضہ میں تنخواہیں مشاہرے،

وظیفے اور منافع حاصل کرنا ذرا بھی عیب نہیں۔ مگر عیب ہے اور گناہ ہے پاپ ہے تو چند روز میں خاک میں مل جانے والے جسم کو نیلام کرنا، تم اپنی روح چند پیسوں کے لیے شیطان کے ہاتھ فروخت کردو تو واقعہ قابل ذکر بھی نہیں لیکن میں اپنے جسم کے دام وصول کروں تو میں پاپی! میں ذلیل عصمت فروش ہوں اس لیے کہ بازار میں دکان لگائے بیٹھی ہوں اور تم بڑے مہاتما ہو۔ اس لیے کہ اپنے دماغ، اخلاق، ایمان اور روح کو فروخت کرتے ہو۔ کسی کے اندر جس قدر زر و جواہر ہے اس کو سڑکوں پر لٹاتا پھرے کوئی نہیں پوچھتا کہ تمھارے منہ میں کتنے دانت ہیں؟ لیکن چند پیسہ کا خالی کیسہ فروخت کیا جائے تو وہ شدید اخلاقی جرم ہے! لفافہ کے اندر جو دستاویزیں محفوظ ہیں ان کو چاہو تو پنساری کی دکان پر بیچ ڈالو، مگر لفافہ پھٹا پرانا بھی ہو تو اس کا فروخت کرنے والا گردن زدنی ہے! ظاہر پرستوں کی عقل پر کیسے پتھر پڑ گئے ہیں۔

انار کے دانے نکال کر تم ہر ایسے گدھے کے سامنے ڈال دو گے جس کی جیب کا پیسہ تمھاری جیب میں آسکے، لیکن انار کا سوکھا ہوا چھلکا اگر فروخت کیا جائے تو تم فروخت کرنے والے کو پھانسی دے دو گے! عصمت فروش تم ہو یا ہم ہیں؟ تم اپنے بہترین توائے عقلی دماغی و روحانی کی تجارت کرتے ہو، تمھارے دیوان خانے، تمھارے بالا خانے ہیں۔ تمھارے دفتر، تمھارے کسٹم خانے ہیں، کالجوں میں یونیورسٹیوں میں، علمی اداروں میں، سرکاری ملازمت میں، اخبار کے کالموں میں صنعت و حرفت کے کارخانوں میں، ہر جگہ تمھارا علم و فضل بازار کے بھاؤ فروخت کیا جارہا ہے۔ ہماری طرح تم بھی اپنے خصائل پر ملمّع کر کے ان کے بھاؤ بڑھاتے ہو جس طرح ہم اپنے رخساروں پر پاؤڈر لگا کر اپنی قیمت بڑھاتے ہیں! پھر ہم میں اور تم میں فرق کیا ہے؟ ہم جسمانی حیثیت سے عصمت فروش ہیں اور تم معنوی حیثیت سے!—

— جب انصاف کا وہ دیوتا! وہ میرا پہلا مرد، میرے بالا خانہ کے نیچے سے گزرے تو میں اس سے کیا کیا نہ کہوں—؟ اس قدر چلا چلا کر کہ سارا بازار سنے۔!

ایسی ایسی باتیں سوچا کرتی ہوں، پھر جو کوئی چاہنے والے آجاتے ہیں تو ان سے کھیلنے لگتی ہوں! سچ بتاؤ تم نے جو نکاح کا پیغام مجھے بھیجا ہے وہ کس جذبہ کے ماتحت ہے۔ شاید— تم کچھ محبت مجھے دے سکو، مگر کیا وہ عزت و احترام جو بیوی کا ہونا چاہیے، وہ منصب جو بیوی کے لیے مخصوص ہے، وہ بھی تم مجھے دے سکو گے؟ دنیا تم کو اجازت دے گی کہ تم مجھے بیوی بنا کر بیوی کی طرح میری عزت کرسکو؟ اس کلنک کے ٹیکے کو کیسے چھپاؤ گے جو میری پیشانی پر ہے؟ کوئی مرد ہے کہ کہے اے عورت میں تیرے لیے دنیا کو چھوڑ دوں گا۔ میں اسے نہیں مانتی۔ دنیا کسی کو کب چھوڑتی ہے۔ یہ ڈائن ہر شخص کے دامن سے لپٹی ہوئی ہے میں اگر بیوی بن کر تمھارے گھر میں آؤں گی تو بجائے اس کے کہ تم مجھے گندگی سے نکال کر پاک اور ستھرا کردو۔ میری گندگی تم کو بھی لپٹ جائے گی اور سڑک پر چلنے والے تمھاری دیواروں کے سایہ سے بچ کر گزرا کریں گے! وہ کہیں گے اس مکان میں ایک نجس عورت رہتی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اس کا سایہ ہم کو نجس کردے۔

بڑے بڑے غیرت مند اپنی بیویوں اور بیٹیوں سے کہیں گے۔ اس گھر کی عورت ملنے کے قابل نہیں، اس طرف نہ جائیو!'' میں ایک کوڑھی اور جذامی کی طرح تمھارے گھر میں تمام دنیا سے الگ محبوس رہوں گی، تم کب تک اس پریشانیِ خاطر کو برداشت کرسکو گے، عیاشی کے سلسلے میں تم میرے یہاں آ‌ؤ یا میں تمھارے گھر جاؤں تو ایک خوفِ خدا رکھنے والی دنیا کو تم پر کوئی اعتراض نہ ہوگا، سب کہیں گے۔''

ارے بھائی وہ ابھی نوجوان ہے، خدا نے دولت دی ہے، عیاشی کرتا ہے۔ کر لینے دو، سب ہی کیا کرتے ہیں مگر جب میں تمھارے گھر میں بیوی بن کر بیٹھوں گی تو وہی تمھاری عیاشی پر جواز کا فتویٰ دینے والے ناک بھوں سکوڑ کر کہیں گے ''لاحول ولاقوہ! یہ لڑکا کیسا نالائق و ناہنجار نکلا، خاندان کا نام ڈبو دیا توبہ توبہ!'' پھر کس کس سے تم بحث کرو گے، کس کس کو تم سمجھاؤ گے کہ تم نے زندگی کی ایک ڈوبتی ہوئی ناؤ کو بھنور سے نکالا ہے، تم نے ایک ناسور پر مرہم رکھا ہے۔ تم نے بدی کے خلاف نیکی کا جہاد کیا ہے ساری دنیا تم کو دھتکارے گی، تم ہر طرف سے ٹھکرائے جاؤ گے اور میرا کوڑھ تم کو بھی لگ جائے گا۔

جوشِ عشق میں دنیا والوں کو بھول نہ جاؤ۔ خدا تو اپنے بندوں کو ایک ہی دفعہ مارتا ہے۔ مگر دنیا والے اپنے مجرموں کو دن میں ہزار ہزار طریقوں سے قتل کرتے ہیں اور مرنے کے بعد بھی پیچھا کیے جاتے ہیں۔ تم میرے عشق سے پیچھا چھڑاتے ہو مگر ان دیوتاؤں سے بچ کر نہیں جاسکتے۔ وہ شکاری کتوں کے ایک غول کی طرح تمھارے دامن سے لپٹے رہیں گے! قوم کے 'معززین' کہیں گے ''اس کا چال چلن خراب ہے۔'' مولانا فرمائیں گے ''وہ فاسق و فاجر ہے—'' شیخ صاحب ''تمھارا نام لے کر لاحول پڑھیں گے۔'' میر صاحب زبان سے کچھ نہیں مگر ٹیڑھی آنکھوں سے تمھاری طرف دیکھیں گے۔

پھر کیا کرو گے؟ میرے دوست! زنا بہت بڑا اخلاقی گناہ ہے مگر صرف عورت کے لیے، مرد زانی ہو تو بھی معصوم ہے عورت زانیہ نہ بھی ہو مگر غیر مردوں کے ساتھ کچھ ارتباط رکھتی ہو تو وہ گردن زدنی— یہ مرد کا قانون ہے ہمارے دامن کا کوئی دھبہ دھویا نہیں جاسکتا، ان کے دامن کے لاکھوں دھبے ایک شوب میں صاف ہوجاتے ہیں — زنا اور شراب اور اس سے بھی بدتر خصائل مرد کے لیے عیب نہیں، صرف عورت ہی کو پھانسی اور سولی کے قابل بناتے ہیں۔ یہ قانون مرد کا ہے! 'سوسائٹی' ہر بدمعاش مرد کے چادر کے دھبوں کو بآسانی نظر انداز کرسکتی ہے مگر عورت کی چادر کی ہر شکن اس کو گناہ اور مکر سے آلودہ نظر آتی ہے بڑی سے بڑی ڈاڑھی لگا کر، بڑے سے بڑا عمامہ باندھ کر، لمبے سے لمبے جُغے پہن کر، تم اپنے حجرے میں گناہ کرو۔ لوگ کہیں گے عبادت کررہے ہیں، وہ تمھارے ہاتھ چومیں گے، مگر ہر عورت جو تمھارے بنائے ہوئے قانون کی خلاف ورزی کرے گی۔ تمھاری نظر میں فاحشہ ہوگی، مرد کی اس شریعت بحکم کی گرفت سے نکل کر ہم تم کہاں جاسکتے ہیں؟ بہتر یہ ہے کہ اس فسق و فجور پر ہی قناعت کرو! ہر شب مجھ سے بیاہ کرلیا کرو اور ہر صبح مجھے طلاق دے کر گھر چلے جایا کرو— شب بھر کے لیے نکاح اور دن بھر کے لیے طلاق!

■

ماخذ: لیلیٰ کے خطوط: قاضی عبدالغفار، تاریخ اشاعت: 1992،
ناشر: ساقی بک ڈپو، دہلی

ترتیب و تدوین: عطاء الرحمٰن قاسمی

عبدالماجد دریابادی

مولانا محمد علی

اور

گاندھی

کی یادمیں

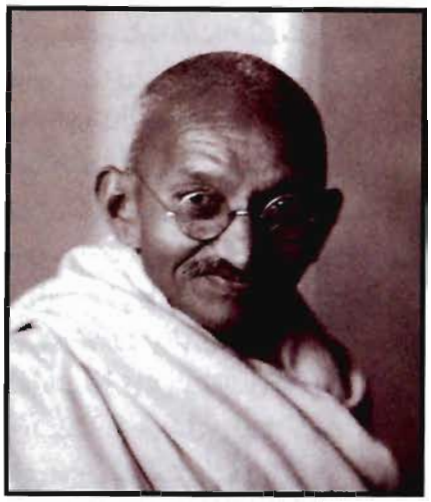

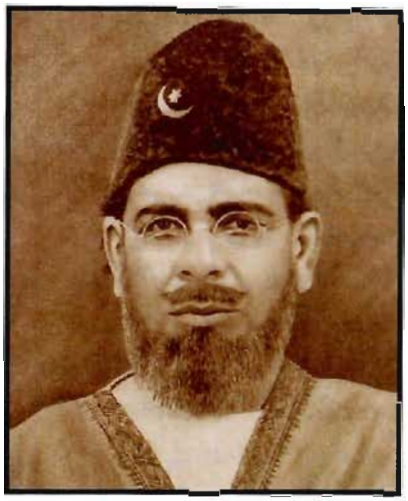

جنگل میں منگل: 'ہندو پرستی'

صدمے ہوں یا مصائب، دنیا کے کاروبار بہرحال چلتے ہی رہتے ہیں۔ محمد علی صدر کانگریس کے لیے کیوں کر ممکن تھا کہ غم منانے کو کسی گوشہ میں بیٹھ جاتے۔ نقل وحرکت، مسلسل دورے اور انتہائی مشغولی صدر کانگریس کے لیے لازمی ہیں۔ محمد علی اس سے کیسے بچے رہ سکتے تھے۔ اکیلے خط وکتابت ہی کا کام وقت گھیرے رکھنے کے لیے کافی تھا۔ کانگریس کی طرف سے صدر کو سال بھر کے لیے ایک پرائیویٹ سکریٹری مل جانے کا دستور ہے۔ مولانا نے ایک رام پوری نوجوان محمد بشیر نامی کو اس کام پر رکھا تھا۔ پھر بھی ڈاک کا کام اتنا زائد تھا کہ نپٹائے نہ نپٹتا۔ ہندو مسلم فسادات کو 20، 21 میں کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ 24 کے شروع میں ان کی وبا پوری طرح پھوٹ چکی تھی اور جیل جاتے وقت محمد علی ملک کی جو فضا چھوڑ گئے تھے، اب اس کے بالکل برعکس تھی۔ بات بات پر بدگمانی اور بے اعتمادی۔ ایک طرف شدھی اور سنگٹھن کا زور، دوسری طرف اس کے جواب میں تبلیغ وتنظیم۔ بات شروع ہوئی سیاسیات سے اور پہنچ گئی دھرم اور ایمان تک۔ اب سب کو گاندھی جی کے چھوٹنے کا انتظار تھا، دیکھیے مہاتما جی آکر اس زہر کا کیا تریاق پیش کرتے ہیں۔ گاندھی جی مارچ میں بالآخر چھوٹے، اور آخر مئی میں ان کا مفصل بیان ہندو مسلم اتحاد پر ان کے انگریزی ہفتہ وار ینگ انڈیا میں نکلا۔

محمد علی دورہ پر اس وقت لکھنؤ آئے ہوئے تھے اور حسب معمول محل سرائے فرنگی محل میں مقیم تھے۔ دوپہر کا وقت تھا اور میں ان کی خدمت میں حاضر۔ دو ایک صاحب اور بھی تھے کہ کہیں سے ینگ انڈیا آیا اور مولانا جو اس کے لیے ہمہ انتظار واشتیاق تھے۔ جلدی جلدی اسے سب پڑھ گئے۔ مگر پڑھ کر کچھ زیادہ خوش نہیں ہوئے۔ تفصیل تو اب اتنے عرصہ کے بعد ذہن میں نہیں۔ اتنا یاد پڑتا ہے کہ گاندھی جی کے بعض ہندو مشیروں اور مقربانِ خاص پر مولانا بہت بگڑے۔ ان لوگوں سے یوں بھی کچھ زیادہ خوش نہیں رہا کرتے تھے۔ ہندو پبلک لیڈروں میں مولانا دل سے مداح ومعترف صرف دو شخصوں کے تھے۔ ایک پنڈت جواہر لعل نہرو (نہ کہ ان کے والد ماجد پنڈت موتی لعل کے) دوسرے مدراسی صدر کانگریس سری نواس آینگر کے۔ باقی اکثر کو تو وہ کم فہم وکم عقل یا غالی یا متشدد سمجھتے تھے۔ اور بعض کو تو کھلم کھلا بددیانت وغیر مخلص۔

جولائی کا مہینہ تھا کہ علی برادران پھر لکھنؤ آئے۔ اور اب کی لکھنؤ ونواحِ لکھنؤ میں گھومنے پھرنے کے لیے کئی دن کے لیے۔ اصلاً یہ دورہ مولانا شوکت علی کا تھا اور اس کا نام انھوں نے 'آم کا دورہ' رکھا تھا، اور محمد علی کی حیثیت سے محض ذیلی وتبعی تھی۔ جوار میں قدیم شرفا کا ایک چھوٹا سا قصبہ بڑا گاؤں ہے۔ بارہ بنکی اسٹیشن سے کوئی 8 میل کے فاصلہ پر اور بانسہ، رسولی اور مسولی تو گویا اس کے بالکل پڑوسی ہی ہیں، زمینداری قدوائی حضرات کے قصبہ میں۔ اور یہ لوگ بڑے خوش انتظام وخوش مذاق، کھانے اور کھلانے دونوں کا سلیقہ خاص رکھنے والے، اور اپنی میزبانیوں کے لیے مشہور۔ خاندان کا ایک بڑا حصہ مولانا فرنگی محلی کا حلقہ بگوش اور نیاز مند خصوصی۔ ایک رئیس زادہ حاجی شیخ الطاف الرحمٰن اس خصوص میں اور سب سے آگے بڑھے ہوئے۔ ان ہی نے مولانا شوکت علی کی آم کی دعوت اس موسم میں کردی تھی۔ برادران پہلے لکھنؤ آئے اور وہاں سے موٹر پر بڑے گاؤں۔ میرا ساتھ رہنا دونوں جگہ لازمی ہی تھا۔ بڑے گاؤں میں 20، 18 گھنٹہ کا وقت بڑے لطف اور دلچسپیوں کے ساتھ کٹا..... چھوٹے سے قصبہ میں شہر کی سی چہل پہل پیدا ہوگئی تھی۔ 'جنگل میں منگل' کا نمونہ نظر آگیا۔ بزرگ خاندان خان بہادر حاجی شیخ نثار الرحمٰن مرحوم (شیخ شفیق الرحمٰن قدوائی جامعی کے دادا) زندہ تھے، انھوں نے سیر چشمی اولوالعزمی، مہمانداری کا حق ادا کردیا۔ یہ پرانے زمانے کے آدمی اپنے نوعمر پوتے شفیق کی سیاسی آزاد خیالیوں سے سخت ناخوش تھے، محمد علی نے صبح چلتے وقت ان سے خاص طور پر سفارش کرکے شفیق کے جرم معاف کرائے۔ علی برادران شام کے قریب پہنچ گئے تھے۔ رات کو پرتکلف دعوت اور قوالی رہی۔ صبح کو چائے اور پرتکلف ناشتہ کے بعد روانہ ہوئے اور بجائے سیدھے لکھنؤ جانے کے مسولی اور بانسہ چلنے کی ٹھہری۔ سڑکیں اس وقت تک کچی تھیں۔ سواری بیلوں کی تجویز ہوئی۔ اچھے سے اچھے بیل ان میں جتے۔ مسولی میں محمد علی کے عاشق صادق اور کامریڈ کے مشہور ظریف مضمون نگار، جوانمرگ شیخ ولایت علی بی اے، ایل ایل بی (علیگ) معروف بہ بمبوق کا مکان تھا اور یہیں مزار بھی۔ محمد علی کے

لیے کیسے ممکن تھا کہ اتنے قریب آکر کے ان کی تربت پر فاتحہ پڑھنے نہ جاتے۔ وہ لوگ ادھر گئے، میں سیدھا بانسہ چلا آیا، جہاں اپنی قریب کی عزیزداری تھی۔ بانسہ میں سیدشاہ عبدالرزاقؒ کی درگاہ بہت مشہور اور مرجع خلائق ہے۔ حضرات فرنگی محل وہاں کے خاص ارادت مندوں میں ہیں۔ علی برادران مسولی ہوکر وہاں بھی آئے اور صاحبِ سجادہ ممتاز میاں صاحبؒ کی خدمت میں نذر بھی پیش کی...... 'نذر' یہ بیچارے کہاں سے پیش کرسکتے تھے۔ ان کے مرشد مولانا عبدالباریؒ نے یہ سمجھایا کہ درگاہوں کے آدابِ حاضری میں یہ نذرانہ کی پیشکش بھی داخل دستور ہے۔ اور خود ہی نقدی کی ایک معقول رقم دونوں بھائیوں کے ہاتھ میں دے بھی دی۔

محمد علی اس سال صدر کانگریس تھے۔ لکھنؤ سال میں تین چار بار آتے اور ہر بار پذیرائی بھی خوب دھوم دھام سے ہوتی۔ ایک بار شاید آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جلسہ بھی لکھنؤ میں رکھ دیا۔ ہندو لیڈر بکثرت آئے۔ سب کی دعوت اسی محل سرائے فرنگی محل میں مولانائے فرنگی محلی کی طرف سے بڑے وسیع پیمانے پر ہوئی...... میں ہر دفعہ خبر پاکر دریاباد سے لکھنؤ آتا اور جب تک محمد علی رہتے موجود رہتا، دعوتیں ہوتیں، جلسے ہوتے، قوالی کی محفلیں ہوتیں۔ اپنی خلوت پسندی اور اکل کھرے پن کو یہ چیزیں بہت بار معلوم ہوتیں، خاص کر قوالی کے ہوحق سے تو طبیعت بابار جھنجھلا اٹھتی اور کبھی کبھی اتنا خستہ وزار ہوجاتا کہ روٹھ کر ان محفلوں سے اٹھ آتا۔ محمد علی کی شخصیت میں وہ جاذبیت اور جادو تھا کہ یہ بیزاری کبھی بھی دیر تک نہ قائم رہنے پاتی۔

لیکن دعوتیں ہوں یا جلسے، قوالی یا آم خوری، خلافت اور کانگریس کا کام بھی ساتھ ساتھ جاری ہی رہتا، اور تفریح محض تفریح نہ رہتی۔ گاندھی جی کا بڑا زور سوت کاتنے اور چرخہ چلانے پر تھا۔ محمد علی چرخہ برابر ساتھ رکھتے اور سوت ایک مقدار معین میں کاتتے جاتے۔ لوگوں سے باتیں کرتے رہتے اور چرخہ چلتا رہتا...... کھانے پینے میں، ملنے ملانے میں، بات چیت میں، بعض وقت بہت دیر ہوجاتی، اور نماز وقت سے بے وقت ہونے لگتی۔ لیکن نماز چھوٹنے کبھی نہ پاتی۔ عشا کی نماز بارہا آدھی آدھی رات گزر جانے پر پڑھتے، لیکن بہر حال پڑھ ضرور لیتے۔

ایک مرتبہ رات گئے نشست فرنگی محل ہی میں تھی، اور بالکل تخلیہ تھا۔ ذکر گاندھی جی کا نکلا اور میں نے ان کی روحانیت، تقدس اور مہاتمائیت سے متعلق اپنی عقیدت مندی کے تاثرات ظاہر کرنے شروع کیے۔ یقین تھا کہ مولانا ضرور اس کی تائید کریں گے۔ برعکس اس کے، اس کی تردید شروع ہوگئی، اور الٹی مجھ پر ڈانٹ پڑنے لگی۔ ''میں گاندھی جی کی نہ روحانیت کا قائل ہوں نہ ان کے کشف وکرامات کا۔ نہ ان کا شمار اولیاء اللہ میں کرتا ہوں۔ ان کا مذہب الگ میرا مذہب الگ۔ ہاں انھیں اپنا سیاسی سردار تسلیم کرتا ہوں۔ وہ ملک کے اس وقت سب سے

YOUNG INDIA.

PUBLISHED EVERY WEDNESDAY AND SATURDAY.

BOMBAY, SATURDAY, MAY 10, 1919.

Pragjee Soorjee & Co.

DEALERS IN

ANILINE AND ALIZARINE DYES

SULPHUR COLOURS

DIRECT COLOURS

BASIC COLOURS

PRAGJEE SOORJEE & CO.

Chartered Bank Building, Esplanade Road, Fort,

BOMBAY.

GODREJ & BOYCE

SAFE MAKERS

EMPIRE AUTOMOBILES

The Indian Mercantile Insurance Co. Ltd.

Marble

English Flooring Tiles

Broken Mosaic Tiles

Asbestos Cement

Sheets and Stelell-ings

SETHNA & CO.

Motor Accessories Supply COMPANY

AN EMPORIUM OF

Seraijmal Lalubhai & Co.

DIAMOND MERCHANTS

AND

JEWELLERS,

BOMBAY.

بڑے اور مخلص لیڈر ہیں۔ انگریزی کی محکومی سے ہمیں نجات مل سکتی ہے تو ان ہی کے ذریعہ اور واسطہ سے۔ بس میری رفاقت واطاعت ان کے ساتھ اسی حد تک محدود ہے۔ یہ آپ کا محض غلو ہے، جو آپ انھیں مرتبۂ ولایت پر رکھ رہے ہیں۔ جس طرح مذہب سے بیزاری میں آپ ایک سرے پر پہنچ گئے تھے اس طرح مذہب کے ماننے میں آپ دوسرے سرے پر پہنچے جاتے ہیں''...... اس قسم کی تلقین، زجر وملامت کے لہجہ میں کئی منٹ تک جاری رہی۔ اور یہ عین اس زمانہ میں جب کہ ایک اندھی اور بہری دنیا محمد علی کی ہندونوازی کا ڈھول پیٹ رہی تھی اور محمد علی کی 'گاندھی پرستی' کو اچھال رہی تھی! محمد علی مظلوم تو تھے ہی، لیکن ظالم ان کے حق میں سب سے بڑھ کر کوئی غیر نہیں، خود ان ہی کی قوم تھی!

ہمدرد اور کامریڈ: نقش ثانی

قیام اب تک علی گڑھ میں تھا۔ گویا یہی گھر تھا۔ اب دہلی منتقل ہوئے، اور کامریڈ اور ہمدرد کے دوبارہ اجرا کا ارادہ پختہ ہوا۔ فضا کا حال دیکھ دیکھ کر کڑھ رہے تھے اور اخبارات نکالنے کا قصد اسی خیال سے کیا کہ ان کے ذریعہ فضا درست کریں گے۔ ہندو مسلمان بات بات پر لڑ رہے تھے۔ اور قوتوں کا رخ بجائے حکومت سے مقابلہ کے خانہ جنگیوں کی طرف پھرا ہوا تھا۔ اگست ستمبر کا زمانہ ہوگا جب دہلی آگئے۔ اور وہی مکان پھر کرایہ پر لیا، جس میں دس برس پہلے رہا کرتے تھے۔ کوچۂ چیلان کا اجڑا ہوا نشیمن مدت کے بعد پھر آباد ہوا۔ مکان تھا بہت بڑا اور وسیع۔ نیچے کے حصے میں برقی پریس کی مشینیں اور پریس کا سارا کاروبار۔ کوٹھے پر منیجر، خزانچی اور عملہ وکتابت وغیرہ کے دفتر۔ صیغۂ ادارت کے بھی چھوٹے چھوٹے لیکن الگ الگ کمرے اور کامریڈ کے سب ایڈیٹر کا کمرہ تو بالکل ہی الگ۔ مختصر صحن، پاخانہ، غسل خانہ۔ دوسری طرف خود مولانا کا بڑا سا آفس اور ڈرائنگ روم۔ اسی طرف سے نیچے زنانہ مکان کا بھی راستہ۔ اوپر اور نیچے دونوں منزلوں میں دوتین فاضل کمرے، اچھے خاصے وسیع۔ مولانا کے عزیزوں اور مہمانوں کے لیے۔ کبھی کبھی پھر بھی اتنا ہجوم ہوجاتا کہ مکان کی وسعت ناکافی ہوجاتی۔ باہر ایک اوسط درجہ کا احاطہ...... مکان کا موقع بھی برا نہ تھا۔ دریا گنج کا ڈاکخانہ قریب ہی، اور جامع مسجد بھی دہلی کے فاصلوں کے معیار سے قریب ہی۔ اسٹیشن بھی کچھ ایسا دور نہیں۔ ملا واحدی صاحب اور مفتی کفایت اللہ صاحب اور راشدالخیری صاحب کے مکانات اسی محلّہ میں۔

اخبار نکالتے وقت تجارتی پہلو نام کو بھی پیش نظر نہ تھا۔ مقصد تمام تر اصلاحی تھا۔ لیکن اب اخبار نکالنا آسان نہ تھا۔ 12 اور 24 میں زمین وآسمان کا فرق تھا۔ اس بارہ سال کی مدت میں، جنگ یورپ کے اثراتِ مابعد سے دنیا کی دنیا بدل چکی تھی۔

نکلے جو میکدہ سے تو دنیا بدل گئی

پہلی چیز تو مصارف ہی کی زیادتی تھی۔ ہر شے پہلے سے کہیں زیادہ گراں ہوگئی تھی۔ کاغذ کی قیمت، کاتبوں کی اجرت، اسٹاف کی تنخواہ ہر شے کا معیار بلند

ہو چکا تھا۔

پھر اس وقت محمد علی پوری طرح جوان تھے اور تندرست وتنومند، اکیلے سارا کام کر ڈالتے، جو کڑی پیش آتی جھیل ڈالتے۔ ہر طرح کی مشقت برداشت کرنے کو آمادہ۔ اب ایک تو سن کھسک آیا تھا۔ اور سن سے بھی کہیں بڑھ کر مصنف 6،5 سال کی نظر بندی اور دو برس کی اسیری، قومی مقاصد میں قدم قدم پر ناکامیاں اور مایوسیاں، خانگی اور ملی دونوں قسم کے صدمات ایک سے بڑھ کر ایک۔ سب پر مستزاد ذیابطیس کا مرض۔ ان سب نے مل ملا کر وقت سے کہیں قبل بوڑھا کر دیا تھا، کہا کرتے تھے کہ مردانہ قویٰ کے لحاظ سے 45 سال کی عمر میں میں 60 سال ہو چکا ہوں۔ محمد علی کے خلاف بغاوت وسرکشی کی ہوا آگے چل کر تو اور، اور بہت زائد تیز ہوئی۔ لیکن پھیلنا اور بھڑکنا اسی وقت سے شروع ہو گئی تھی۔ جنھیں 12 میں اس پر فخر تھا کہ محمد علی نے آج ان سے چوکی پر لوٹا رکھوایا، اور اپنی اس چاکری کو دوستوں کے مجمع میں فخر سے بیان کرتے تھے وہی 24 میں اب مدمقابل کی حیثیت سے سامنے خم ٹھونک ٹھونک کر آرہے تھے۔ اور گستاخیوں، دریدہ دہنیوں اور دلآزاریوں میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے تھے۔ کامریڈ کے سب ایڈیٹر راجہ غلام حسین اور کامریڈ کے صفحات کی رونق ''بمبوق'' دونوں مدت ہوئی اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ کامریڈ کے سابق منیجر بلکہ عقل کل عبدالرحمٰن صدیقی روٹھ کر کلکتہ جا چکے اور اپنا الگ کاروبار جما چکے تھے۔ ہمدرد کے سابق منیجر میر محفوظ علی بدایونی گوشہ نشینی اختیار کر چکے تھے۔ ہمدرد کے سب ایڈیٹر قاضی عبدالغفار مرادآبادی کی زندگی ایک نیا قالب بدل چکی تھی۔ اور دوسرے سب ایڈیٹر سید جالب دہلوی ہونے کے باوجود اب لکھنوی ہو چکے تھے اور ہمدم چھوڑ کر اب ہمدرد سے دوبارہ رشتہ جوڑنے پر کسی طرح آمادہ نہ تھے۔ ان سب اسباب نے مل جل کر ایک عجیب خلا کی سی کیفیت پیدا کر رکھی تھی۔

اور ان سب سے بھی بڑھ کر خود محمد علی کی لیڈرانہ عدیم الفرصتی۔ اور ہر کمی کی تلافی تو کچھ نہ کچھ ممکن تھی، لیکن اس کمی کی تلافی کی کوئی صورت ہی نہ تھی۔ لیڈری اور ایڈیٹری دونوں کا ساتھ نبھنا ہے دشواری...... 12 میں محمد علی محض ایڈیٹر تھے، لیڈری حاصل کر لی۔ 24 میں لیڈر محمد علی نے ایڈیٹر کی کرسی پر از سر نو جمنا چاہا، ناکامی مقدر ہو چکی تھی۔

غرض جہاں تک ظاہر مصلحت سنجیوں کا تعلق ہے، اس وقت محمد علی کے اخبار نکالنے کے کوئی معنی نہ تھے۔ لیکن اس جوش واخلاص کے پتلے کو ان ظاہری مصلحت شناسیوں کے ہوش وحواس تھے ہی کب؟ وہاں تو ہر شے 'مشنری اسپرٹ' (تبلیغی روح) کے ساتھ اور عبادت کے رنگ میں بنی۔ ایک ایک نقل وحرکت میں رنگ عبادت کا ہوتا تھا۔ ہر سانس کے ساتھ کوشش اس کے نقش قدم پر چلنے کی ہوتی تھی۔ جس کو حکم یہ ملا تھا، اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔ غرض ونفع ونقصان، سود وزیاں سے بالکل قطع نظر کر کے اخبارات کی اسکیم طے پا گئی... دوسرے مالکان اخبارات اتنے غیر کاروباری منصوبہ کو سمجھ ہی مشکل سے سکیں گے... اور مجھے حکم ملا کہ ستمبر میں دہلی پہنچ جاؤں اور ہمدرد کا پہلا پرچہ اپنے سامنے نکلوانے

THE COMRADE
BANK of WINNFIELD

کے بعد وطن واپس ہوں۔

اب پہلی بار سوال سرمایہ کا پیدا ہوا۔ مانا کہ پریس کی مشینیں پہلے کی موجود تھیں، اور کچھ اب منگالی گئی تھیں لیکن ظاہر ہے کہ مشین ہی تو سب کچھ نہیں، کاغذ کی قیمت، اسٹاف کی تنخواہوں کے لیے ہزاروں روپیہ ماہوار، مکان کا کرایہ وغیرہ وغیرہ، آخر ان سب کے لیے کیا سبیل تھی؟ اکبرالہ آبادی کا مشہور شعر رہ رہ کر یاد آرہا تھا:

کھلا دیواں میرا تو شور تحسیں بزم سے اٹھا
مگر سب ہو گئے خاموش جب مطبع کا بل آیا

اور اسی شعر سے رشتہ رکھنے والا ایک اور شعر بھی تو اسی حکیم شاعر کا ہے:

اٹھا تو تھا ولولہ یہ دل میں کہ صرف یاد خدا کریں گے
معاً مگر یہ خیال آیا ملی نہ روٹی تو کیا کریں گے

اب اللہ جانے محمد علی نے کن کن دوستوں مخلصوں سے کن کن طریقوں سے، جوڑ بٹور کر کچھ روپیہ فراہم کیا۔ کراچی کے سیٹھ آنرایبل حاجی عبداللہ ہارون کا نام اچھی طرح یاد ہے۔ اس وقت یہ مولانا کے خاص مخلصوں میں تھے۔ رقم آج 1948 کے معیار سے تو کچھ بڑی نہ تھی۔ ہزار ہی دو ہزار کی تھی، لیکن اس وقت اچھی خاصی تھی۔ کچھ دھندلا سا خیال بمبئی کے جوانمرگ سیٹھ عمر ثوبانی کے نام کا بھی آرہا ہے۔ بڑی توقعات والی محمودآباد سے (جو راجہ سے اب مہاراجہ ہو چکے تھے) تھیں، پوری نہ ہوئیں۔ علی برادران کے پیرومرشد مولانا عبدالباری فرنگی محلی بھی اکثر کاموں میں مالی امداد دیتے رہتے تھے۔ خیال نہیں آتا کہ اس میں بھی شریک ہوئے یا نہیں۔

میرے پاس حکم نامے شروع ستمبر ہی سے پہنچنے شروع ہو گئے تھے کہ دہلی اڑ کر پہنچوں اور اسٹاف وغیرہ کے انتخاب میں مدد دوں۔ اپنے حسن ظن کی بنا پر محمد علی کامریڈ تک میرے مشورہ کو ضروری سمجھ رہے تھے، اور ہمدرد کے اسٹاف کا تقرر تو گویا موقوف ہی میرے مشورہ پر تھا...... ادھر سے بھی دونوں اخباروں کے لیے خریداروں کی چھوٹی موٹی فہرستیں ستمبر بلکہ شاید اگست ہی سے روانہ ہونی شروع ہو گئی تھیں۔

بشیر صاحب رامپوری (صدر کانگریس مولانا کے پرائیویٹ سیکریٹری) کا مکتوب مورخہ 6 ستمبر 24 ومضمون ذیل لے کر موصول ہوا۔

السلام علیکم

آپ کا پوسٹ کارڈ کل مولانا صاحب کے نام موصول ہوا۔ ہردو اصحاب کے نام ہمدرد کامریڈ کی خریداری کے لیے درج کر لیے گئے ہیں۔

شکریہ

اس سے قبل کے ناموں کا بھی اندراج کیا جا چکا ہے۔

مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ آپ تو پوچھ رہے ہیں کہ پرچوں کا اجرا کب ہوگا مگر خود تشریف نہیں لاتے۔ آپ جس قدر جلد یہاں تشریف لے آئیں اسی قدر جلد پرچے بھی نکلنا شروع ہو جائیں گے۔ آپ کی موجودگی کی یہاں دو خاص ضرورتیں ہیں۔ اولاً مولانا صاحب نے اب تک ہر دو اخباروں کے عملوں کے تقرر کی نسبت قطعی فیصلہ نہیں کیا ہے۔ گودرخواستوں کا ایک دفتر ہے جو روزانہ چلا آتا ہے۔ مولانا صاحب آخری تقرر سے پیشتر آپ سے اس کے متعلق صلاح ومشورہ کرنا چاہتے ہیں۔ دوم یہ کہ اب تک مولانا صاحب کو ہر دو اخباروں کے لیے کوئی بھی ایسا آدمی نہیں مل سکا ہے جو ان کی قلمی امداد کر سکے۔

بالکل تن تنہا ہیں۔ اخبار چونکہ عنقریب نکلنے والے ہیں اس لیے مولانا صاحب کی خواہش ہے کہ آپ سے گفتگو کر کے کوئی دلچسپ سلسلۂ مضامین شروع کیا جائے۔ آپ مولانا صاحب سے وعدہ فرما چکے ہیں اور یہ ان کے ہاتھ بٹانے کا خاص وقت ہے۔ اس کام کے لیے ممکن ہو تو میر محفوظ علی صاحب کو بھی ساتھ لیتے آیئے۔

احمد آباد سے توکل مشینیں آ گئی ہیں۔ کلکتہ سے لیتھو کی مشینیں بھی روانہ ہو چکی ہیں ایک دو یوم میں وہ بھی یہاں پہنچ جائیں گی۔ صرف مشینوں کا لگانا باقی ہے، دوسرے ہفتہ میں نہیں تو تیسرے ہفتہ ستمبر میں اخبار کے نکلنے میں کوئی شبہ ہی نہیں''۔

گاندھی جی کی مہمانی

ایڈیٹوریل اسٹاف (عملۂ ادارت) کا سوال سرمایہ کے مسئلہ سے کچھ کم اہم نہ تھا۔ مولانا اس پر تلے ہوئے تھے کہ ان کی جیب پر بار جتنا بھی پڑ جائے۔ اسٹاف بہرحال بہتر سے بہتر ہی منتخب ہو۔ لیکن آہ کہ محمد علی کی بیسیوں دوسری آرزوؤں کی طرح اس آرزو کا بھی بالکل کیا معنی بڑی حد تک ہی پورا ہونا مقدر میں نہ تھا۔ کامریڈ کے لیے تو کہنا چاہیے کہ آخر تک بھی کوئی مددگار نہ ملا۔ درخواستیں جتنوں کی آتیں وہ مولانا کی نظر میں نہ جچتے۔ اور مولانا جنھیں لینا چاہتے وہ خود کسی نہ کسی معذوری سے آنہ سکتے۔ مولانا کی نظر پنجاب کے ملک عبدالقیوم بیرسٹرایٹ لا پر تھی، جو لندن سے 'مسلم آؤٹ لک' نکال چکے تھے۔ مولانا ان کے مضامین سے بہت خوش تھے۔ لیکن ان کی امداد بھی اس سے آگے نہ بڑھی کہ بس کبھی کبھی کامریڈ کے لیے کوئی مضمون بھیج دیتے۔ صوبہ برار کے مبین الرحمٰن بی اے، ایل ایل بی کے مضامین مولانا نے بمبئی کرانیکل میں پڑھے اور انھیں بہت پسند کیا۔ مدتوں ان سے مراسلت رہی اور برابران کی آمد کا انتظار رہا، بالآخر نہ آئے۔ اور اپنے صوبہ کی کونسل کے ممبر ہو گئے۔ سب سے زیادہ انتظار شعیب قریشی صاحب کا رہا (جن کی قسمت میں 6 سال کے بعد مولانا کا داماد ہونا لکھا تھا) علی گڑھ کے ایم اے، ایل ایل بی تھے۔ لندن میں بیرسٹری پڑھے ہوئے۔ بڑے مخلص اور پرجوش۔ نیوایرا (لکھنؤ) کو مدت تک سنبھالے رہے۔ پھر گاندھی جی کی گرفتاری پر ان کے انگریزی ہفتہ وار ینگ انڈیا کے ایڈیٹر رہ چکے تھے۔ کامریڈ کی سب ایڈیٹری کے ہر طرح اہل تھے۔ ان کے لیے سب کوششیں ہوئیں۔ ان کا دل نہ پسیجنا تھا نہ پسیجا۔ بمبئی سے ایک صاحب کی درخواست آئی، بڑے ہی نیازمندانہ اور معتقدانہ لب ولہجہ میں (اس سلسلہ کی ہر مراسلت اور درخواست میری نظروں سے گزرنا لازمی تھی) مولانا نے ان ہی کو غنیمت سمجھا، بہت خوشی سے تو نہیں، لیکن بہرحال انھیں بلا لیا۔ کچھ روز تو انھوں نے بھی اپنی درخواست کے انداز تحریک کو خوب نبھایا۔ اس کے بعد کامریڈ ہی سے علاحدہ نہیں ہوئے بلکہ مولانا کے بھی شدید ترین دشمن ہو گئے۔ اور انھیں اذیت پہنچانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ اللہ انھیں معاف فرمائے۔ مولانا کے انتقال کے چند ہی روز بعد یہ عالم آخرت میں پہنچ گئے۔

ہمدرد کے لیے امیدواروں کی کمی نہ تھی۔ مگر وہی

محمد علی اور شوکت علی جوہر

وقت یہاں بھی تھی۔ جنھیں ہمدرد چاہتا تھا وہ عنقا تھے۔ اور جو خود آنے کو تلے رہتے تھے ان کی میزبانی میں ہمدرد کو تامل تھا۔ مولانا کو اتنی بھی فرصت نہ تھی کہ ہر درخواست کو پڑھ سکیں۔ ساری ذمہ داری اسی نیازمند کے سر تھی۔ جالب صاحب سے میں نے زبانی گفتگو کی۔ وہ حضرت اب لکھنؤ کے قطب بن چکے تھے۔ وطن کی کشش بھی ہٹنے پر آمادہ نہ کر سکی، زمیندار (لاہور) کے سالک صاحب سے بھی مراسلت رہی مگر بے نتیجہ۔ آخری قرعۂ انتخاب ان چھ صاحبوں کے نام پڑا:

(1) محمد فاروق صاحب دیوانہ گورکھپوری، ایم اے (علیگ) ہمدرد کے دور اول میں بھی رہ چکے تھے۔ (بعد کے مشہور مسلم لیگی ایم ایل اے)

(2) احتشام الدین صاحب دہلوی، ایم اے (علیگ) بعد کے ممتاز لغت نویس۔

(3) عارف ہسوی صاحب، پرانے نیشنلسٹ اور کانگریسی پرچوں میں کام کیے ہوئے۔

(4) قاری عباس حسین صاحب دہلوی، ہمدم وغیرہ میں کام کیے ہوئے۔ ایک ماہنامہ تمدن بھی نکال چکے تھے۔

(5) محمد جعفری صاحب جامعی مچھلی شہری، جامعہ کے ہونہار نوجوان، ہمدرد میں شروع سے آخر تک رہے۔ بعد کو اپنا روزنامہ ملت نکالا۔

(6) حسن ریاض صاحب بلند شہری۔ (اپنا ایک ہفتہ وار نکال چکے تھے۔ مدت کے بعد لکھنؤ سے روزنامہ ہمت اور پھر دہلی سے لیگی روزنامہ مشہور نکالا)۔

ان میں سے دو صاحبوں کا تقرر مولانا نے بالکل اپنی پسند سے فرمایا تھا..... اردو کے کسی روزنامہ میں اس

وقت تک نہ سب ایڈیٹروں اور مترجموں کی اتنی تعداد تھی، اور نہ قابلیت کے اعتبار سے اتنا بہتر اسٹاف کہیں اور جمع تھا۔ غرض کچھ نہ ہونے پر بھی یہی ہمدرد کا اسٹاف کیفیت اور کمیت دونوں حیثیتوں سے اپنی نظیر آپ تھا۔

یہ بھی ٹھہری کہ مختلف مرکزی مقامات میں ہمدرد کے 'وقائع نگار خصوصی' مقرر ہوں، چنانچہ لکھنؤ، بمبئی، علی گڑھ وغیرہ میں وقائع نگاروں کا تقرر ہوا۔ اور مشاہیر اہل قلم سے درخواست کی گئی کہ سیاسی، علمی، ادبی، مذہبی عنوانات پر اپنے ماہرانہ وفاضلانہ مقالات سے وقتاً فوقتاً ناظرین ہمدرد کو مستفید کرتے رہیں..... یہ ساری خدمات مولانا کی نیابت میں ان کا یہ نیاز مند ہی انجام دیتا رہا۔

آہ انسانی دماغ کی خام خیالیاں اور بشری آرزوؤں اور تمناؤں کی خام کاریاں کیا کیا امنگیں اور حوصلے اس وقت تھے! بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ سارا ہندوستان خصوصاً اسلامی ہندوستان اپنی مٹھی میں آیا جارہا ہے۔ نیشنلزم اور اسلامیت کے جس رخ گھمانا چاہیں گے گھمادیں گے، جو بولی بلوانا چاہیں بلوادیں گے!

حاضری کا حکم مجھے وسط ستمبر کے لیے ملا تھا۔ پہنچا۔ گاڑی اسٹیشن پر بعد مغرب پہنچتی تھی۔ گھر پہنچتے کچھ اور دیر لگی تو دیکھتا کیا ہوں کہ دروازہ پر کانگریسی والنٹیروں کا پہرہ! زینہ پر چڑھنا چاہا تو فوراً مجھ سے پوچھ گچھ، سوال جواب شروع ہوگئے! آپ کون ہیں؟ کس کے پاس آئے ہیں؟ کیا کام ہے؟..... یا اللہ! یہ کیا! معلوم ہوا کہ گاندھی جی آئے ہوئے ہیں اور اب کی مولانا ہی کے مہمان ہیں۔ گاندھی جی باوجود اپنی مشہور عالم سادگی کے سفر مع حشم وخدم کے کرتے تھے۔ ساتھ میں پرائیویٹ سکریٹری (اس وقت مہادیو ڈیسائی تھے) اور فلاں فلاں، پھر مہمانی کے بھی خاص خاص شرائط۔ اتنے بڑے قافلہ کا ٹھہرانا آسان نہ تھا۔ پھر مولانا کے مکان اور دفتر میں اتنی گنجائش ہی کہاں تھی۔ لیکن مولانا تو جہاں تک کسی کی بھی میزبانی اور مہمانداری کا تعلق ہے، ایثار اور بے نفسی کے پتلے تھے، چہ جائیکہ گاندھی جی کے لیے! وہ دہرا بڑا کمرہ جو ان کا آفس بھی تھا اور ڈرائنگ روم بھی۔ اس میں انھوں نے گاندھی جی کو جگہ دے دی۔ اور ان کے اسٹاف والوں کے لیے اپنا مہمانوں کا وسیع کمرہ بالکل خالی کردیا۔ ڈرائنگ روم کی عمارت اب بھی وہی تھی جسے دس سال قبل 14 میں دیکھ گیا تھا۔ فرق یہ تھا کہ اس وقت کمرہ مخملی کوچ، صوفے وغیرہ 'صاحبانہ' فرنیچر سے آراستہ تھا۔ اب اس سب کے بجائے فرش زمین پر صرف ایک سبز رنگ کی دبیز دری کا فرش تھا۔ اسی پر گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ آفس کے حصہ میں ایک بڑی سی میز، چند کرسیاں اور کتابوں کی دو تین الماریاں۔ غرض جس طرح بھی بن پڑا مولانا نے ان سب معزز مہمانوں کے لیے گنجائش نکالی۔ اب میں جو پہنچا، تو مولانا مجھے اپنے ذاتی کمرے میں لے گئے اور وہیں سلایا..... ہجوم کی کمی یوں بھی کب رہتی تھی، اور اب تو

MOHUMMAD ALI URDU DAILY 'HAMDARD'

ہمدرد

برقیات

گاندھی جی کی ذات ہے، ایک میلہ سا لگا ہوا۔ مولانا ہر وقت مہمانداری میں مصروف، کامریڈ اور ہمدرد کے لیے بات کرنے کی فرصت ہی اب کسے؟ جس غرض کے لیے میری طلبی ہوئی تھی، وہ مقصد ہی فوت! خیر دنیا بہ امید قائم۔ آس یہ بندھی کہ دو چار دن میں یہ ریل پیل ختم ہوجائے گی، اور جب مولانا سے بہ اطمینان گفتگو کا موقع نکل سکے گا۔

مولانا کھانا عام طور سے وہی کھاتے تھے جو خوشحال شریف مسلمان گھرانوں میں کھایا جاتا تھا۔ قورمہ، اور کبھی قلیہ کبھی کباب، کبھی دوپیازہ۔ غرض گوشت کے کھانے دو ایک قسم کے تو ضرور ہی ہوتے تھے۔ اب کی کیا دیکھتا ہوں کہ گوشت کی ہر قسم یکسر غائب، ہندو سبزی خور مہمانوں کی خاطر دسترخوان پر صرف سبزی ہی سبزی! گاندھی جی کے معمولات تو سب سے الگ اور نرالے ہی تھے، ان کے ساتھ کھانے کی شرکت کسی کو کیوں نصیب ہونے لگی تھی لیکن ان کے سکریٹری مہادیو ڈیسائی وغیرہ مولانا کے دسترخوان پر ہم لوگوں کے ساتھ ہی ہوتے۔ ان ہی کی رعایت سے مولانا نے خود بھی اتنے دنوں کے لیے گوشت کھانا چھوڑ دیا تھا۔ ایک آدھ وقت تو خیر نبھ گیا لیکن اس کے بعد تو مسلمان مہمانوں کی (اور ان میں مولانا کے اعزہ معظم صاحب وغیرہ سب شامل تھے) بری حالت ہوگئی۔ دسترخوان پر بیٹھتے ہی طبیعتوں پر جھنجلاہٹ غالب آجاتی اور عجب نہیں ہے دل ہی دل میں گاندھی جی پر کوسنے بھی پڑجاتے ہوں! ..... محمد علی کھانے اور اچھے کھانے کے بڑے ہی شوقین تھے۔ ان کے لیے یہ قورمہ اور قلیہ اور پلاؤ اور کباب سے پرہیز ایک شدید مجاہدہ سے کم نہ تھا۔ لیکن بہرحال وہ مجاہدوں کے خوگر ہوگئے تھے اور اس طعامی مجاہدہ کو ہنسی خوشی برداشت کررہے تھے۔

دو دن گزرے اور تین دن گزرے، گاندھی جی کو اتنا قریب سے دیکھنے کا موقع مجھے اور کبھی کیوں نصیب ہوتا۔ اس وقت مولانا کے طفیلیوں میں مفت مل رہا تھا لیکن مولانا سے کامریڈ اور ہمدرد پر گفتگو کا موقع نہ آج ملتا ہے نہ کل۔ نہ صبح کو نہ شام کو۔ مولانا وقت کے نظم وانضباط پر کہیں بھی قادر نہ تھے اور اس باب میں گاندھی جی کے بالکل برعکس واقع ہوئے تھے، وہاں تو جیسے ایک ایک منٹ نپا تلا ہوا رہتا تھا۔ کھانے پینے، سونے جاگنے، غسل، ہوا خوری، ملاقات، ہر ہر چیز کے وقت بندھے ہوئے تھے۔ ویسے ہی یہاں ہر چیز میں بدنظمی تھی۔ کھانا نکل کر آگیا، دسترخوان پر لگ گیا، پڑا ٹھنڈا ہورہا ہے اور مولانا ہیں کہ اپنے کسی ملاقاتی سے گرما گرم مباحثہ میں مشغول ہیں۔ اٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ ساتھیوں کی آنتیں قل ھواللہ پڑھ رہی ہیں۔ راتوں کو بلاضرورت شدید، گیارہ گیارہ، بارہ بارہ بجے تک جاگ رہے ہیں۔ کام کرنے پر جت گئے تو اب کھانا اور سونا سب غائب۔ روزمرہ یہی رہتا اور اصل مشغولیت کے ساتھ یہ بدنظمی بھی ہر کام میں شامل رہتی... دن ٹلتے چلے گئے اور مفصل گفتگو کا موقع نہ نکلنا تھا نہ نکلا۔

■

ماخذ: کلیاتِ ماجدی (جلد اوّل) شخصیت، ترتیب و تدوین: عطاء الرحمٰن قاسمی، سنہ اشاعت: 2013، ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

نوآبادیاتی ادب اور پس نوآبادیاتی رجحان

سراج احمد انصاری

نوآبادیات اور پس نوآبادیات دونوں ایک سکے کے دو پہلو ہیں ایک کو بغیر سمجھے دوسرے کے متعلق گفتگو کرنا ناحق ہے۔ تصور ذہن میں گنجلک ہو جائے گا اور اصل بات مخاطب اور سامع کے بیچ میں معلق ہو کر رہ جائے گی۔ جب ایڈورڈ سعید کو Orientalism میں Postcolonialism کے بارے میں جانکاری بہم پہنچائی ہوئی تو پہلے انھوں نے Colonialism کے بارے میں بتایا بعد میں Postcolonialism کے تعلق سے لوگوں کو سمجھایا۔ چنانچہ پہلے نوآبادیات کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تاکہ پس نوآبادیات کو سمجھنے میں کسی قدر آسانی ہو۔

'نوآبادیات' انگریزی کے Colonialism کا ترجمہ ہے جو Colony سے ماخوذ ہے، اور یہ آیا ہے اطالوی لفظ Colonia سے جس کے معنی ہے وہ جگہ جہاں کھیتی باڑی کی جائے۔ (A place for agriculture)۔ اصطلاح میں نوآبادیات اس نظام کو کہتے ہیں جو ایک ملک اپنے حصول مقصد کی خاطر دوسرے ملک میں آبادیاں (Colonies) قائم کرتا ہے۔ یہ ایک طرح کا غیر مساوی رویہ ہے جو ملکی اور غیر ملکی عوام کے بیچ میں قائم ہوتا ہے۔ کرسٹوفر کولمبس نے 1491 میں امریکہ کی تلاش کی، اس کے بعد سے یوروپین نے امریکہ کے ساتھ ساتھ پورے عالم میں اپنی آبادی (Colonies) قائم کرنا شروع کر دیا۔ پرتگالی، اسپینش، برٹیش، ڈچ اور فرانسیسی اپنا ملک چھوڑ کر امریکہ، افریقہ اور ایشیا جیسے برّاعظم میں بسنے لگے۔ ان کے بسنے کی خاص وجہ اپنے ذریعۂ معاش کو بڑھاوا دینا تھا۔ ان کا ماننا تھا کہ اگر سونا اور دوسری قیمتی چیزیں ایک ساتھ ملیں گی تو سکہ تیار ہوگا جس سے ہماری طاقت میں مضبوطی آئے گی۔ الغرض Colonies کو دوسرے ملکوں کے ساتھ تجارت پر پابندی لگا دی گئی اور صرف اپنے مادر وطن کے ساتھ تجارت کرنے کا حکم ہوا۔

یوروپین نے جس جگہ اور جس علاقے میں قدم رکھا تجارت کے ساتھ ساتھ اپنی حکومت مضبوط کرنے کا منصوبہ بنایا۔ فوجیں تیار کیں اور بہت سے علاقوں پر دھاوا بول دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ جن علاقوں پر وہ آسانی سے قابض نہیں ہو سکتے تھے وہ علاقے بھی ان کے اختیار میں آ گئے۔ ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی اس کی بہترین مثال ہے۔ 1857 کے بعد ہندوستان کے ہر شعبے میں ان کی مداخلت ہوگئی اور لوگ اپنے ہی گھر میں غیر ملکیوں کی زندگی بسر کرنے لگے۔ یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ جب کوئی قبیلہ یا قوم کسی دوسرے قبیلے یا قوم پر قابض ہوتی ہے تو محکوم قوم اپنے آپ کو کم تر اور کم وقعت تصور کرنے لگتی ہے۔ حاکم طبقے کی یہ پالیسی ہوتی ہے کہ محکومین کا نہ صرف سیاسی یا معاشی استحصال کیا جائے بلکہ ثقافتی، مذہبی اور ذہنی طور پر بھی ہراس کیا جائے۔

1857 کی شکست و ریخت صرف سیاسی شکست و ریخت نہ تھی بلکہ ذہنی سماجی، تہذیبی، مذہبی اور ثقافتی بھی تھی۔ ہندوستانی مغرب سے آئی بیشتر چیزوں کو بڑی آسانی اور بغیر کسی تامل کے قبول کر رہے تھے۔ علمی، ادبی، ثقافتی، اور فنی ترقی دکھا کر انگریز ہندوستانیوں کا دل جیتنا چاہتے تھے جس میں ہندوستان کی ترقی کم ان کا ذاتی مفاد زیادہ شامل تھا۔ ایسے ہی ناگفتہ حالات میں اردو کی پرورش ہو رہی تھی ہمارے سیاسی، سماجی اور ادبی علما (سرسید، نذیر احمد، حالی اور شبلی) انگریزوں کی حمایت اور انگریزی کی ترقی میں بڑے انہماک سے سرگرداں تھے۔

ہمارے رہنماؤں نے نہ صرف وفادارانہ سیاست کی تبلیغ کی بلکہ عوام کو برطانوی حکومت کی برکتوں سے خاموشی کے ساتھ مستفیض ہونے کا مشورہ دیا اور حالی، سرسید، نذیر احمد اور شبلی چاروں نے برطانوی حکومت کے ساتھ وفاداری برتنے کے لیے اسلامی تعلیمات سے جواز بھی پیش کیا۔ سرسید کے نوآبادیاتی ذہن کو سمجھنے کے لیے ان کے کارناموں پر نظر کرنا از بس ضروری ہے۔ ایک مناجات میں سرسید نے انگریزوں کی کھل کر حمایت کی ہے اور ملکہ وکٹوریہ کو دعائیں دی ہیں۔ سرسید کا خیال تھا کہ انگریز ہمارے حاکم ہیں اور یہ ہمیشہ ہی رہیں گے اس لیے ان کی بغاوت ہماری قوم کے لیے مضر ہے۔ ان کی نظر میں انگریزوں کی حکومت اللہ کی طرف سے مسلط کی گئی ہے اور اللہ جو کرتا ہے ہماری بہتری کے لیے ہی کرتا ہے۔

سرسید نے انگریزوں سے قبل کی حکومت کو مضر بتایا اور 1857 کی جنگ میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے جس طرح متحد ہو کر انگریزوں کے خلاف جنگ کی اور یگانگت کا مظاہرہ کیا اس پر نہ زور دے کر پرانی باتوں پر اپنے دھیان کو مرکوز کرنا بہتر سمجھا۔ ان کا ماننا تھا کہ اب حکومت انگلیشیا ہی ملک میں امن و امان قائم رکھ سکتی ہے۔

سرسید کے ساتھ ساتھ ڈپٹی نذیر احمد بھی برطانوی حکومت کی پر زور حمایت پر کمر بستہ تھے، ایک طرف ہندوستان میں برطانوی سامراجی حکومت کے خلاف احتجاج ہو رہا تھا، دوسری طرف نذیر احمد جیسے دانشور احتجاج کی مخالفت اور برطانوی حکومت کی حمایت میں ہمہ تن مصروف تھے۔ نذیر احمد نے اپنی تحریروں میں ایسے بہت سے جملے لکھے ہیں جس سے ان کے سیاسی شعور کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

''جب خدا نے انگریزوں کو ملک پر مسلط کر دیا اور ہم نے رعایا بن کر ان کے ملک میں رہنا اختیار کیا تو اس کے یہی معنی ہیں کہ ہم میں اور انگریزوں میں ایک طرح کا معاہدہ ہو گیا کہ انگریز حاکم ہونے کی حیثیت سے ہمارے حقوق کی حفاظت کریں اور ہم رعایا ہونے کی حیثیت سے ان کی اطاعت..... ہمارے لیے انگریزی قانون ہی اسلامی شریعت ہے اور ایسا نہ ہو تو ہندوستان دارالحرب قرار پا کر ہر مسلمان پر ترک وطن یعنی ہجرت فرض ہو جائے۔''

(اردو دانشوروں کے سیاسی میلانات از مظہر مہدی، ص 87)

جہاں تک حالی کا سوال ہے وہ مکمل طور پر انگریزوں کے حامی نہیں تھے لیکن ان کی ترقی اور سماجی تبدیلی کو ضرور بہتر تصور کرتے تھے۔ ان کا ذہن اس بات کو قبول کرنے سے قاصر تھا کہ ہندستانی عوام کی، یا جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کی فلاح و بہبود برطانوی حکومت ہی کے ذریعے ممکن ہے۔ ہاں وہ برطانوی حکومت کی برکتیں جس سے سماج میں نئے خیالات کے وسعت پذیر ہونے میں مدد ملی، ریلوے شروع ہوا، تار

برقی وغیرہ کے رواج نے رسل ورسائل کے مسائل کو کم کر دیا اور انگریزی نظام تعلیم نے مرد عورت سبھی میں تعلیم حاصل کرنے کا جذبہ پیدا کیا حالی اس کے قائل تھے، اور اس کے نقوش ان کی نظموں میں صاف طور پر نمایاں ہیں۔

اس کے علاوہ حالی نے مناظر رحم و انصاف اور مجالس النسا میں بھی برطانوی حکومت میں ہونے والی معاشرتی تبدیلیوں کا حوالہ پیش کیا ہے۔ سرسید، نذیر احمد اور شبلی نے برطانوی حکومت کی اطاعت کا اسلامی جواز پیش کیا، مظہر مہدی کے مطابق اس نوع کا شبلی کا صرف ایک مضمون ملتا ہے۔ سرسید اور نذیر احمد نے نہ صرف اس حکومت کی ستائش کی بلکہ اس کے استحکام و استقلال کے لیے بھی کوشاں رہے۔

اس بات کا بھی جائزہ لینا ضروری ہے کہ مغرب سے آنے والا ادب وثقافت ہماری تہذیب وادب پر کس طرح اثر انداز ہو رہا تھا۔ 1857 کی جنگ کے بعد اردو ادب میں بہت سی نئی اصناف متعارف ہوئیں مثلاً: ناول، افسانہ، کہانیاں، مضامین، نئی نظم، روایتی نظم، آزاد نظم، نظم معرّا وغیرہ۔ اسی عہد میں نثر سلیس زبان میں لکھی جانے لگی جس نے نئی تنقید کو پنپنے میں کافی مدد کی۔ نئی تنقید مغربی خمیر لے کر اردو ادب میں شامل ہوئی اور ہر چیز مغربی نظر سے دیکھی جانے لگی۔ حالی نے 'مقدمہ شعر و شاعری' لکھا جو نئی تنقید کا پہلا مینی فیسٹو مانا جاتا ہے۔ اس کتاب میں شاعری کو موضوع بحث بنانے کا باعث انجمن پنجاب کے وہ مشاعرے تھے جن کا مقصد اردو شاعری میں ایک نئی راہ پیدا کرنا اور پرانی روایت سے انحراف تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں عربی فارسی یا پرانے نقادوں کے نظریات کو کم اور انگریزی نقادوں ملٹن اور مکالے کو زیادہ اہمیت دی۔

تنقید میں شبلی کے خیالات و تجربات انگریزی ادب سے کم متاثر نظر آتے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ مغربیت کو نہیں سراہتے تھے۔ ان کی تنقید میں مشرقیت زیادہ نمایاں ہے اس لیے کہ انھیں انگریزی کم آتی تھی۔ اس بات کا اقرار اپنی کتاب 'موازنہ انیس و دبیر' میں کچھ اس طرح کرتے ہیں:

''انگریزی زبان میں نہایت اعلیٰ درجے کی کتابیں اس موضوع پر لکھی گئی ہیں جن میں سے بعض میری نظر سے بھی گزری ہیں۔ میں ان سے اچھی طرح مستفیض نہیں ہو سکا'' (اردو تنقید کا ارتقاز عبادت بریلوی، ص186)

اب تک جتنے تنقید نگار اردو ادب میں آئے تقریباً اسی تنقید سے متاثر رہے جس کی شروعات حالی اور شبلی نے کی تھی۔ انگریزی پڑھنے والوں کی تعداد کے ساتھ تنقید میں انگریزیت بھی بڑھتی رہی۔ عبدالقادر سروری اولین تنقید نگاروں کے بعد دوسرے عہد کے تنقید نگاروں میں اہم مقام رکھتے ہیں، جن کی تنقید میں مغرب کا بہت گہرا اثر دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے شعر وادب کے متعلق بحث کرتے ہوئے ارسطو، افلاطون، اور میتھو آرنلڈ کے خیالات کو پیش کیا ہے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے کچھ ایسے مباحث کو اردو ادب میں شامل کیا جو اس سے پہلے اردو ادب میں نہیں تھے مثلاً سائنس اور شاعری کی بحث یا رزمیہ اور شاعری کے اقسام پر اظہار خیال۔ نئی چیزوں کو ادب میں شامل کرنا غلط نہیں ہے، ادب میں لچیلا پن کا ہونا ضروری ہے لیکن بقول عبادت بریلوی:

''ان سب میں پرفیسر سروری کے اپنے خیالات کم ہیں اور دوسروں کے خیالات زیادہ ہیں'' (اردو تنقید کا ارتقاز عبادت بریلوی، ص301)

یہاں میرا مقصد یہ نہیں کہ میں ہر تنقید نگار پر قلم اٹھاؤں، ہاں اتنا ضرور ہے کہ میں ان کی نشاندہی کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے مشرقی ادب اور مشرقی شعریات کا کھلے طور پر مذاق اڑا کر نو آبادیات کو فروغ دیا۔ عموماً نقاد مغربی نقادوں سے متاثر نظر آتے ہیں اور ہونا بھی چاہیے لیکن جذبات میں اس طرح بہہ جانا کہ اپنی چیزوں کا خیال نہ رہے غلط ہے۔ مثلاً کلیم الدین احمد کو دیکھا جائے تو وہ پوری طرح انگریزی ادب سے متاثر ہیں ان کے نزدیک مشرقی ادب اور شعریت کی کوئی حیثیت نہیں۔ ہمیں اس بات کا خیال ہونا چاہیے کہ ادب میں آفاقیت ہونے کے ساتھ ساتھ قوم اور ملک کا بھی تاثر ہوتا ہے۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ دنیا بھر کی ادبیات ایک ہی رنگ میں رنگ جائیں۔ کلیم الدین احمد اپنے ادب اور تنقید کے بارے میں ایسی باتیں کرتے ہیں کہ ان کی باتوں پر ہنسی بھی آتی ہے اور تعجب بھی ہوتا ہے۔ مثلاً ''غزل نیم وحشی صنف ادب ہے'' یا ''اردو میں تنقید کا وجود محض فرضی ہے یہ اقلیدس کا خیالی نقطہ ہے یا معشوق کی موہوم کمر'' اس طرح کسی زبان کے وجود پر الزام عائد کرنا ان کی بدگمانی اور جذباتیت کا پتا دیتا ہے۔

کلیم الدین احمد کا اشارہ ہمیشہ اس بات کی طرف ہوتا ہے کہ بغیر انگلش جانے کوئی شاعر ہو ہی نہیں سکتا، شاعر ہونے کے لیے مغربی ادب سے استفادہ کرنا ضروری ہے۔ میر اور سودا کے متعلق کلیم الدین احمد کے خیالات کو عبادت بریلوی نے یوں تحریر کیا ہے:

''ان شاعروں کی غزلوں سے یہ حقیقت صاف عیاں ہے کہ ان میں اعلیٰ پائے کے غزل گو ہونے کی صلاحیت موجود نہ تھی۔ اگر یہ کسی مغربی ادب سے واقف ہوتے'' یا کہ آزاد حالی مغرب سے ناواقف ہونے کے سبب سے بعض خیالات وزکاوت سے محروم رہے نظم کے صحیح مفہوم سے آشنا نہ ہو سکے'' میر اور سودا کے متعلق یہ کہنا کہ انھیں مغربی ادب سے واقف ہونا چاہیے تھا یہی خصوصیت انھیں شاعر بنا سکتی تھی ایک مضحکہ خیز بات نہیں تو اور کیا ہے۔'' (اردو تنقید کا ارتقاز عبادت بریلوی، ص404)

متذکرہ بالا نو آبادیاتی روشنی میں یہ سمجھنا آسان ہو گیا کہ پس نو آبادیاتی نظریہ کیا ہے ایڈورڈ سعید اور دوسرے مفکرین نے اس کی ضرورت کیوں محسوس کی تھی۔ انگریزی میں اسے Postcolonialism سے موسوم کیا گیا ہے، ایسا تصور کیا جاتا ہے کہ نو آبادیات کی شروعات Edward Said کی مشہور کتاب Orientalism (1977) سے ہوئی۔ کوئی نظریہ یا تحریک ایک دن یا ایک وقت میں وجود میں نہیں آتا بلکہ لوگوں کا ذہن بنتا ہے، لوگ اس طرح سوچنا شروع کرتے ہیں، اس کا ایک مینی فیسٹو تیار ہوتا ہے، اس نظریے کے کچھ پیروکار ہوتے ہیں تب کوئی نظریہ وجود میں آتا ہے اور یہی اس کے ساتھ ہوا، غلامی کا طوق گلے میں پڑنے سے لے کر آزادی کے بعد تک کے ایک لمبے عرصے نے لوگوں کے ذہن کو اس طرح صاف کیا کہ اپنے پرانے ورثے کی طرف لوٹنے پر مجبور کر دیا۔ Postcolonialism کی ایک تعریف ملاحظہ ہو:

"postcolonialism is the academic, intellectual, ideological and ideational scaffolding of the condition of decolonization (the period following political independence for nation and culture in Africa, Asia and south America).postcolonialism as a theory and a critique emerged from within anti-colonial activism and political movements in Asia, Africa and south America. Intellectuals and political leaders among native's .....Ghandhi, Cesaire, Tagore, Senghor, Cabral, Fanon were anti colonial activist thinkers whose political views metamorphosed into political and literary -cultural theory.(Postcolonialism A Guid for the perplexed by Pramod K.Nayar,P..1) "

پس نو آبادیات ایک علمی، عقلی اور نظریاتی نظریہ ہے جو ہندستان آزاد ہونے کے بعد ابھر کر سامنے آیا۔ جو تحریک ایشیا افریقہ اور جنوبی امریکہ میں چل رہی تھی، جو

رہنما نوآبادیات کے خلاف تھے مثلاً گاندھی، سیسیر، ٹیگور، سینگھور، کیب رال، فینن وغیرہ۔ ان کی تحریک نے لوگوں میں انقلاب پیدا کیا اور یہ نظریہ وجود میں آیا۔

1947 میں ہندستان اور 1962 میں افریقہ کے آزاد ہونے کے بعد Gramsci اور فوکو نے پس نوآبادیاتی امور پر توجہ کی تھی لیکن ایڈورڈ سعید کے گہرے تجزیے کے بعد کچھ بہتر نتائج سامنے آئے، جو بے حد دور رس ثابت ہوئے۔ جس ترقی سے حالی، شبلی، نذیر احمد اور سرسید احمد خان خوش ہو رہے تھے اس ترقی کے حوالے سے سعید نے اپنی کتاب Orientalism میں کہا کہ حکمراں قومیں خصوصاً بیرونی اپنی رعایا کی خدمت کی آڑ میں اپنی طاقت کا فروغ چاہتی ہیں۔

پس نوآبادیات کی ترویج و اشاعت میں سعید، بھابھا اور گائتری نے اہم رول ادا کیا ہے۔ 1947 میں Sociology of literature پر ایک Conference منعقد کی گئی جس میں سعید، بھابھا، اور گائتری کے ساتھ ساتھ دوسرے اسکالرز بھی مدعو تھے۔ بھابھا نے جو مقالہ پیش کیا وہ نفسیات سے لے کر ردتشکیل اور مابعد جدیدیت کی تھیوری پر محیط تھا۔ بھابھا نے سیاہ اور سفید کی بحث اٹھائی اور سیاہ پر سفید کی بالا دستی کے سارے عناصر سے بحث کی۔ جبکہ گائتری نے تانیثیت اور ثقافتی مطالعے کے ذریعے مابعد جدید ساختیات ردتشکیل مارکسی نقطہ نظر اور نفسیاتی گرہ کشائیوں پر کھل کر بحث کی۔ دوسرے شرکا نے بھی سیمینار میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور نوآبادیات اور پس نوآبادیات کے مسائل اور اس کے اثرات کی کھل کر نشاندہی کی، تب سے آج تک یہ بحث جاری ہے۔ اب اردو میں بھی اس جہت سے بحث شروع ہوگئی ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو پس نوآبادیات اس نظریے کا نام ہے جس کے تحت یہ بات ذہن نشین کرائی جاتی ہے کہ ہمیں اپنی تہذیب و ثقافت اور قدیم چیزوں کو منظر عام پر لانا چاہیے نہ کہ اس پر پردہ ڈالنا چاہیے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آزادی کے اتنے عرصے گزرنے کے بعد بھی ہماری گردن میں غلامی کا طوق لٹک رہا ہے۔ احساس کمتری کا جو انداز قائم تھا وہ آج بھی باقی ہے۔ رفتہ رفتہ اب اردو کے ماہرین کو بھی احساس ہو رہا ہے کہ ہمیں اس قدر مغرب کی پیروی نہیں کرنی چاہیے۔ اپنی چیزوں پر نقطہ چینی کرنا، سب سے کمتر سمجھنا اپنی تہذیب و تمدن اور ثقافت سے انکار کرنا ہے۔

پس نوآبادیات کے تذکرے میں سرسید احمد خاں کی خدمت کو فراموش نہیں کیا جا سکتا، جس تہذیب و ثقافت کو بچانے کی بات آج ہو رہی ہے اردو میں سرسید سے ہی شروع ہوگئی تھی۔ سرسید احمد خاں نے غازیپور میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی تھی کہ انگریزی اور دوسرے علوم کی کتابوں کے علاوہ اسلامی تاریخ کو عربی سے اردو میں ترجمہ کیا جائے۔ بعدازاں عبدالرحمٰن بجنوری کو دیکھا جائے تو وہ دوسروں سے مختلف نظر آتے ہیں۔ وہ یوروپ کی کئی زبانیں جانتے تھے، حصول تعلیم کے لیے مغرب کا بھی سفر کیا لیکن ان کے اوپر مغربی تنقید اور مغربی ادب دوسرے طریقے سے اثر انداز ہوئے۔ وہ اپنی چیزوں کو کم تر بتانے کے بجائے بہتر بتاتے تھے۔ انھوں نے اپنے مقالہ 'محاسن کلام غالب' میں غالب کا مقابلہ مشرق و مغرب کے مختلف شاعروں اور ادیبوں سے کیا ہے جس سے محسوس ہوتا ہے کہ بجنوری ان سب سے غالب کو بڑھا دینا چاہتے تھے۔

اکیسویں صدی میں اس مسئلے پر گفتگو ہونے لگی ہے 1990 یا 2000 کے بعد کی شاعری یا فکشن میں پس نوآبادیات دکھائی دینے لگا ہے لوگ اپنے وطن اپنی ثقافت اور اپنی تہذیب کو پھر سے یاد کرنے لگے ہیں۔ مثلاً اردو کے ایک مشہور شاعر منور رانا کے خیالات ملاحظہ ہوں:

''ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنی شاعری میں بش کے امریکہ کی جگہ ملی جلی آبادی والے اس گاؤں کا تذکرہ کریں جہاں آج بھی ایک بیٹی کی رخصتی کے درد کو پورا گاؤں محسوس کرتا ہے۔ گاؤں کے کسی بزرگ کے انتقال پر بیشتر گھروں کے چولھے سارا دن آگ کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔'' (جنگلی کبوتر، شعری مجموعہ از منور رانا، ص 10-9)

اس کے علاوہ موجودہ دور کے تنقید نگاروں کو بھی اس بات کا اعتراف کرنا پڑا ہے کہ اردو ادب اپنے پرانے ورثے کو اہمیت دینے سے گریز کر رہا تھا۔ ہم مانتے ہیں کہ ہمیں مغربی تصورات اور مغربی ادب سے واقفیت رکھنی چاہیے، ایک دوسرے سے استفادہ کرنا ہر ادب کی روایت رہی ہے۔ ادب ادب ہوتا ہے اسے کسی زبان، ملک اور قوم کے دائرے میں مقید نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن مغربی افکار کا اثر قبول کرنے کے ساتھ ساتھ کلاسکی شعریات کو بھی اپنی تنقید میں شامل کرنا ضروری ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی رقم طراز ہیں:

''یہ سوال اٹھ سکتا ہے کہ کیا مغربی شعریات ہمارے کلاسیکی ادب کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے کافی نہیں؟ اس کا مختصر سا جواب یہ ہے کہ مغربی شعریات ہمارے کلام میں معاون ضرور ہو سکتی ہے بلکہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ مغربی شعریات سے معاون حاصل کرنا ہمارے لیے ناگزیر ہے لیکن یہ شعریات اکیلی ہمارے مقصد کے لیے کافی نہیں۔ اگر صرف اس شعریات کو استعمال کیا جائے تو ہم اپنی کلاسیکی ادبی میراث کا پورا حق نہ ادا کر سکیں گے۔ اور اگر ہم ذرا بد قسمت ہوئے، یا عدم توازن کا شکار ہوئے تو مغربی شعریات کی روشنی میں جو نتائج ہم نکالیں گے وہ غلط، گمراہ اور بے انصاف پر مبنی ہوں گے۔''

(شعر شور انگیز، جلد سوم، از شمس الرحمٰن فاروقی، ص 20)

اب ہمیں احساس ہونا چاہیے کہ ہم نے اپنی داستانوں اور مثنویوں کو غلط تناظر میں دیکھنے کی سعی کی ہے۔ انھیں سطحی اور رومانیت سے تعبیر کر کے اپنی ثقافتی جڑوں سے لاعلمی کا کھلا اظہار کیا ہے۔ کلیم الدین احمد، گوپی چند نارنگ (مثنوی) یا شمس الرحمٰن فاروقی (داستان) کے بارے میں نئی روشنی بہم پہنچانے کے بعد کم سے کم ہمیں اپنی رائے بدلنی چاہیے، ہمیں احساس ہونا چاہیے کہ ہماری زندگی کی دھڑکنیں تو داستانوں اور مثنویوں میں خوب خوب سنائی دیتی ہیں۔ لوک، قصے، کہانیاں، لوک گیت یہ سب تو ہمارا ثقافتی ورثہ ہیں، تو پھر ہم انھیں بھول کیوں گئے تھے۔ ہر زبان و ادب کی اپنی تہذیب و ثقافت ہوتی ہے جس میں وہ سانس لیتا ہے۔ اگر اسے اسی نظام کا زائیدہ تصور کریں تو اس کی اہمیت از خود واضح ہو جاتی ہے اور اس کی ساری خصوصیات نمایاں ہو کر نظر آنے لگتی ہیں۔ بقول وہاب اشرفی:

''تب ہمیں اپنی غزل نیم وحشی ہرگز نہیں معلوم ہوگی، ہمارا محبوب زندگی سے عاری نظر نہیں آئے گا، فراق و وصل کی کیفیت بے معنی نہیں ٹھہرے گی۔ ہماری تشبیہیں، استعارے اور ہماری دوسرے بلاغت اور عروضی نظام بیکار محض ہیں نہ معلوم ہوں گے، اور یہ بھی احساس ہوگا کہ سنسکرت بھی تو ہماری وراثت تھی، تو اس سے فائدہ ہم نے کیوں نہیں اٹھایا، اس کے رسوں کے نظام پر ہماری توجہ کیوں نہیں گئی، یعنی ہم نے اپنی مٹی ہی کی خبر نہیں رکھی اور ظاہر ہے اسی مٹی نے ہمارا خمیر مرتب کیا ہے''

(مابعد جدیدیت مضمرات و ممکنات از وہاب اشرفی، ص 437)

متذکرہ بالا مضمرات و ممکنات کی روشنی میں مجموعی جائزہ لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ آزادی کے بعد بھی ہم ذہنی طور پر انگریزوں کے غلام ہیں۔ اس طرح سے وہ ہمارے ملک کو عقلی، سیاسی، سماجی، نظریاتی، ادبی، ثقافتی اور مذہبی طور پر کھوکھلا کر گئے ہیں کہ آج تک ہم اس کا بدلہ چکا رہے ہیں۔ ان کے چنگل سے باہر نہیں نکل پائے ہیں۔ اب ہمیں ان کی غلامی سے باہر نکل کر اپنے ملک کی ملی جلی، گنگا جمنی تہذیب کی بات کرنی چاہیے۔

Seraj Ahmad Ansari, Ph.D Scholar, Room No 230, University of Hyderabad, Hyderabad - 500046 (AP)

صالحہ زریں

کیفی اعظمی اور ان کی فلمی شاعری

کیفی اعظمی اعظم گڑھ کے مجواں گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد زمینداری چھوڑ کر بچوں کی تعلیم کی خاطر لکھنؤ میں رہنے لگے اور سبھی بھائیوں کی تعلیم و تربیت اچھی طرح ہونے لگی۔ کیفی صاحب اپنے بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹے ہونے کی وجہ سے گھر پر ہی رہے اور والد نے یہ کہا کہ ''اب کھیتی کا کام یہی دیکھا کریں گے۔'' مگر کیفی کا دل کھیتی کے کاموں میں نہیں لگتا تھا۔ لہٰذا وہ ایک دن جوان کی تہذیب کے خلاف کام تھا، کھیت پر کام کرنے والی ایک عورت کو دیکھنے لگے تو ان کے چچا نے ان کی اس حرکت سے ناراض ہو کر انھیں فوراً لکھنؤ بھیج دیا اور ان کا داخلہ مدرسے میں عربی فارسی کی تعلیم کے لیے کرا دیا گیا۔ مگر کیفی کی جولانیِ طبع نے مدرسے کی تعلیم کے خلاف کام کرنا شروع کر دیا۔ وہ غزلیں کہنے لگے۔ دھیرے دھیرے ان کی مقبولیت شاعری میں ہونے لگی۔ کالج کے سیاسی جھگڑوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے۔ ایک دن کالج کے جلسے میں وہ ایک نظم سنا رہے تھے، وہاں علی عباس حسینی کا گزر ہوا، انھوں نے کیفی سے یہ نظم لے کر رکھ لی اور اس کو اپنے ساتھ لیتے گئے۔ پھر ایک دن انھوں نے اسی نظم کو احتشام صاحب کے سامنے سنائی تو احتشام صاحب انھیں اپنے ہمراہ آل انڈیا سٹوڈنٹس فیڈریشن کے دفتر لے گئے جہاں پر انھوں نے علی سردار جعفری سے ملوایا۔ دراصل کیفی کو شاعری ورثے میں ملی تھی۔ ان کے والد اور بھائی بھی شاعری کرتے تھے۔ جب یہ شعر و شاعری کی محفل میں پہنچ جاتے تو ان ک بھائی انھیں ڈانٹ دیتے کہ ''تمھاری سمجھ میں کیا آئے گا، جاؤ اندر سے پان بنوا کر لے آؤ'' کیفی صاحب خود اپنے ایک مضمون میں ''اور میری شاعری'' میں لکھتے ہیں کہ:

''جب میں بھائیوں کے شعر سننے کے لیے کھڑا ہو جاتا یا چپ چاپ کہیں کھڑا ہو جاتا تو فوراً کسی بزرگ کی ڈانٹ پڑتی کہ تم یہاں کیوں بیٹھے ہو، تمھاری سمجھ میں کیا آئے گا گھر میں جاؤ اور پان بنوا کر لے لاؤ۔ میں زمین پر پاؤں پٹکتا تقریباً روتا ہوا گھر میں باجی کے پاس جاتا کہ دیکھیے میرے ساتھ یہ ہوا۔ میں ایک دن ان سب سے بڑا شاعر بن کے دکھاؤں گا۔ باجی مسکرا کر کہتیں کیوں نہیں تم ضرور کبھی بڑے شاعر بنو گے۔''

پھر کیا تھا کیفی نے باقاعدہ شعر کہنے شروع کر دیے اور مشاعروں میں شرکت بھی کرنے لگے۔ داد و تحسین سے نوازا جانے لگا۔ بزرگوں نے ان کے حوصلے بڑھائے۔ دھیرے دھیرے کیفی نے شاعری میں قدم بڑھانے شروع کر دیے۔ انقلابی، سیاسی اور سماجی نظمیں کہنی شروع کر دیں اور ان کی شاعری کو عوام و خواص میں ایک خاص مقبولیت حاصل ہونے لگی۔ 11 برس کی عمر میں انھوں نے جو غزل کہی وہ آگے چل کر ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں مقبول عام ہوئی، غزل کا ایک شعر یوں ہے:

اتنا تو زندگی میں کسی کی خلل پڑے
ہنسنے سے ہو سکون،، نہ رونے سے کل پڑے

اور آگے چل کر نظمیں اور غزلیں کہنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان کے کل پانچ مجموعے نظموں، غزلوں اور گیتوں کے شائع ہوئے۔ جس میں جھنکار، آخر شب، آوارہ سجدے، ابلیس کی مجلس شوریٰ اور گیتوں کا مجموعہ میری آواز سنو۔ کیفی نے ساری زندگی کمیونسٹ پارٹی کے لیے کام کیا۔ مزدوروں اور کسانوں کے جلسوں میں شریک ہوئے ان کے جذبات کی عکاسی نظموں، غزلوں اور یہاں تک کہ گیتوں میں بھی دیکھنے کو مل جاتی ہے۔ حالانکہ کیفی کے علاوہ چند بڑے ترقی پسند شاعر و ادیب جنھوں نے اپنے گیتوں، کہانیوں اور مکالموں کو لکھ کر فلمی دنیا میں اپنی جذباتی اظہاریت کا راستہ ہی نہیں بنایا بلکہ فلمستان کو بلندی کی راہ پر لے گئے۔ نمایاں طور پر گیتوں کی دنیا میں ساحر، مجروح، جاں نثار اختر، کیفی وغیرہ نے دھوم مچا رکھی تھی تو دوسری طرف کہانیوں اور مکالموں میں کرشن چندر، عصمت چغتائی، منٹو، خواجہ احمد عباس، بیدی وغیرہ نے اپنا سکہ جما رکھا تھا۔ خاص طور پر فلمی گیتوں کی دنیا میں ساحر، مجروح اور کیفی کے گیتوں کا ڈنکا بج رہا تھا۔

کیفی اعظمی نے اپنے انقلابی، سماجی اور سیاسی شاعری سے الگ ہٹ کر فلمی گیتوں میں بھی ایک نمایاں حیثیت بنائی۔ فلم میں گیت لکھنے کی ضرورت انھیں اپنی معاشی بدحالی کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ انھوں نے جس طرح غزلوں میں اپنی ایک الگ پہچان بنائی اسی طرح گیتوں میں بھی ایک جدا انداز پیدا کیا۔ وہ اپنے فلمی نغموں میں رومانی اور عاشقانہ جذبوں کی ایک نئی دنیا آباد کرتے نظر آتے ہیں۔

ان کے گیت مقبول ہی نہیں ہوئے بلکہ آرٹ اور ادب کا حصہ بھی ہیں۔ ان کی فلمی شاعری میں وطن پرستی کا جذبہ خاصا نمایاں نظر آتا ہے۔ ان کے گیتوں کا مجموعہ 'میری آواز سنو' جو 1974 میں شائع ہوا اس کو پڑھنے کے

بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے گیتوں میں بھی ترقی پسندی کی ایک نئی روح پھونک دی ہے اور فلمی دنیا کے گیتوں کے مزاج کو بھی بدل دیا۔ انھوں نے تقریباً 100 فلموں میں گیت لکھے مگر ان گیتوں میں انھوں نے شاعری کے تقاضوں اور ان کی نزاکتوں و لطافتوں کو برقرار رکھا۔ وہ مشہور فلمیں جس میں انھوں نے گیت لکھے جس میں پاکیزہ، کاغذ کے پھول، شمع، حقیقت، دو دل، آخری خط، انوپما، ایک کے بعد ایک، چالیس دن، لالہ رخ، بہاریں پھر بھی آئیں گی، نونہال، انوکھی ادا، ہیر رانجھا، آخری مجرا، ارتھ، رضیہ سلطان، بہو بیٹی وغیرہ۔

کیفی ہندوستان کے موسموں کے مزاج کو معشوق کے دل و دماغ پر اس طرح سوار کرتے ہیں کہ وہ اپنے جذبوں میں سرشار ہو کر عاشق کا انتظار اس طرح کرتی ہے۔ 'بہو بیٹی' فلم کا گیت دیکھیے:

ناچتی ہیں چمن میں ہوائیں نئی
لکھ لے آج دل میں ادائیں نئی
کوئی ہل مل کے گائے
کوئی پینگیں بڑھائے
کوئی مضبوط بانہوں میں جھولا جھلائے
مورے نینوں سے مستی برسنے لگی
اجلی اجلی سی مانگ ڈسنے لگی
کوئی چنری اڑائے
کوئی جھومر پہنائے
کوئی اجلی سی مانگ میں سندور لگائے
موسے چنچل جوانی سنبھالی نے جائے

اس گیت میں کیفی نے جذبے کی ایک ایسی کیفیت پیدا کر دی ہے جو کنواری لڑکیوں کے دل میں اٹھا کرتی ہے۔ وہ اپنے چاہنے والوں کا انتظار کرتی ہیں ان کا چنچل من ایسا ہوتا ہے کہ جوانی سنبھالے نہیں سنبھلتی۔ اسی فلم کا دوسرا گیت دیکھیے جہاں ایک بہن اپنے بھائی کی کلائی پر راکھی باندھنے کے لیے بے چین نظر آتی ہے اور سسرال کے لوگ اس کا راستہ روکے ہوئے ہیں:

کیسے لے آؤں رکھیا میں بھیا
میرے پاؤں میں بیڑی پڑی
ساسو بیرن بڑی گھات میں ہر گھڑی
راہ رو کے کھڑی

جس گھر میں نہ ہو ویر میرا
وہاں نہ آئے تہوار
رم جھم رم جھم ساون برسے
نیر بہادے نین
جب تک تورے پاس نہ پہونچوں
کیسے پڑے موہے چین

کیفی نے اس گیت میں بھوجپوری زبان کا استعمال اچھے انداز میں کیا ہے۔ ایک بہن جو سسرال کی بندشوں میں قید ہے۔ وہ کبھی سسرال کے بندھن کو برا بھلا کہتی ہے تو کبھی اپنے آپ کو۔ کیونکہ انھیں رکاوٹوں کی وجہ سے وہ بھائی کو راکھی باندھنے پہنچ نہیں پاتی۔

'لالہ رخ' فلم کا گیت دیکھیے جہاں معشوقہ دامن چھڑانے والے کو بھی دعاؤں سے نوازتی ہے اور اپنی الفت کو اللہ کے حوالے کر دیتی ہے:

لے جا مری دعائیں دامن چھڑانے والے
تڑپا کے جانے والے
کرتی ہے تجھ کو الفت اللہ کے حوالے
تڑپا کے جانے والے

فرقت کا درد لے کر شادی کی رات آئی
گھر لوٹنے خوشی کا غم کی برات آئی
اپنا بنا کے چھوڑا نظریں چرانے والے
تڑپا کے جانے والے

سو بار موت آئی دو دن کی زندگی میں
دامن پکڑ ہی لیں گے مجبور دل کے نالے
تڑپا کے جانے والے

اسی فلم کا ایک دوسرا گیت کچھ اس جذبے سے سرشار نظر آتا ہے جس میں اقبال کی شاعری کا رنگ جھلکتا ہے:

محبت بنائے محبت مٹائے
محبت کسی دن خدا بن نہ جائے
محبت کرم بھی محبت ستم بھی
محبت سے مجبور تم بھی ہو ہم بھی

وہ مجبور قسمت سے بازی لگائے
لہو سے چراغ تمنا جلائے
مخالف ہواؤں سے ٹکرا رہا تھا
اندھیرے میں بڑھتا چلا جا رہا تھا
محبت میں زخمی لبوں سے دعا دی
لیا جس نے دل جاں اسی پہ گنوا دی
تھی اک شاہزادی بہت خوبصورت

کہیں کہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اپنے نغموں کی خود ہی تعریف کرتا ہے کہ اس کا نغمہ جب ساز بن کر آواز دیتا ہے تو معلوم یہ ہوتا ہے کہ خدا خود بول رہا ہے:

نغمہ مرا ہر سانس میں رس گھول رہا ہے
اس ساز کے پردے میں خدا بول رہا ہے
چھیڑا ہے اگر ساز تو گانا ہی پڑے گا
آنا ہی پڑے گا

یا ایک غزل کا خوبصورت شعر دیکھیے:

چاند تاروں کو میسر ہے نظارا تیرا
میری بیتاب نگاہوں سے یہ پردا کیوں ہے
تجھ کو دیکھا تجھے چاہا تجھے پوجا میں نے
بس یہی اس کے سوا میری خطا کیا ہوگی

اس کی نظریں محبوب کو دیکھنے کے لیے بیتاب رہتی ہیں مگر سارے جہاں کی نظریں اسی پر مرکوز رہتی ہیں۔ ایک میری نظر کے سوا جب خود کے اندر دیکھنے چاہنے اور اس کے بعد پوجنے تک کی تمنا دل میں رہتی ہے یہی میری سب سے بڑی خطا ہے۔

فلم 'کاغذ کے پھول' میں بھی ان کے گیت بہت مقبول ہوئے:

وقت نے کیا کیا حسیں ستم تم رہے نہ تم، ہم رہے نا ہم
بیقرار دل اس طرح ملے جس طرح کبھی ہم جدا نہ تھے
تم بھی کھو گئے ہم بھی کھو گئے ایک راہ پر چل کے دو قدم

فلم 'چالیس دن' کے متفرق اشعار پیش ہیں جس میں جذبوں کی مختلف ترجمانی نظر آتی ہے:

دیکھو یہ تارے کھوئے کھوئے پھولوں میں سپنے سوئے سوئے
رت ہنسی کی ایسی آئی ہے ایسے میں دل کیوں روئے
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ دل کا دیا جلائے
شاید وہ درد جانے شاید وہ لوٹ آئے
نصیب ہو گا مرا مہرباں کبھی نہ کبھی
ملے گا اس کے قدم کا نشاں کبھی نہ کبھی

بچوں کے گیت بھی فلم 'ایک کے بعد ایک' میں لکھے۔ جہاں فوجیوں کی قطار میں ہاتھی، مینڈک، چوہے، تتلی وغیرہ سے بنتی ہے:

چلی چلی یہ فوج ہماری
وردی پہنی چوہوں نے
مینڈک بینڈ بجاتے ہیں
تتلی کے رتھ پر بیٹھے
لڑنے بھڑنے جاتے ہیں
ہر قدم پر چنوں مومٹھائی کھاتے ہیں

فلم 'شمع' جس کی غزلیں بہت مشہور ہوئیں اس کے کچھ اشعار پیش خدمت ہیں:

آپ سے پیار ہوا جاتا ہے
کھیل دشوار ہوا جاتا ہے
میرے محبوب تجھے پیار کروں یا نہ کروں
پیار ہو جائے تو اقرار کروں یا نہ کروں
دل دھڑکتا ہے تو چہرے پہ نکھار آتا ہے
وہ تو وہ ہے مجھے اپنے پہ بھی پیار آتا ہے

بہکی بہکی ہوئی نظروں کا سلام آتا ہے
دل بیتاب ٹھہر ان کا پیام آتا ہے
شگفتگی کا لطافت کا شاہکار ہو تم
فقط بہار نہیں حاصل بہار ہو تم
دھڑکتے دل کی تمنا ہو میرا پیار ہو تم
مجھے قرار نہیں جس سے بیقرار ہو تم
دل گیا تو گیا دلربا مل گیا
آپ کا آسرا مل گیا
پیار کو بھی خدا مل گیا

اس طرح 'شمع' فلم کی بعض غزلیں اور گیت بہت مشہور ہوئے جو عوام و خواص کی زبان پر بہت دنوں تک چڑھے رہے۔

کیفی کی غزلوں میں کئی جگہ شاد عظیم آبادی یا آرزو لکھنوی کا رنگ نظر آتا ہے۔ جیسے 'شعلہ اور شبنم' فلم کا گیت دیکھیے شاد عظیم آبادی نے اپنے خیالات کی ترجمانی اس شعر میں کچھ اس انداز سے کی ہے:

بنا چلا ڈھیر راکھ کا تو بجھا چلا اپنے دل کی لیکن
بہت دنوں تک دبی دبائی اے آگ تو کارواں رہے گی

اب کیفی کا رنگ دیکھیے:

زندگی ہنس کے گزرتی تو بہت اچھا تھا
خیر، ہنس کے نہ سہی رو کے گزر جائے گی
راکھ برباد محبت کی بچا رکھی ہے
بار بار اس کو جو چھیڑا تو بکھر جائے گی
جانے کیا ڈھونڈتی رہتی ہیں یہ آنکھیں مجھ میں

فلم 'حقیقت' کا یہ مشہور گیت دیکھیے:

ذرا سی آہٹ ہوتی ہے تو دل سوچتا ہے
کہیں یہ وہ تو نہیں
چھپ کے سینے میں کوئی جیسے صدا دیتا ہے
ہے اسی کی یہ صدا ہے اسی کی یہ ادا
کہیں یہ وہ تو نہیں
ذرا سی آہٹ ہوتی ہے تو دل سوچتا ہے

غزل کی نازک خیالی احساس کے جذبوں میں ڈھل کر گیت کے رنگ و آہنگ میں شیر و شکر ہو گئی ہے۔ ہر وقت محبت کرنے والے پر یہ احساس غالب ہو جاتا ہے کہ تھوڑی بھی آہٹ ہوئی کہ بس اس نے جانا کہ میرا محبوب میرے پاس آ گیا۔ اس کی دلفریب ادا، اور آنے کی صدا صبح سے شام تک زندگی دیتی ہے۔ جینے کی امنگ پیدا کرتی ہے۔ یا اسی فلم کا ایک اور گیت بہت مقبول ہوا۔ جو رومان، کشمکش کائنات و حیات کی منزلوں کو چھوتا ہے:

ہو کے مجبور مجھے اس نے بلایا ہوگا
زہر چپکے سے دوا جان کے کھایا ہوگا
دل نے کچھ ایسے بھی افسانے سنائے ہوں گے
اشک آنکھوں نے پیے اور نہ بہائے ہوں گے
بند کمرے میں جو خط میرے جلائے ہوں گے
ایک اک حرف جبیں پر ابھر آیا ہوگا

گیتوں میں جہاں محبوب کی محبت کی جدائی کا یہ انداز دکھائی دیتا ہے وہیں دوسری طرف اسی فلم میں حب وطن کے جذبوں سے سرشار گیت بھی دیکھنے کو ملیں گے جیسے وہ گیت ملاحظہ فرمائیے جس میں حیات اور انقلاب دونوں آپس میں کارنامہ حیات کی منزلوں کو چھوتا ہوا قربانی کے جذبوں سے سرشار ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کیفی کے گیت اجتماعی احساسات کو قریب لے آتے ہیں۔ کیفی کے گیتوں کی دنیا میں یہ ایک بڑا کارنامہ معلوم ہوتا ہے:

کر چلے ہم فدا جان و تن ساتھیو
اب تمھارے حوالے وطن ساتھیو
سانس تھمتی گئی نبض جمتی گئی
پھر بڑھتے قدم کو نہ رکنے دیا
کٹ گئے سر ہمارے تو کچھ غم نہیں
سر ہمالہ کا ہم نے نہ جھکنے دیا
مرتے مرتے رہا بانکپن ساتھیوں
اب تمھارے حوالے وطن ساتھیو

کیفی جس تحریک سے وابستہ تھے ان کی شاعری میں مختلف رنگ اور مختلف جذبوں کی ترجمانی لازمی تھی۔ ملک میں مختلف مذہب میں منائے جانے والے تہواروں پر بھی گیت لکھے، مثلاً دیوالی، ہولی، رکشا بندھن وغیرہ

آئی اب کے سال دیوالی منہ پر اپنے خون ملے
(حقیقت)

فلم 'حقیقت' کا یہ گیت دیوالی جو روشنی اور خوشیوں کا تہوار ہوتا ہے، مگر اس سال تو ملک کی آزادی کے لیے جنگ جاری ہے لہٰذا اپنے منہ پر اس نے روشنی کی جگہ خون مل لیا ہے۔ اور چاروں طرف گہرا اندھیرا چھایا ہوا ہے اور فلم ''دو دل'' میں ہولی کا یہ رنگ دیکھیے:

بم بم لہری
لہر لہر ندیا گہری
آج برج میں ہولی ہے
لال گلابی ملا ہے تن پر
منھ میں بھانگ کی گولی ہے

ہولی بہار کے موسم میں منائی جاتی ہے تو لوگ بہار آنے کی خوشیوں میں لال ہرے رنگ ایک دوسرے کے منھ پر ملتے ہیں اور بھنگ کھا کر نشہ کرتے ہیں۔ اس کیفیت کو گیت میں پوری طرح سمونے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسی فلم کا ایک گیت جو بہت مشہور ہوا:

سارا مورا کجرا چھڑایا تو نے/ گروا سے کیسے لگایا تو نے
ہو رسیا من بسیا/ تیکھا تیکھا کجرا لگایا تو نے
کاہے کو جادو جگایا تو نے/ سکھنی سکھ رجنی
سارا مورا کجرا

بھوجپوری زبان کا اتنا خوبصورت گیت ہندوستانی رنگ میں رچا بسا یہ سب زبان کا جادو ہی تو ہے، جس نے کیفی کو مقبولیت بخشی۔ یا پھر اسی فلم کا دوسرا گیت جس میں مذہب کے نام پر صرف دھوکا ہوتا ہے ایسے کردار پر خوبصورت طنز ہے:

رام رام جپنا پرایا مال اپنا
پیار میں دیکھا ہم نے یہ سپنا

'فرار' فلم کا یہ گیت بھی بہت مشہور ہوا:

دل ناداں کو سنبھالوں تو چلے جایئے گا
اک ذرا ہوش میں آ لوں تو چلے جایئے گا

اسی طرح 'آخری خط' فلم کا گیت دیکھیے:

بہارو! مرا جیون بھی سنوارو
کوئی آئے کہیں سے یوں پکارو
بہارو! مرا.....
تمھیں سے دل نے سیکھا ہے تڑپنا
تمھیں کو دوش دوں گی اے نظارو
بہارو! مرا.....

اور اسی رومانی فکر و انداز کی فلم 'انوپما' کا یہ گیت دیکھیے جس میں محبت ہے، شگفتہ خواب ہے۔ جس میں لفظوں کی ترتیب غنائیت پیدا کرتی نظر آتی ہے:

دھیرے دھیرے مچل اے دل بے قرار کوئی آتا ہے
یوں تڑپ کے نہ تڑپا مجھے بار بار کوئی آتا ہے
اس کے دامن کی خوشبو ہواؤں میں ہے
اس کے قدموں کی آہٹ فضاؤں میں ہے
مجھ کو کرنے دے کرنے دے سولہ سنگار کوئی آتا ہے

فلم 'بہاریں پھر بھی آئیں گی' کا گیت جس کا انداز بھی مختلف ہے اور خیالات بھی بدلے ہوئے ہیں:

بدل جائے اگر مالی نہیں ہوتا چمن خالی
بہاریں پھر بھی آتی ہیں بہاریں پھر بھی آئیں گی

فلم 'نونہال' کا گیت دیکھیے جو انھوں نے پنڈت جواہر لال نہرو کی وفات پر بچوں کے لیے لکھا تھا:

میری آواز سنو، پیار کا راز سنو
میں نے اک پھول جو سینے میں سجا رکھا تھا
اس کے پردے میں تمھیں دل سے لگا رکھا تھا
تھا جدا سب سے مرے عشق کا انداز سنو
میری آواز سنو

فلم 'انوکھی رات' کی غزل ملاحظہ ہو:

ملے نہ پھول تو کانٹوں سے دوستی کر لی
اسی طرح سے بسر ہم نے زندگی کر لی

'ہیر رانجھا' فلم کا یہ گیت جو بہت مشہور ہوا۔ 1970 کے پہلے جو گیت کیفی نے لکھے جس میں دنیا کے نظام کو بدلنے کی بے چینی نظر آتی ہے۔ چاہے گیتوں میں معصومانہ انداز ہو یا پھر جارحانہ مگر اس کے بعد خیالات کی تندی ان کے گیتوں میں بھی نظر آنے لگتی ہے۔ مثلاً یہ گیت:

یہ دنیا یہ محفل میرے کام کی نہیں
کس کو سناؤں حال دل بے قرار کا
بجھتا ہوا چراغ ہوں اپنے مزار کا
اے کاش بھول جاؤں مگر بھولتا نہیں
کس دھوم سے اٹھا تھا جنازہ بہار کا
یہ دنیا یہ محفل میرے کام کی نہیں

'ہیر رانجھا' فلم کے بعد کیفی نے ایک کے بعد ایک عمدہ نغمے لکھے جن کو بے پناہ شہرت ملی، جیسے فلم 'پاکیزہ' کی یہ غزل لیجیے:

یوں ہی کوئی مل گیا تھا/ سر راہ چلتے چلتے
وہیں تھم کے رہ گئی ہے/ مری رات ڈھلتے ڈھلتے

جو کہی گئی نہ مجھ سے/ وہ زمانہ کہہ رہا ہے
یہ فسانہ بن گئی ہے/ مری بات چلتے چلتے

شب انتظار آخر/ کبھی ہوگی مختصر بھی
یہ چراغ بجھ رہے ہیں/ مرے ساتھ جلتے جلتے

فلم 'ہنستے زخم' کی قوالی کے یہ شعر ملاحظہ ہوں:

توبہ توبہ یہ جوانی یہ جوانی کا غرور
عشق کے سامنے سر پھر بھی جھکانا ہی پڑا
یہ مانا مری جاں محبت سزا ہے
مزا اس میں اتنا مگر کس لیے ہے
وہ اک بے قراری جو اب تک ادھر تھی
وہی بے قراری ادھر کس لیے ہے

'ارتھ' فلم کے یہ اشعار بہت مشہور ہوئے:

جھکی جھکی سی نظر بے قرار ہے کہ نہیں
دبا دبا سا سہی دل میں پیار ہے کہ نہیں

تم اتنا جو مسکرا رہے ہو
کیا غم ہے جس کو چھپا رہے ہو

1980 کے بعد کیفی کے گیتوں میں ایک پر امید فضا نظر آتی ہے۔ فلم 'پھر تیری کہانی یاد آئی' کا گیت دیکھیے:

آنے والا کل ایک سپنا ہے
گزارا ہوا کل بس اپنا ہے
ہم ہر گزرے پل میں رہتے ہیں

یا پھر 1990 کے بعد اس طرح سے گیت کا بدلا ہوا انداز نظر آتا ہے۔ 'چاند گرہن' فلم کا دو گیت دیکھیے:

تجھ کو یوں دیکھا ہے یوں چاہا ہے یوں پوجا ہے
تو جو پتھر کی بھی ہوتی تو خدا ہو جاتی

آ پیار کی بانہوں میں سنسار کے سب سکھ تیرے
پلکوں سے میں چن لوں گا کانٹے ہیں جو راہوں میں

سمجھے گا ہنر تیرا نادان زمانہ کیا
ہر موڑ پہ جیون کی اک شمع جلا دی ہے
اب درد کا شکوہ کیوں اب اشک بہانا کیا
ہنسنے کی ادا تم نے زخموں کو سکھا دی ہے
امید جگا دی ہے مایوس نگاہوں میں
آ پیار کی بانہوں میں سنسار کے سب سکھ تیرے

کیفی نے اپنی ذاتی زندگی میں جتنے اتار چڑھاؤ دیکھے، تجربات و کیفیات سے گزرے اس کو اپنی شاعری میں احساسات اور جذبات کے حوالوں سے جذب و پیوست کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

کیفی اعظمی کا فلمی گیتوں کا سفر 1951 سے لے کر 1997 تک چلا جس میں انھوں نے احساسات و جذبات، غزل کے رنگ و آہنگ کو برقرار رکھا ہے۔ وہ گیتوں میں ہندی، اودھی، بھوجپوری، فارسی کے الفاظ پرو کر خوبصورت انداز کے ذریعے جذبات میں حرکت پیدا کر دیتے ہیں۔ کیفی نے گیتوں کی دنیا میں اس لیے قدم رکھا کہ ان کو معاشی پریشانیو کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ ان کی زندگی میں ان کے نغموں اور گیتوں نے جو مقبولیت بخشی وہ ایک اضافے کی صورت تھی۔ اس اضافی صورت میں انھوں نے پھکڑ بازی نہیں کی۔ بلکہ غزلوں کے اشاروں اور کنایوں، استعاروں کو اپنے گیتوں میں پوری طرح استعمال بھی کیا۔ انھیں ادبی بنائے رکھنے کی کوشش کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے گیت ادب کی دنیا میں ایک خاص درجہ پانے کے حامل نظر آتے ہیں۔

Saleha Zarrin, Department of Urdu
Allahabad University, Allahbad (U.P.)

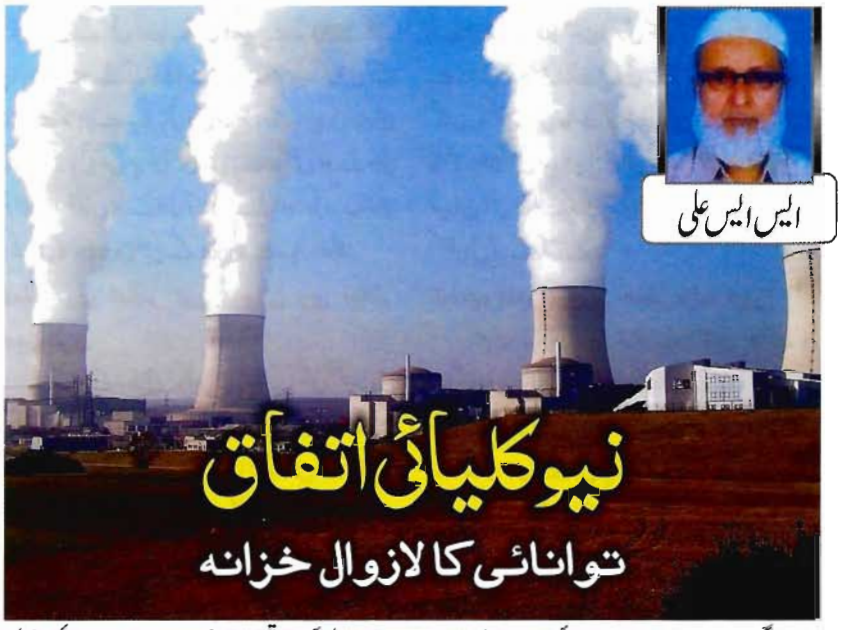

نیوکلیائی اتفاق
توانائی کا لازوال خزانہ

ایس ایس علی

گزشتہ چند دہائیوں میں توانائی کا بحران ایک بڑا مسئلہ بن کر سامنے آیا ہے۔ اس کے ازالے کے لیے دنیا کے گوشے گوشے میں توانائی پیدا کرنے کے مراکز قائم کیے جا رہے ہیں، لیکن آبادی میں اضافے اور صنعتی ترقی کے نتیجے میں توانائی کی کھپت اور اس کی پیداوار میں توازن قائم نہیں ہو پا رہا ہے۔ دنیا کی حکومتیں، پالیسی ساز افراد اور سائنسداں دن رات اس مسئلے کو حل کرنے میں جٹے ہوئے ہیں۔ روایتی طریقوں سے توانائی کی پیداوار کے چلتے سائنس دانوں کی توجہ کا مرکز نیوکلیائی اتفاق (Nuclear Fusion) بن چکا ہے۔ مستقبل میں نیوکلیائی اتفاق توانائی کا لازوال خزانہ ثابت ہوسکتا ہے جو ساری دنیا کی توانائی کے بحران سے چھٹکارا دلا سکتا ہے۔

توانائی کیا ہے؟

سائنس کی زبان میں کام کرنے کی صلاحیت کو توانائی (Energy) کہتے ہیں۔ توانائی کی چھ قسمیں ہیں: برق (Electricity) جسے عرف عام میں بجلی کہتے ہیں، مقناطیسیت (Magnetism)، روشنی (Light)، آواز (Sound)، حرارت (Heat) اور نیوکلیائی توانائی (Nuclear Energy)۔ توانائی کی ایک قسم کو دوسری قسم میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔

توانائی اور توانائی کے بحران کا جب ذکر کیا جاتا ہے تو اس سے مراد بجلی ہوتی ہے۔ اس کے لیے لفظ پاور (Power) بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ دنیا میں سب سے زیادہ استعمال ہونے والی توانائی بجلی ہے۔

توانائی کی پیداوار

جغرافیائی حالات کے تحت توانائی مختلف ذرائع سے حاصل کی جاتی ہے۔ جس ذریعے سے توانائی حاصل کی جاتی ہے اسے وہی نام دیا جاتا ہے، مثلاً

(1) تھرمل پاور: ایندھن جلا کر حرارت حاصل کی جاتی ہے۔ اس حرارت سے پانی کو بھاپ میں تبدیل کیا جاتا ہے۔ بھاپ کی طاقت سے ٹربائن چلتے ہیں اور توانائی یعنی بجلی پیدا ہوتی ہے۔ اسے تھرمل پاور کہتے ہیں اور جہاں یہ توانائی پیدا ہوتی ہے اسے تھرمل پاور اسٹیشن کہتے ہیں۔

(2) ہائیڈ رولک پاور: پانی کو اونچائی پر جمع کرکے اسے ٹربائن کے Blades پر گرایا جاتا ہے جس کی وجہ سے ٹربائن چلتے ہیں اور بجلی پیدا ہوتی ہے۔ اسے ہائیڈ رولک پاور کہتے ہیں۔

(3) ونڈ پاور: تیز ہواؤں والے میدانی علاقوں میں پون چکی سے حاصل شدہ توانائی کو ونڈ پاور (Wind Power) کہتے ہیں۔

(4) سولر پاور: خطِ استوا اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں جہاں سال کے اکثر اوقات میں تیز دھوپ پڑتی ہے وہاں سولر پاور سیل کے ذریعے بجلی حاصل کی جاتی ہے اسے سولر پاور کہتے ہیں۔

(5) نیوکلیر پاور: توانائی کی ایک بڑی مقدار عناصر کے جوہروں کے مرکزوں (Neuclei) میں ذخیرہ کی ہوئی ہوتی ہے۔ یہ توانائی تین طریقوں سے آزاد (Release) ہوتی ہے، انشقاق (Fission)، اتفاق (Fusion) اور تابکاری (Radioactivity)۔ ان تینوں عمل میں مادّے (Mass) کی ایک قلیل مقدار توانائی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ مادے کے توانائی میں تبدیل ہونے کے عمل کو عظیم ماہر طبیعیات آئن اسٹائن نے اپنی مشہور زمانہ مساوات $E=mc^2$ سے ظاہر کیا ہے۔ یہاں E آزاد ہونے والی توانائی، m مادّہ اور c روشنی کی رفتار کو ظاہر کرتے ہیں۔

نیوکلیائی توانائی کے حصول میں سب سے اہم مسئلہ اس کے ری ایکٹر میں حادثات، سسٹم کا فیل ہوجانا اور پگھل جانا (Melt down) وغیرہ کا ہے۔ ماضی میں بہت سے حادثات ہو چکے ہیں جن سے جانی و مالی نقصان کے ساتھ ماحول کو کافی نقصان پہنچا ہے۔ ان حادثات میں تھری مائل آئی لینڈ (1979)، چرنوبل (1986) اور فوکوشیما (2011) اہم ہیں۔ دو سال کا عرصہ گزر جانے کے باوجود فوکوشیما کے ری ایکٹروں سے ابھی بھی جوہری شعاع پاشی (Atomic radiation) کا رساؤ جاری ہے۔ خبروں کے مطابق جاپان کے وزیراعظم شنجو آبے نے اکتوبر 2013 میں ساری دنیا کے ماہرین سے اس سلسلے میں مدد طلب کی ہے۔

نئے ذرائع کی تلاش

دنیا بھر کے سائنسداں توانائی کے نئے اور متبادل ذرائع کی تلاش میں رات دن سرگرداں ہیں۔ ہندوستان جیسے ترقی پذیر ممالک میں توانائی کا بحران ایک زبردست چیلنج ہے گزشتہ ساٹھ سالوں سے ماہرین طبیعیات (Psysicists) نے نیوکلیائی اتفاق (Nuclear Fusion) کو اپنی امیدوں کا مرکز بنا رکھا ہے۔ ہائیڈروجن کے جواہر (Atoms) کے اتفاق یعنی ملاپ (Fusion) سے ہیلیم (Helium) گیس تیار ہوتی ہے۔ اسی کے ساتھ توانائی کی بڑی مقدار بھی خارج ہوتی ہے۔ یہ توانائی حرارت کی شکل میں ہوتی ہے۔ یہ عمل ابھی صرف نظریاتی (Theoritical) مرحلے میں ہے۔ ابھی تک کوئی ایسی مشین تیار نہیں کی گئی جو اس عمل کو تجارتی سطح پر انجام دے سکے۔ لیکن نیوکلیائی اتفاق میں بے پناہ امکانات مضمر ہیں۔ ایک کلوگرام ہائیڈروجن کے ہیلیم میں تبدیل ہونے کے نتیجے میں حاصل ہونے والی توانائی 11,000 کلوگرام کوئلہ جلا کر حاصل ہونے والی توانائی کے برابر ہوتی ہے۔

زمین پر سورج کی تخلیق کی قواعد!

نیوکلیائی اتفاق کی بھٹی (Nuclear Fusion Reactor) کی تیاری کے لیے سورج ایک ماڈل ہے۔ وہ ایک قدرتی فیوژن پاور ری ایکٹر ہے۔ اربوں سال سے سورج میں ہائیڈروجن کے مرکزے (Nuclei) فیوز ہوکر ہیلیم میں تبدیل ہو رہے ہیں۔ اس فیوژن میں توانائی کی بہت بڑی مقدار خارج ہوتی ہے۔ اس مقدار کا اندازہ ہم اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ پوری دنیا کی آبادی ایک

سال میں جو توانائی استعمال کرتی ہے اس سے 100 ملین گنا توانائی، سورج ایک سیکنڈ میں خارج کرتا ہے۔ سورج میں نیوکلیائی اتفاق کا عمل اتنی کامیابی کے ساتھ لگاتار چلتے رہنے کی وجہ اس کے درمیانی حصے (Cores) میں موجود زبردست دباؤ (Pressure) اور 15 ملین ڈگری سیل سی ایس کی تپش ہے۔

نیوکلیائی اتفاق کے عمل میں سب سے پہلے جوہروں کے مرکزے اپنے اطراف گردش کرنے والے الیکٹرونس سے الگ ہوکر پلازمہ (Plasma) تیار کرتے ہیں۔ پلازمہ برقی باردار ذرات پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس حالت میں ہائیڈروجن ہیلیم میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ سورج ہر سیکنڈ 564 ملین ٹن ہائیڈروجن کو اس عمل کے ذریعے 560 ملین ٹن ہیلیم میں تبدیل کرتا ہے۔ ہائیڈروجن اور ہیلیم کی مقدار میں فرق یعنی 4 ملین ٹن مادہ توانائی میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ حالیہ تجربات بھی گرم پلازمہ میں وقوع پذیر ہونے والے فیوژن پر منحصر ہیں۔

آج کی تاریخ میں تجرباتی بھٹیاں (Test Reactors) ہی بنائے جاسکے ہیں۔ سب سے بڑے ٹسٹ ری ایکٹر کا پلازمہ چیمبر 80 مربع میٹر رقبے میں پھیلا ہوا ہے۔ اس میں ایک کلوگرام سے بھی کم ہائیڈروجن کو فیوژن کیا جاسکتا ہے۔ فیوژن کو روبہ عمل لانے کے لیے 100 ملین ڈگری سیل سی ایس تپش درکار ہے۔ یہاں ہائیڈروجن گیس، سالمے (H_2) کی بجائے جواہر (H) کے روپ میں موجود ہوتی ہے۔ ہائیڈروجن کے سالمات کو گرم کرنے کے لیے خوردلہروں (Micro Waves) کا استعمال کیا جاتا ہے۔

1997 میں برطانیہ کے Culthm میں ایک تجرباتی فیوژن ری ایکٹر لگایا گیا تھا جس کا نام Joint European Torus ہے۔ اس کا مخفف JET ہے۔ اس میں ہائیڈروجن کے فیوژن کا کامیاب تجربہ کیا گیا تھا۔ اس میں باوجود مذکورہ درجۂ حرارت حاصل ہونے کے ہائیڈروجن کے فیوژن کا عمل صرف چند سیکنڈ تک چل سکا۔ تاہم سائنسدانوں نے اس تجربہ کو ایک بڑی کامیابی کے طور پر Celebrate کیا۔ اس تجربے میں 25 میگاواٹ توانائی استعمال ہوئی جب کہ حاصل ہونے والی توانائی صرف 16 میگاواٹ تھی۔

دوسرا بڑا فیوژن ری ایکٹر ITER یعنی International Thermonuclear Experimental Reactor سے 10 گنا بڑا ہے، فرانس کے Cadarache مقام پر تعمیر کیا جارہا ہے۔ 2007 میں اس پروجیکٹ پر کام شروع ہوگیا ہے۔ 2016 تک اس کے مکمل ہوجانے کی امید ہے۔ 2020 تک پلازمہ تیار ہونے کے امکانات ہیں۔ تاہم جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے یہ تجرباتی ری ایکٹر ہوگا۔ امید کی جارہی ہے کہ تجرباتی سطح پر ہی سہی اس سے حاصل ہونے والی توانائی، استعمال ہونے والی توانائی سے زیادہ ہوگی۔ بہ الفاظِ دیگر اس کا Output اس کے Input سے زیادہ ہوگا۔

فشن ری ایکٹر اور فیوژن ری ایکٹر میں فرق

آج کے روایتی نیوکلیر پاور پلانٹ یعنی فشن ری ایکٹر میں یورینیم (Urenium) کے جواہر کو توڑا جاتا ہے جب کہ فیوژن ری ایکٹر میں ہائیڈروجن کے جواہر کو آپس میں جوڑا جاتا ہے۔ دونوں عمل میں توانائی کی بڑی مقدار خارج ہوتی ہے۔

فشن ری ایکٹر میں زنجیری تعامل (Chain reaction) کو روبہ عمل لانے کے لیے بھاری دھات

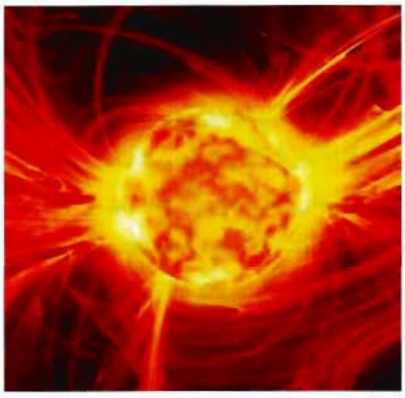

یورینیم کا استعمال کیا جاتا ہے جو تابکار (Radioactive) ہوتی ہے، جب کہ فیوژن ری ایکٹر میں بے ضرر ہائیڈروجن کے جواہر استعمال کیے جاتے ہیں۔

دونوں طرح کے ری ایکٹروں میں مادّے کو توانائی میں تبدیل کیا جاتا ہے لیکن فیوژن ری ایکٹر میں نسبتاً زیادہ مادّہ توانائی میں تبدیل ہوتا ہے، اس لیے نظریاتی طور پر زیادہ توانائی حاصل ہوتی ہے۔

فشن ری ایکٹر کا سب سے بڑا چیلنج اس کے زنجیری تعامل کو کنٹرول کرنا ہے۔ ایک مرتبہ یہ عمل شروع ہوگیا تو پھر یہ چلتا ہی رہتا ہے اور ہر لمحہ اس کی رفتار اور قوت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ زنجیری تعامل کی ایک خوفناک مثال ایٹم بم ہے۔ فیوژن کے عمل میں ایسا کوئی چیلنج نہیں ہے۔

فشن ری ایکٹر میں زنجیری تعامل کو بورون اسٹیل کی سلاخوں سے کنٹرول کیا جاتا ہے۔ یہ سلاخیں زائد نیوٹرونس کو جذب کرلیتی ہیں، جس سے زنجیری تعامل کنٹرول میں رہتا ہے۔ فیوژن ری ایکٹر میں پلازمے کا درجۂ حرارت 100 ملین ڈگری سیل سی ایس تک پہنچ جاتا ہے۔ اس درجۂ حرارت پر کوئی شے اپنی حالت پر برقرار نہیں رہ سکتی۔ اس حالت کو کنٹرول کرنے کے لیے انتہائی طاقتور مقناطیسی میدان استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ مقناطیسی میدان اس حالت کو غیر مرئی دھاگوں کی صورت میں کنٹرول کرکے رکھتا ہے۔

کیا نیوکلیر فیوژن خطرناک ہے؟

بہت زیادہ درجۂ حرارت، انتہائی طاقت ور مقناطیسی میدان اور خارج ہونے والی بے پناہ توانائی..... لگتا ہے کہ یہ ایک بہت ہی تباہ کن حالت ہے۔ لیکن سائنسداں اس سلسلے میں پوری طرح مطمئن نہیں۔ انھیں یقین ہے کہ فیوژن ری ایکٹر پوری طرح محفوظ ہوں گے۔ اس اطمینان کی وجہ سائنسداں یہ بتا رہے ہیں کہ فیوژن ری ایکٹر میں فشن ری ایکٹر کی طرح زنجیری تعامل وقوع پذیر نہیں ہوتا۔ اگر Micro Wave یا مقناطیسی میدان کا سسٹم فیل ہوجائے تو فیوژن کا عمل فوراً رک جائے گا۔ اصولی طور پر ری ایکٹر کے پگھلنے (Melt down) کا خطرہ نہیں ہوگا۔ لیکن تمام تر تحفظ (Safety) کے باوجود فیوژن کا عمل تابکاری (Radioactivity) سے مبرا نہیں ہے۔ فیوژن ری ایکٹر میں بطور ایندھن (Fuel) استعمال ہونے والے ہائیڈروجن کے ہم جا (Isotope) ٹری ٹیم (Tritium) اور پلازمہ چیمبر کی دیواریں جن پر تیز رفتار ذرات کی بمباری کی جاتی ہے، دونوں شعاع پاشی (Radiation) کا اخراج کرتے ہیں یعنی تاب کاری کا عمل وقوع پذیر ہوتا ہے۔ فیوژن ری ایکٹر کی یہ شعاع پاشی، فشن ری ایکٹر کی شعاع پاشی کے مقابلے میں بہت کم ہوتی ہے۔ اگر کوئی حادثہ ہوتا ہے تو شعاع پاشی بہت کم مقدار میں ہوگی۔ یہ مقدار فضا سے آنے والی شعاع پاشی کا صرف دسواں حصہ ہوگی۔

فیوژن ری ایکٹر کا پہلا پلانٹ کب کام شروع کرے گا؟

اس سوال کا جواب ذرا مایوس کن ہے۔ فیوژن ری ایکٹر کے فائدے حالانکہ ظاہر ہیں اور نظریاتی منصوبہ بالکل تیار ہے تاہم عملی طور پر توانائی کی پیداوار کے لیے چند دہائیاں لگ سکتی ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق دنیا کا پہلا نیوکلیر فیوژن ری ایکٹر 2050 کے آس پاس کام کرنا شروع کرسکے گا۔

S.S. Ali, Plot No 21, Line No5, Nehru Nagar, 1600 Plots, Akot Fide, Akola 0 444003 (MS)

سائبر دُنیا کے اَسرار

مظہر حسنین

انٹرنیٹ پر ہم جہاں برق رفتاری کے ساتھ معلوماتی سمندر میں غوطہ زن ہوکر اہم معلومات حاصل کرتے ہیں۔ وہیں انٹرنیٹ کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جو عام انٹرنیٹ صارفین کی رسائی سے دور ہے۔ جسے پوشیدہ ویب کہا جاتا ہے۔اس کے علاوہ اسے غیر مرئی ویب، عمیق ویب کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ اس پر موجود صفحات کی تلاش عام سرچ انجن کے ذریعے نہایت دشوار ہے۔ویب سائٹوں کے متلاشی سافٹ ویئرز مثلاً 'گوگل باٹ' انٹرنیٹ پر معلومات کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ جسے اطلاعاتی ٹکنالوجی کی زبان میں گشت (Crawl) کہا جاتا ہے۔گشت کے دوران یہ راستے میں آنے والے ہر ویب صفحہ کے بارے میں معلومات جمع کرتا ہے۔لیکن اس کی یہ کوشش بہت سطحی ہوتی ہے اور انٹرنیٹ کی تہوں میں محفوظ معلومات اس کی رسائی سے دور رہ جاتی ہیں۔ کچھ برقی صفحات ایسے ہوتے ہیں جن کے بارے میں سرچ انجن نہیں جانتا کہ وہ کیا ہیں۔ ایسے ویب صفحات چند تکنیکی

انٹرنیٹ کی گہرائیوں میں بے شمار اطلاعات محفوظ ہیں اور عام سرچ انجن کی نظروں سے اوجھل ہیں۔ جنھیں معیاری سرچ انجن کے ذریعے ان تہوں میں غوطہ زنی کر کے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ جب تک یہ صفحات لوگوں کی رسائی سے دور ہیں ان کے وجود کو بھی قبول نہیں کیا جا سکتا۔ اب تک انٹرنیٹ پر 30 لاکھ سے زائد پوشیدہ ویب سائٹوں کی موجودگی درج کی گئی ہے۔

طریقے اپنانے کی وجہ سے سرچ انجن سے پوشیدہ رہ جاتے ہیں اور گوگل سرچ پر بھی ظاہر نہیں ہوتے۔ وہ صفحات بھی پوشیدہ ویب میں شمار کیے جاتے ہیں جو یوزر نیم اور پاسورڈ کے بغیر نا قابل دید ہوتے ہیں۔ بہت سارے افراد اس تکنیکی مباحث سے ناواقف ہیں کہ سرچ انجن کا طریقہ کار کیا ہے اور یہ ہمارے لیے کیسے زیادہ کار آمد ہوسکتا ہے۔ان میں سے زیادہ تر افراد عام فہم استعمال کو پسند کرتے ہیں اور اس پہلو سے بے بہرہ ہوتے ہیں کہ کس طرح انہیں مزید بہتر معلومات فراہم ہوں۔ ان کی تلاش کے لیے روبوٹ (Robot) اور اسپائڈر (Spider) پروگراموں کا سہارا لیا جاتا ہے۔جن کی فعالیت پوشیدہ ویب کے مدنظر رکھ کر تیار کی جاتی ہے۔انھیں حصوں میں تقسیم کر کے خفیہ مواد کو قابل رساں بنایا جاتا ہے ۔اوّلین اسپائڈر (Spider) پروگرام کے ذریعے ان کی فہرست تیار کی جاتی ہے۔ جس کے بعد محفوظ معلومات تک آسان رسائی کو ممکن بناتا ہے اور آخری مرحلے میں یہ قابل دید ہو جاتا ہے۔ یونیورسٹیوں، بہت سی لائبریوں کے ڈیٹا بیسیز جہاں سرچ انجن کی راست رسائی نہیں ہو پاتی انہیں بھی پوشیدہ ویب کہتے ہیں۔ کیوں کہ لائبریری کے منتظمین کا یہ خیال ہوتا ہے کہ اس کی معلومات جو لوگ مستفید ہو سکتے ہیں وہ ان مواد کی طے شدہ قیمت ادا کر کے ہی انھیں حاصل کر سکتے ہیں۔لیکن بہت ساری لائبریریاں ایسی بھی ہیں جو کسی بھی فیس کے بغیر رجسٹریشن کے ذریعے معلومات سے فراہم کرتی ہیں ۔ایسے ڈیٹا بیسیز جن تک رسائی کے لیے قیمت ادا کرنی ہوتی ہے وہ استعمال کنندگان کا خیال رکھ کر تیار کیے جاتے ہیں۔ یہ طلبا کے لیے اہم ذریعہ ثابت ہوتے ہیں۔ان پر اہم جرنل اور دیگر خاص مواد کو یکجا کر دیا جاتا ہے۔ جو عام سرچ کی نظروں سے اوجھل ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر گوگل ، یاہو یا دیگر سرچ انجن عام معلومات کی تلاش کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی کتاب یا کسی خاص مضمون کی کچھ چیزوں کو عام ویب پر جگہ دی جاتی ہے جبکہ ان کی تفصیلات کو خفیہ ویب کا حصہ بنایا جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی تفصیلات تک آسانی سے رسائی ممکن نہیں ہوتی۔ایسا بھی نظریہ ہے کہ جہاں معلومات کثیر تعداد میں فراہم کی جاتی ہیں انھیں پوشیدہ ویب پر جگہ دی جاتی ہے۔ محققین کے لیے پوشیدہ ویب بہت سود مند ہوتی ہیں کیونکہ یہ نہ صرف حقیقی پہلوؤں کی راہ دکھاتی ہے بلکہ حقیقت کو واضح بھی کرتی ہے، یعنی گہرائی اور گیرائی سے مطالعہ کیا جاتا ہے نہ کہ سطحی طور پر۔سولیوین نے 2008 میں شائع اپنی کتاب میں تحریر کیا ہے کہ عام سرچ انجن کی تیاری عام معلومات کی فہرست تیار کرنے کی غرض سے کی جاتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ جو معلومات ، اطلاعات کو خفیہ رکھا جاتا ہے انہیں پوشیدہ ویب میں داخل کر دیا جاتا ہے اور سطحی طور پر سرگرداں سرچ انجن اس کو اپنی فہرست میں شامل نہیں کر پاتے۔ بہت سارے عام سرچ انجنوں کو بھی

اب اس قابل بنانے کی کوششیں تیز ہیں کہ وہ زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کریں۔ مثال کے طور پر گوگل کے سرچ انجن کی بہتر سے بہتر کارگردگی کے لیے مسلسل جدید سے جدید تر بنانے کا عمل جاری ہے لیکن ابھی بھی وہ پوشیدہ ویب تک رسائی حاصل کرنے سے دور ہے۔ اب اس پہلو کو بھی تقویت مل رہی ہے کہ پوشیدہ ویب کی اہمیت وافادیت میں روز افزوں اضافہ ہورہا ہے۔ پوشیدہ ویب کی اہمیت کا تکنیکی پہلو یہ بھی ہے کہ ویب ڈیٹا بیس ہمیشہ صارفین کو گمراہ کرتا ہے اور یہ کوئی بھی نہیں کہہ سکتا ہے کہ ویب سائٹ پر موجود مواد صداقت پر مبنی ہیں۔

پوشیدہ ویب کا سائز عام ویب سے تقریباً پانچ سو گنا زیادہ ہے۔ اس کو ویب ہیکرز، سائنسدان، غیر قانونی ادویات فروش، انقلاب پسند، سرکاری اہلکار، پولیس، اغوا کار، ریسرچر، خفیہ اطلاعات فراہم کرنے والے افراد اور ماہر سماجیات استعمال کرتے ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو تخریبی امور کے بجائے تعمیری امور میں یقین رکھتے ہیں لیکن سائبر قوانین اور حکومت کی سخت روی کے باعث وہ ایسا کرنے سے مجبور ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی ملک کی حکومت وہاں کی عوام پر زیادتی کررہی ہو اور وہاں میڈیا پر بھی پابندی ہو، ایسے میں زمینی حقائق کو دنیا تک پہنچانے کا ذریعہ صرف پوشیدہ ویب ہے۔ کیونکہ حکومتی ادارے عام ویب صفحات پر سخت نگرانی رکھتے ہیں۔ پوشیدہ ویب دراصل انٹرنیٹ سرور کا ایک نجی حصہ ہوتا ہے جس کے ذریعے خفیہ معلومات کو مخفی طریقے سے قابلِ رساں بنایا جاتا ہے۔ پوشیدہ ویب کے استعمال کی ایک عام فہم مثال وکی لیکس کے انکشافات ہیں۔ وکی لیکس کے انکشافات کا زیادہ تر حصہ پوشیدہ ویب پر گزشتہ کئی برسوں سے موجود ہے۔ عرب دنیا میں احتجاجات اور انقلابات بھی پوشیدہ ویب پر موجود بلاگز اور فورمز کا نتیجہ ہیں۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت ناواقفیت ہے۔ اس کو استعمال کرتے ہوئے صارف اپنی شناخت ظاہر کیے بغیر کاروبار اور معلومات کا تبادلہ کرسکتا ہے۔ نیز اُس صارف کی شناخت تک پہنچنا حکومت کے لیے صرف مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ گوگل نے اب پوشیدہ ویب تک رسائی کی کوشش شروع کردی ہے۔ لیکن یہ ایک دشوار ترین عمل ہے۔ 2005 میں پوشیدہ ویب کی تلاش کے لیے یاہو (Yahoo) نے بھی کوشش کی تھی لیکن انھیں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہو پائی۔

1995 میں ایڈنبرگ یونیورسٹی کے ایک طالب علم این کلارک نے کمپیوٹر سائنس کے لیے اپنے تحقیقی مقالے میں شناخت کے انکشاف کے بغیر انٹرنیٹ کے استعمال کے نئے طریقے کی تجویز پیش کی۔ درحقیقت اُس کا خیال تھا کہ وہ ایک ایسا سافٹ ویئر بنائے گا جس کے ذریعے لوگ انٹرنیٹ پر مخفی رہتے ہوئے کسی بھی قسم کی معلومات کا آزادانہ تبادلہ کرسکیں گے۔ کلارک کے اساتذہ اس کے خیال سے متفق نہیں ہوئے۔ لیکن وہ اپنی اس منزل مقصود کی جانب یقیں محکم، عمل پیہم کے ساتھ رد بہ سفر رہا اور سنہ 2000 میں اپنا تیار کردہ سافٹ ویئر اس نے پیش کیا۔ تب سے اس سافٹ ویئر کی بیس لاکھ سے زائد کاپیاں ڈاؤنلوڈ کی جاچکی ہیں۔ جب صارف پوشیدہ ویب کے کسی وسیلے تک رسائی حاصل کررہا ہوتا ہے تو وہ وسیلہ

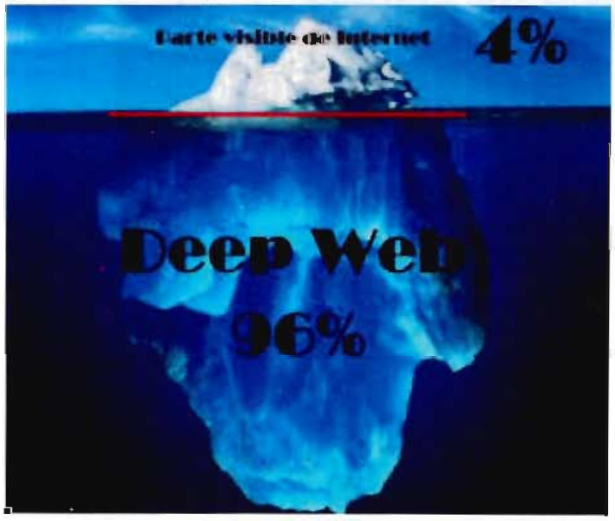

دراصل کئی دوسرے صارفین کے کمپیوٹرز سے ہوتا ہوا صارف تک پہنچتا ہے، یعنی ایک تقسیم شدہ طریقے سے معلومات کا تبادلہ ہورہا ہوتا ہے اور اس طرح صارف کے کمپیوٹر کی شناخت کرنا ناممکن ہوجاتا ہے۔ پوشیدہ ویب تلاش کرنے کے دو مقبول طریقے ٹور (Tor) اور آئی ٹو پی اینانیمس نیٹ ورک (12P Anonymous Network) ہیں۔ خلاصہ یہ کہ پوشیدہ ویب جہاں خیر خواہوں کو کچھ اچھا کرنے کا ایک ذریعہ فراہم کرتا ہے وہاں یہ بدکاروں اور بدخواہوں کے لیے ایک خفیہ اور موزوں پناہ گاہ بھی ہے۔

انٹرنیٹ کی گہرائیوں میں بے شمار اطلاعات محفوظ ہیں اور عام سرچ انجن کی نظروں سے اوجھل ہیں۔ جنھیں معیاری سرچ انجن کے ذریعے ان تہوں میں غوطہ زنی کرکے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ جب تک یہ صفحات لوگوں کی رسائی سے دور ہیں ان کے وجود کو بھی قبول نہیں کیا جا سکتا۔ اب تک انٹرنیٹ پر 30 لاکھ سے زائد پوشیدہ ویب سائٹوں کی موجودگی درج کی گئی ہے۔ 2006 میں ان کی تعداد صرف 14 ہزار تھی۔ کچھ ویب صفحات انجانے میں یا تکنیکی خرابی کے باعث عام ویب سے اوجھل ہوکر خفیہ ویب میں شامل ہوجاتے ہیں۔ ایک سائنسی جنرل میں پوشیدہ ویب کے تعلق سے شائع ہونے والے ایک تحقیقی مقالے میں اس بات کا ذکر کیا گیا ہے کہ کچھ ویب صفحات اس لیے بھی پوشیدہ ویب میں شامل ہوگئے چونکہ انھیں کسی بھی سرچ انجن کے ساتھ رجسٹر ڈ نہیں کیا گیا۔ کچھ ویب سائٹوں کو معینہ مدت کے لیے خفیہ رکھا جاتا ہے اور مدت پوری ہونے کے بعد وہ عام صارفین کے لیے قابل استعمال ہوتی ہیں۔

2001 میں سب سے پہلے ڈیپ ویب (Deep Web) کی اصطلاح برگ مین (Bergman) کی تحقیق میں سامنے آئی۔ جنھیں کئی حصوں میں تقسیم کیا گیا مثلاً متحرک مواد، غیر منسلک مواد، ذاتی ویب، متعلقہ ویب اور اسکرپٹ مواد وغیرہ۔ انٹرنیٹ پر معلومات فراہم کرنے والے سافٹ ویئر کو کرالرز (Crawlers) کی اصطلاح دی گئی ہے جو نہ صرف انٹرنیٹ کی سطح پر گردش کرتا رہتا ہے بلکہ کچھ نئی اطلاعات موصول ہونے پر اسے درج بھی کرلیتا ہے۔

پوشیدہ ویب کی تلاش کے لیے اب تیزی سے کام ہونے شروع ہوئے ہیں۔ گوگل کے ساتھ ساتھ دوسری کمپنیوں نے بھی اس جانب توجہ مبذول کی ہیں۔ یہاں تک کہ پوشیدہ ویب کی تلاش کے صحیح متبادل پیش کرنے کے لیے کمرشیل سرچ انجن کی تیاری میں مصروف ہیں۔ موجودہ وقت میں پوشیدہ یا خفیہ ویب کو معلومات کا ایک اہم ذریعہ تسلیم کیا جا رہا ہے۔ جس طرح معلومات فراہم کرنے کے لیے مطبوعہ ذرائع کے ساتھ ساتھ، ریڈیو، ٹیلی ویژن، سی ڈیز، ڈی وی ڈیز اور انٹرنیٹ ویب سائٹ اور اب پوشیدہ ویب اس ترقی یافتہ عہد کی اہم کڑی ہے۔ پوشیدہ ویب پر پائی جانے والی معلومات کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ حقائق پر مبنی ہوتی ہیں۔ جو طلبا، اساتذہ اور محققین کے لیے اہم ہیں۔

Mazhar Hasnain, 212-E, Mahanadi Hostel, JNU, New Delhi-110067

موتی لال جوت وانی

تحریکِ محبت

مہیش نیند سے جاگا تو اس نے بستر پر پلٹ کر دیکھا کہ پارو پاس نہیں تھی۔ وہ بستر سے نہ جانے کب اٹھ کر صبح کام کاج میں مصروف ہوگئی تھی۔ اس نے خواب گاہ میں چاروں طرف دیکھا تو اسے خواب گاہ سونی سونی سی لگی۔ رات بھر ایک عجیب قسم کے تناؤ کی وجہ سے سناٹا چھایا رہا تھا۔

اس نے سوچا کہ کچھ مہینوں سے یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ پہلے تو کبھی ایسا نہیں تھا۔ اسے یاد آیا کہ میاں بیوی دونوں بیک وقت ایک ساتھ بیدار ہوا کرتے تھے۔ کچھ دن پہلے اس نے اس سلسلے میں پارو سے پوچھا بھی تھا ''کیوں پارو، پہلے تو صبح سویرے ہم دونوں تقریباً ایک ساتھ جاگا کرتے تھے اور ہماری آنکھیں دھیمے دھیمے مسکراتی ہوئی آپس میں باتیں کیا کرتی تھیں۔ اب یہ خواب گاہ ایسی کیوں ہوگئی ہے؟''

پارو نے پہلے اس کے چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کردی تھیں پھر جلد ہی وہ نظروں کو ہٹا کر بولی ''یہ اس لیے ہوا ہے کہ اب ہم دونوں اپنے آپ کو بیک وقت نیند کی نذر نہیں کرتے، اب تمھاری زندگی کا ٹائم ٹیبل بگڑ گیا ہے...'' پھر وہ وہاں سے چلی گئی اور مہیش غور وفکر میں ڈوب گیا کہ صبح بیدار ہونے پر ان کے چہروں پر جو تازگی ہوتی تھی وہ کہاں کھوگئی ہے۔

اس نے سامنے دیوار پر لگی گھڑی میں وقت دیکھا، سات بج چکے تھے۔ ایک بار اس کے جی میں آیا کہ بستر سے اٹھ کر ٹوائلٹ چلا جائے۔ لیکن اسے انتظار تھا کہ ابھی پارو چائے کے دو بڑے مگ لیے اس کے پہلو میں آبیٹھے گی۔ وہ دونوں ساتھ بیٹھ کر اطمینان سے چائے پئیں گے اور ایک دوسرے سے گزشتہ کل، موجودہ آج اور آئندہ کل کی باتیں کریں گے۔ ان میں سے کچھ باتیں ان کی جوان ہوتی بیٹی انیتا کے بارے میں بھی ہوں گی۔ وہ بستر پر لیٹا ہی رہا۔ اس نے آنکھیں اٹھا کر چھت کو گھورا۔ اسے لگا کہ اس کے گھر کی چھت بہت مضبوط ہے۔ اس نے چاروں طرف دیکھا اور محسوس کیا کہ وہ چھت جن چار دیواروں پر ٹکی ہوئی ہے، وہ چاردیواریں بھی بہت مضبوط ہیں۔ پھر اس کا دھیان متصل کمرے کی طرف گیا۔ اس میں ہلچل محسوس نہ کرکے اس نے سمجھا کہ انیتا ابھی تک محوِ خواب ہے۔ ویسے وہ اتنی دیر تک سوتی تو نہیں ہے۔ آج اسے کیا اپنے کالج نہیں جانا ہے؟ گزشتہ رات جب وہ بہت دیر سے گھر لوٹا تھا تب انیتا اپنے بیڈ روم میں آچکی تھی۔ کل شام کو اس کی برتھ ڈے پارٹی تھی اور وہ اس میں شرکت نہیں کرسکا تھا۔ اس نے اس کے کمرے کا دروازہ کھول کر اسے برتھ ڈے کی مبارک باد دینی چاہی تھی لیکن پارو نے اسے ایک دم روک کر کہا تھا ''نہیں، انیتا یہ کہہ کر سوئی ہے کہ ڈیڈی مجھے نہ جگائیں!''

اس نے اس بات سے اندازہ لگایا کہ ماں بیٹی دونوں اس سے بہت ناراض ہیں۔ اس نے پارو کو صفائی دیتے ہوئے بہت محبت سے کہا تھا ''دیکھو پارو میں کیا کروں؟ فلائٹ دیر سے آئی۔ بمبئی ہوائی اڈے پر ہی ہوائی جہاز میں کوئی نقص پیدا ہوگیا تھا۔ وہاں سے ہوائی جہاز بہت دیر سے روانہ ہوا...'' لیکن پارو کو اس بات سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس نے اسے نہ کوئی جواب دیا تھا نہ کوئی سوال کیا تھا۔ بیڈ روم میں رات بھر کوئی بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ بیڈ روم رات بھر گونگا رہا تھا۔

قریبی ڈرائنگ روم کی گھڑی سے آٹھ بار نشیلی نشیلی گھنٹے کی آواز آئی تو بیڈ روم میں مہیش کے بستر تک ٹرالی سرکا کر لانے کی آواز ہوئی۔ اس نے اپنی بند آنکھیں کھول کر دیکھا۔ رامو صبح کی چائے بہت ہی روایتی انداز سے ٹی پاٹ، ملک پاٹ اور شوگر پاٹ، ٹرالی میں رکھ کر لے آیا تھا۔ وہ مہیش کے لیے چائے بنانے لگا تو مہیش نے اس سے پوچھا ''کیوں رامو، آج میم صاحبہ کہاں ہیں؟''

اس نے دبی زبان سے کہا ''صاحب، میم صاحبہ نے کہا ہے کہ تم صاحب کے لیے چائے لے جاؤ، میں نے چائے پی لی ہے۔'' مہیش نے پھر پوچھا ''کیا انیتا ابھی تک سو رہی ہے؟''

رامو کافی عرصے سے اس گھر میں ملازم تھا، لہٰذا اسے گھر، خاندان کی باتوں کا علم تھا۔ اس نے جواب دیا ''صاحب، چھوٹی میم صاحبہ تو آج بہت صبح اٹھی تھیں۔ آپ کل ان کی برتھ ڈے پارٹی میں نہیں تھے اس لیے انھوں نے آپ سے کٹی کی ہے اور وہ آپ سے روٹھ کر پانچ منٹ پہلے کالج چلی گئی ہیں۔''

''اس وقت کالج گئی ہیں؟'' مہیش نے اپنا غصہ ملازم پر نکالا۔ لیکن لمحہ بھر میں ہی وہ نہ جانے کس سوچ میں گم ہوگیا۔ رامو موقع ملتے ہی چپکے چپکے کمرے سے باہر نکل گیا۔ چائے پینے کے دوران مہیش نے کمرے کی چاروں دیواروں اور ان پر ٹکی چھت کو دیکھا۔ اسے محسوس ہوا کہ ان پر آئل پینٹ کرانے سے اور بڑی بڑی تصویریں ٹانگنے سے یہ دیواریں مضبوط نہ بن سکیں گی اور چھت اگر اس بڑے فانوس کا بوجھ اٹھا سکتی ہے تو یہ بھی اس وجہ سے مضبوط نہیں ہوجائے گی۔ پارو اور انیتا دونوں اس سے بہت ناراض ہیں۔ لیکن وہ اس کی مجبوری کو کیوں نہیں سمجھتیں؟ ٹھیک ہے کل وہ انیتا کی پارٹی میں شریک نہیں ہوسکا تھا۔ اس سے آسمان تو نہیں گر پڑا تھا! انیتا کے ساتھ اس کی ماں تو پارٹی میں تھی نا؟ ماں، بیٹی یہ کیوں نہیں سمجھتیں کہ وہ ایک بڑی کمپنی کا چیئرمین۔ کم۔ مینیجنگ ڈائرکٹر ہے اور اس کی کئی بڑی ذمے داریاں ہیں۔ وہ کل بمبئی میں تھا، آج دلی میں اپنے گھر میں ہے۔ اپنے گھر میں بھی بھلا وہ کتنی دیر بیٹھ سکے گا؟.. اسے دفتر جانا ہوگا اور کل؟ کل اسے نہ جانے کہاں جانا پڑے!

وہ چائے پی کر باہر نکلا۔ اس نے دیکھا کہ پارو دوشیزہ بنی جھولے میں بیٹھی 'ٹائمس' اخبار پڑھ رہی تھی۔ اس کے پاس کاروباری دنیا سے متعلق اخباروں کا پلندہ جیسے کاتیسا پڑا تھا... بھلا اس کا کاروباری اخباروں سے کیا واسطہ! اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس نے دھیان سے دیکھا... پارو اس کے موجودگی سے بے نیاز رہی۔ پھر سامنے کچن میں 'کک' بھی آگئی تھی۔ اس کے سامنے بھلا وہ پارو سے کیا کہہ سکے گا؟ وہ سیدھے آگے جا کر ٹوائلٹ میں گھس گیا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ گونگے پن کا دریا پار کر کے ٹوائلٹ میں پہنچا تھا۔

ٹوائلٹ کی سیٹ پر بیٹھ کر مہیش کو ایک قسم کی فراغت حاصل ہوئی۔ اسے لگا، وہاں بیٹھ کر وہ ساری باتوں کو صحیح صحیح تناظر میں دیکھ سکتا ہے۔ اسے کئی قسم کی کشیدگیوں سے نجات محسوس ہوتی ہے اور مسائل کے مکمل حل سوجھتے ہیں۔ اس نے سوچا، وہ اتنا بڑا وبال کیوں پالتا رہے؟ کیوں نہ اپنی کمپنی کے اتنے شیئرز بیچ دے جتنے اس کے چیئرمین۔ کم۔ مینیجنگ ڈائریکٹر کے عہدے سے ہٹ جانے کے لیے کافی ہوں۔ کمپنی کا چیئرمین ہونا دردسری کا کام ہے۔ اس کے لیے جی توڑ محنت کرنی پڑتی ہے اور پھر اس عہدے پر رہنے سے گھریلو زندگی بخوبی چل نہیں پاتی۔ پارو کے چاند سے چہرے کو اس کی لیڈی سکریٹری کا گرہن لگ گیا ہے۔ دفعتاً اس نے سوچا، نہیں نہیں، وہ ایک 'سیلف میڈ' آدمی ہے اس نے اپنی زندگی میں محنت و مشقت سے یہ مرتبہ حاصل کیا ہے۔ کمپنی کی جانب سے بہت سی سہولیات فراہم ہیں۔ یہ بنگلہ، یہ نوکر چاکر، چیئرمین ہونے کی حیثیت سے ہی تو ملے ہیں!

اس نے اٹھ کر ٹوائلٹ کی ٹنکی کا ہینڈل گھمایا تو پاٹ میں پانی گڑگڑاہٹ کے ساتھ بہہ نکلا۔ اس نے واش بیسن میں ہاتھ دھوئے، دانت صاف کیے اور بڑھی ہوئی داڑھی کو صفاچٹ مونڈا۔ پھر اندر سے ہی رامو کو آواز دی... ''رامو، مجھے وہاں سے انڈرویر اور بنیان لا دو۔''

رامو کو معلوم تھا کہ اب صاحب اسے آواز دیں گے۔ وہ پہلے سے ہی یہ چیزیں لے کر ٹوائلٹ کے باہر کھڑا تھا۔ اس نے نیم وا دروازے سے کپڑے اندر پکڑا دیے۔

مہیش نے شاور کھول کر اپنے بدن پر خوشبو دار صابن ملا۔ دیکھا، گندگی اس کے تن پر سے نالیاں بنا بنا کر بہہ رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ کیا تن کی گندگی کی نالیوں کی طرح من کی گندگی کی بھی نالیاں ہیں؟... صاف ستھرا انڈوریر اور بنیان اور اس کے اوپر کچھ دیر کے لیے رات والے کپڑے پہن کر وہ ٹوائلٹ سے باہر نکلا۔ دروازے کے باہر پارو ٹوائلٹ کے اندر جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ وہ اندر گئی۔ لیکن مہیش ابھی وہاں سے چار چھ قدم ہی آگے بڑھا ہوگا کہ پارو بھی نکل آئی۔ مہیش نے پیچھے مڑ کر حیرت سے پارو کو دیکھا۔ اسے معلوم نہ ہوسکا کہ پارو کو ٹوائلٹ میں کس چیز کی ضرورت تھی۔ ایک لمحے کے لیے اس کے دل میں شک نے انگڑائی لی کہ وہ اس کا میلا انڈرویئر اور بنیان دیکھنے گئی تھی۔ پھر اس نے اپنے دل میں کہا... نہیں، نہیں، وہ ایسا کیوں کرے گی۔

مہیش وہاں ساکت و صامت کھڑا رہ گیا۔ پارو کی خاموشی اس کے لیے ناقابل برداشت ہوگئی تھی۔ اس نے گونگے دریا میں سے سر اوپر اٹھا کر پارو سے کہا ''تم اتنی خاموش خاموش کیوں ہو؟.. اور یہ انیتا؟ وقت سے اتنے پہلے کالج کیوں چلی گئی ہے؟''

''تم مجھ سے بات مت کرو۔ کہے دیتی ہوں، مجھ سے کچھ نہ بولو... تم ورکو ہلک ہو... کام، کام، ہمیشہ کام... یہ کمپنی کیا ہوئی۔ ماں بیٹی کے لیے ایک مصیبت بن گئی...''

گونگا دریا ابل پڑا تھا۔ اس میں اچانک ہی ایک زوردار لہر اٹھی تھی۔ اس لہر کا رنگ روپ، انداز و ادا، لب ولہجہ کیسا تھا، کچھ معلوم نہیں ہوا۔ مہیش اس اتھل پتھل سے دہشت زدہ ہوگیا۔ اس نے اپنے چاروں طرف دیکھا اور کہا ''پارو، دیکھو تم نوکروں کے سامنے تماشہ کر رہی ہو.. نوکر کیا کہیں گے؟

''کچھ بھی کہیں! ان نوکروں نے ہی ہماری زندگی برباد کی ہے۔''

اس نے پھر بھی دھیرے سے پوچھا ''برباد؟''

''ہاں، ہماری زندگی برباد کی ہے۔ کیا تم یہ نہیں

دیکھتے کہ گھر کا کوئی کام نہ کرنے سے اور ان نوکروں سے صرف ہش ہش کرنے سے میرے بدن پر چربی چڑھ گئی ہے؟ بدن میں نقص پیدا ہوگیا ہے؟''

اب دوسری لہر بھی زوروں پر تھی۔ دونوں لہریں ایک دوسرے کا سر پھوڑنے کے لیے ٹکرا اٹھیں۔

''بدن میں نقص پیدا ہوگیا ہے؟'' مہیش نے چلا کر پوچھا۔

''ہاں، میرے تن میں اور تمھارے من میں کجی آگئی ہے۔''

''تم جانتی ہو کہ تم کیا کہہ رہی ہو،''

''تم جب جب دیر سے گھر لوٹتے ہو تو یہ فحش انڈرویئر اور بنیان ٹوائلٹ کی بالٹی میں ڈبو آتے ہو۔ آج بھی تم نے یہی کیا!''

''تو کیا تم ٹوائلٹ میں ابھی یہ سب دیکھنے گئی تھیں... مجھے پہلے ہی لگا تھا کہ...''

''ان حالات میں گھر میں ایسی فرصت ہی فرصت ہونے سے میں بھی گھر سے باہر جا کر تھوتھن مار سکتی ہوں۔ میرا دل بھی بہک سکتا ہے لیکن تمھیں معلوم ہے کہ میں ایسا نہیں کرسکتی۔''

''تو کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ میری سکریٹری اپنے گھر سے فارغ ہوکر میری خدمت کرنے میں مصروف ہے؟''

''ہاں تمھاری خدمت میں لگی ہے... ان نوکر، نوکرانیوں نے ہماری زندگی برباد کی ہے...''

مہیش سمجھ گیا کہ اس بار نوکرانیوں میں اس کی سکریٹری بھی شامل کرلی گئی ہے۔ اس نے چلا کر کہا ''تمھیں معلوم ہے کہ مجھے کمپنی کے علاوہ کسی اور کام کے لیے فرصت نہیں ہے؟''

''تمھیں تو اپنی جوان ہوتی بیٹی کے لیے بھی فرصت نہیں ہے!''

''تم ایسا کیوں کہتی ہو؟''

''میں صحیح کہہ رہی ہوں۔ کل تم اس کی برتھ ڈے پارٹی میں بھی شریک نہیں ہوئے۔''

''ہاں شریک نہ ہوسکا۔ میں کیا کرتا۔ آتے ہی میں نے تمھیں بتایا کہ وہ میرے اختیار میں نہیں تھا.. لیکن تم تو پارٹی میں تھیں نا؟''

''صرف میرے ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ جو بیٹیاں ایسے موقعوں پر بھی اپنے باپوں کی کمپنی سے محروم رہ جاتی ہیں وہ یقیناً اوباش لڑکوں کی صحبت میں پڑ جاتی ہیں۔''

''تم کیا کہہ رہی ہو؟ پارٹی میں ایسا کچھ ہوا کیا؟''

''ایسا کچھ ہوا ہوگا تبھی تو تمھاری لاڈلی بیٹی آج صبح صبح بن ٹھن کر اپنے بوائے فرینڈ کلاس فیلو کے ساتھ اس کی موٹر سائیکل پر بیٹھ کر کالج چلی گئی ہے... اب اسے تمھاری آفس کار کی لفٹ کی ضرورت نہیں ہے۔''

اتنے میں دروازے کی گھنٹی بجی۔ ہو نہ ہو مہیش کے دفتر کا کار ڈرائیور آیا ہوگا اور صاحب کی کار جھاڑ پونچھ کر تیار رکھنے کے لیے کار کی چابی کی ضرورت ہوگی۔ مہیش نے ڈرائیور کو چابی دینے کے لیے رامو کو آواز دی۔ اس وقت رامو بیڈ روم سے میلی چادروں، لحافوں کا ڈھیر لے کر نکلا۔ اس نے پھرتی سے اس ڈھیر کو ٹوائلٹ میں رکھا اور ڈرائیور کو چابی دینے چلا گیا۔

مہیش نے بیڈ روم میں جا کر دفتر جانے کی تیاری کی۔ بال سنوارے اور کپڑے تبدیل کیے۔ اتنے میں کک نے بیڈ روم کے باہر آ کر آواز دی ''صاحب، ٹیبل پر بریکفاسٹ لگ گیا ہے۔''

وہ باہر آ کر بریکفاسٹ ٹیبل کی طرف بڑھا۔ اس نے دیکھا کہ ٹیبل پر اکیلے اس کا ناشتہ لگایا گیا تھا اور پاس ہی آج کے سارے اخبار پڑے تھے۔ وہ کرسی پر بیٹھا تو اسے لگا کہ دریا کا پانی اس کے سر کے اوپر پہنچ گیا ہے اور اب وہ اپنے آپ کو ڈوبنے سے نہیں بچا پائے گا۔ اس نے اب تک بہت کوشش کی تھی کہ وہ دریا کے موافق، مخالف تیرتے ہوئے اپنا سر پانی کی سطح سے اوپر رکھے اور اپنے کو ڈوبنے سے بچائے۔ اس نے اسی لمحے اپنے دل میں عزم کیا کہ وہ اس بار اپنے کو ڈوبنے نہیں دے گا۔ ویسے بھی یہ زندگی ایک لمحہ پر ہی ٹکی ہوئی ہے۔ ہمارا جینا یا مرنا، تیر کر پار پہنچنا یا منجدھار میں ہی ڈوب کر جان دینا سب کچھ ایک لمحے کا کھیل ہے۔ اسے اس لمحے کی پہچان ہوگئی تھی۔

وہ بریکفاسٹ ٹیبل کی کرسی سے اٹھا اور ڈرائنگ روم میں گیا۔ اس نے فون کا ریسیور اٹھایا اور ایک نمبر ملایا۔ ڈرائنگ روم کے باہر پارو نے سنا، مہیش فون پر کسی شخص سے کہہ رہا تھا ''ہاں، ہاں میرے آدھے سے زیادہ شیئرز اسے ہی بیچ دو... ہاں میں سمجھتا ہوں۔ پورے ہوش و حواس سے کہتا ہوں کہ یہ شیئرز بھلے ہی اسے فروخت کردو۔ میں اب کمپنی کا چیئرمین، کم۔ مینجنگ۔ ڈائرکٹر نہیں رہنا چاہتا۔''

پہلے تو پارو کچھ حیران ہوئی۔ پھر اس نے کچھ سنبھل کر سوچا کہ مہیش نے ٹھیک کام کیا ہے۔ لیکن اس فیصلہ کن لمحے میں اسے اس کے ساتھ رہنا چاہیے۔ اس نے کچن میں کک کو آواز دے کر کہا ''مس میری، دیکھو میرا ناشتہ بھی صاحب کی ٹیبل پر لگا دو۔''

مس میری کے چہرے پر ایک غیر واضح مسکراہٹ پھیل گئی...

■

ماخذ: ماہ نامہ 'ادب لطیف'، تراجم کہانیاں 1998، لاہور

فکر و تحقیق، نیا افسانہ نمبر: ایک جائزہ

علی احمد فاطمی

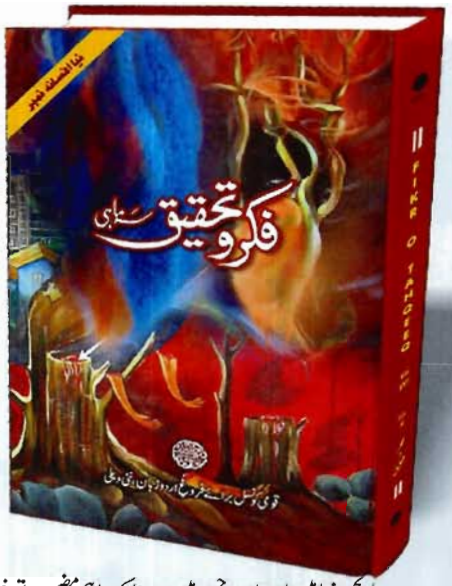

فکر و تحقیق قومی اردو کونسل دہلی کا ادبی رسالہ ہے۔ جس نے ادھر چند برسوں میں کئی اہم شمارے اور خصوصی نمبر شائع کر کے اردو کی ادبی دنیا میں اپنی منفرد شناخت قائم کر لی ہے۔ نئی غزل نمبر اور منٹو نمبر اس کی تازہ ترین مثالیں ہیں اور اب پیش نظر ہے 'نیا افسانہ نمبر' جو کئی مہینوں کی غیر معمولی محنت، عرق ریزی کے بعد منظر عام پر آیا ہے جس کی خوب خوب پذیرائی ہو رہی ہے، جس کے لیے کونسل کے ڈائرکٹر اور مدیر پروفیسر خواجہ اکرام الدین اور نائب مدیر ڈاکٹر عبدالحی بطور خاص مبارک باد کے مستحق ہیں۔

651 صفحات پر مشتمل اس نمبر میں تقریباً اکتالس 41 مضامین شامل ہیں۔ کچھ مباحث اور مدیر محترم کا ایک عمدہ لائق مطالعہ اداریہ بھی ہے جو اپنے آپ میں ایک مقالے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس اداریے کا مرکزی خیال جو اپیل کرتا ہے کہ انھوں نے بھی صنف افسانہ کو علامت سے زیادہ حقیقت کے قریب بتایا ہے اور یہی حقیقت ہے۔ زمانہ کوئی ہو نظریہ بھی کوئی، لیکن افسانہ بقول خواجہ اکرام الدین ''اس حقیقت نگاری کے تصور سے استحکام حاصل ہوا ہے۔'' اور یہ بھی ''ترقی پسندی نے موضوعات میں تنوع پیدا کی۔ ترقی پسندی کا دور اردو افسانے کا سنہرا دور کہا جاسکتا ہے۔ اردو فکشن کے دامن میں گوناگوں اضافہ ہوا۔'' اور جدید افسانوں کے بارے میں یہ بھی کہا کہ جدیدیت سے متاثر افسانوں میں تہداری اور معنوی ابعاد کی گنجائشیں پیدا ہوئیں جس سے افسانے کو ایک نیا رنگ و آہنگ حاصل ہوا۔'' باتیں اور بھی ہیں لیکن 1980 کے بعد کے افسانوں پر وہ زیادہ نہیں کھلتے کہ یہ سارے مضامین خود اس کی گواہی دیں گے۔ یوں بھی انھیں اداریہ لکھنا تھا افسانہ کی تاریخ نہیں۔

اس خصوصی شمارے کا پہلا مضمون ممتاز ادیب اور افسانہ نگار عابد سہیل کا ہے، جس کا عنوان ہے۔ 'نثر فکشن اور سروکار' یہ ایک ٹیکنیکل قسم کا مضمون ہے جس میں نثر کی ترتیب و تزئین اور تفہیم پر زیادہ گفتگو کی گئی ہے۔ تخلیق پر کم سے کم۔ خارج و باطن ربط و تسلسل، تحلیل و تجسیم کی باتیں عمدہ تو ہیں لیکن عابد سہیل خود تخلیق کار ہیں سمجھ سکتے ہیں کہ ان اصطلاحوں کو سامنے رکھ کر کوئی ارادی و شعوری تخلیق ممکن نہیں۔ یہ سب چیزیں تنقیدی سطح پر تو ٹھیک ہیں۔ مضمون کے آخر میں سروکار سے بحث کی گئی ہے۔ جو مختصر تو ہے لیکن موثر ہے۔ سب سے آخر میں چند نئے افسانہ نگاروں کی مثالیں ہیں اور یہ نتیجہ:

''آج کے افسانوی ادب میں خارج اور داخل آمنے سامنے نہیں کھڑے ہیں بلکہ دونوں نے ایک دوسرے کو تسلیم کر لیا ہے۔ افسانوی ادب خارجی حالات کی تفہیم کو زیادہ بامعنی بنا رہا ہے اور خارجی دنیا افسانوی ادب کی دنیا میں مداخلت کیے بغیر اسے Aunthenticity بخش رہی ہے۔ افسانوی ادب میں یہ Authenticity صرف اس وقت ممکن ہے جب سروکاروں کو نظریے کا اسیر نہ بنایا جائے اور آج کا فکشن نگار یہی کر رہا ہے لیکن اس کے معنی نظریے کی موت نہیں ہے۔'' (ص 24)

مضمون طویل ہونے کے باوجود نامکمل سا لگتا ہے۔ یہ اعتراف خود مضمون نگار نے بھی کیا ہے۔ دوسرا مضمون جانے مانے نقاد ابوالکلام قاسمی کا ہے، جو معاصر خواتین افسانہ نگاروں سے متعلق ہے۔ ابتداً ان کا خیال ہے کہ ان میں سے زیادہ تر لکھنے والیاں تازہ ترین و ہنگامی موضوعات پر لکھتی تو ہیں لیکن اپنے اظہار کو افسانہ بنانے کی مطلق پروا نہیں کرتیں اور یہ بھی۔ ''ان خواتین کو بیانیہ کے مسائل کبھی پریشان نہیں کرتے، تکنیک کی تبدیلی پر کوئی نیا موضوع مجبور نہیں کرتا اور رمزیت و سریت جو کسی بھی فن پارے کی بنیادی صفت ہونی چاہیے اس رمزیت اور سریت کی تخلیق سے اکثر وہ بے نیازانہ گزرتی رہتی ہیں۔'' بات کو سنبھالنے کے لیے وہ چند معاصر خواتین کے نسبتاً بہتر افسانوں پر گفتگو تو کرتے ہیں، لیکن نتیجہ وہی نکالتے ہیں کہ ان میں زیادہ تر کے یہاں فنی کمزوریاں ہیں اور یہی فنی مسائل ان کے لیے شناخت کی مشکلات بھی پیدا کرتے رہتے ہیں۔

خواتین افسانہ نگاروں سے متعلق اس نمبر میں چار پانچ مضامین اور ہیں، جن میں سے ایک اہم مضمون تو خود ایک خاتون افسانہ نگار ترنم ریاض کا ہے۔ 'اردو کی ادبیائیں منظر پس منظر' مضمون کا کینوس بڑا ہے اور پس منظر زیادہ۔ نئے دور کے افسانہ نگاروں پر دو ایک صفحے ہی ہیں۔ جن میں ذکیہ مشہدی اور غزال ضیغم پر چند سطریں لکھتی ہیں باقی کے نام گنواتی ہیں اور آخر میں یہ رائے جو ابوالکلام قاسمی کی رائے سے قدرے مختلف ہے:

''پچھلی دو دہائیوں سے زائد عرصے سے کئی اور اردو کی ادیباؤں کی تحریر منظر عام پر آئی ہیں۔ یہ تحریریں پڑھ کر ایک نئی تازگی کا احساس ہوتا ہے ان تحریروں سے تاریخ اور سماج پر خواتین کے ایک نئے تجزیے کا اندازہ ہوتا ہے۔'' (صفحہ 230)

دوسری اہم خاتون افسانہ نگار ہیں شائستہ فاخری جن کے مضمون کا عنوان ہے 'نسائی ادب اور نیا اردو افسانہ' جو ابتداً چند اہم سوالات قائم کرتی ہیں، جن میں ایک اہم سوال یہ بھی ہے۔

''1980 کے بعد خواتین افسانہ نگاروں کی جو صف سامنے آئی ہے اور جو افسانے موضوعات، نئی تکنیک، نئے اسلوب اور نئے مسائل کو افسانوں کے ذریعے پیش کرنے والی خواتین افسانہ نگاروں کے تخلیق کیے ہوئے افسانے نئے افسانے کہلائیں گے؟'' (ص 244)

سوالات اور بھی ہیں جن کے جواب کی تلاش ہے۔ پورا مضمون بدلتی ہوئی عورت، بدلے ہوئے مسائل، بدلے ہوئے غم اور یہ جملہ:

''آج کے نسائی ادب میں ایک عورت کا غم بھی کتنا شاعرانہ ہو گیا ہے۔ نہ اشک، نہ ماتم، نہ چیخیں، نہ آہ و زاری

بلکہ حالات سے آنکھیں چار کانے کا جذبہ، یہی ہے اکیسویں صدی کی عورت۔'' (ص 251)

یہ سب باتیں وہ تصورات، مفروضات کے حوالے سے نہیں کہتیں بلکہ تخلیقات کے حوالے سے کہتی ہیں۔ اس طویل مضمون میں نہ صرف افسانوں بلکہ افسانوی اقتباسات کے ذریعے اپنی بات کو اعتماد کے ساتھ پیش کیا ہے۔ شائستہ فاخری خالص فنکار ہیں ادیب و ناقد نہیں اس لیے واضح طور پر کہتی ہیں ''یہ ایک تخلیق کار کا اپنے عہد کی خواتین افسانہ نگاروں کی تخلیق کے تئیں محض ایک ذہنی ردعمل ہے۔'' یہ ردعمل فکری نہ بھی ہو لیکن فطری ہے، جو کتابی نوعیت کے تصورات وخیالات پر بھاری ہے۔

تقریباً اسی نوعیت کا ایک مضمون ڈاکٹر فخر الکریم کا بھی ہے۔ جو خاندانی زندگی کو بنیاد بنا کر لکھا گیا ہے۔ وہ بھی یہ نتیجہ نکالتے ہیں:

''جدید خواتین افسانہ نگاروں کے افسانوں میں یورپ کی تانیثی تحریک کی طرح مردوں کے خلاف جارحانہ انداز تو نظر نہیں آتا، لیکن وہ اپنی باتوں کو بڑے ہی سلجھے ہوئے انداز میں لے کر چلتی ہیں کہ عورتوں پر حالات کا جبر، مردوں کی زیادتیاں، جہل کے اثرات سب بے نقاب ہو جائیں۔'' (ص 242)

ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی کا مضمون اگر چہ بہار کی خواتین تک محدود ہے، لیکن انھوں نے بھی کم وبیش اسی قسم کے نتائج برآمد کیے ہیں۔ شموئل احمد نے بے وفا عورتوں کا ذکر خیر کیا ہے۔ کاش کہ وہ بے وفا مردوں کا بھی ذکر کرتے، جس کے لیے ایک مکمل کتاب درکار ہے۔ جس کا باب اول انھیں سے ہی منسوب ہوتا۔

شوکت حیات، حسین الحق، عبدالصمد، مشرف عالم ذوقی، نورالحسنین، رحمٰن عباس، احمد صغیر وغیرہ ہمارے عہد کے ممتاز فکشن نگار ہیں جو بنیادی طور پر فنکار ہیں لیکن گاہے بگاہے مضامین بھی لکھتے رہتے ہیں، جو تنقیدی کم تاثراتی زیادہ ہوتے ہیں۔ وہ کیفیت یہاں بھی ہے۔ شوکت اور ذوقی کے یہاں قدرے فیصلہ کن رویہ اور لہجہ نظر آتا ہے، جو ان کے شدت احساس کا مظہر تو ہوتا ہے لیکن یہی شدت تخلیق میں جذب ہو تو فن کی تشکیل ہوتی ہے۔ تنقید میں فکر کیوں نہیں بنتی کہ فکر کا تنقید میں ڈھل جانا بھی ایک طرح کا تخلیقی عمل ہے۔ تاہم دونوں پڑھے لکھے اور باخبر فنکار ہیں اور اپنے عہد کے حالات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔

دو مضامین افسانہ اور علامت سے متعلق ہیں۔ حسین الحق اور خورشید سمیع، دونوں مضامین اپنے اپنے اعتبار سے اہم ہیں۔ حسین الحق کا مضمون چونکاتا ہے اور خورشید سمیع کا غور وفکر پر مجبور کرتا ہے۔

سلیم شہزاد، قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی، قدوس جاوید، صغیر افراہیم، مناظر عاشق ہرگانوی، سینئر لکھنے والے ہیں پختہ قلم کار ہیں اس لیے تجزیہ میں پختگی تو ہے لیکن ان میں سے بعض جدید ذہن کے لکھنے والوں کی تنقیدی زبان پر سوال قائم کیے جاسکتے ہیں۔ خاص طور پر قدوس جاوید کی جو تنقیدی زبان ہے کیا یہ تنقید کی شرح وبسط کی زبان ہے۔ وضاحت وصراحت کی زبان ہے۔ جبکہ عمدہ ومتاثر کن تنقید نگاری بذات خود ایک تخلیقی عمل ہوا کرتی ہے۔ یہ نازک سی بات ہمارے وہ نقاد کب سمجھیں گے جو فکر سے زیادہ مصنوعی وثقیل زبان سے مرعوب کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔

سچ پوچھیے تو 1980 کے بعد کے افسانوں کا راست تجزیہ تو عبیدالرحمٰن ہاشمی، اسلم جمشید پوری، نگار عظیم، خورشید حیات، نورالحسنین، صدیق محی الدین، صالحہ زریں وغیرہ کے مضامین میں ملتا ہے۔ اب یہ تجزیے کتنے مکمل اور معتبر ہیں اس پر گفتگو ہو سکتی ہے، لیکن ان مضامین میں بھی اطلاعیں زیادہ ہیں اور تجزیے کم۔ کچھ کو یہ بھی نہیں معلوم کہ مضمون اور مقالے میں کیا فرق ہوتا ہے کہ عمدہ تنقید قول وفکر اور ذہن ووژن کے بغیر علمی وادبی اور تنقیدی تاثر چھوڑنے میں کامیاب نہیں ہو پاتی۔ اس لیے میں یہ کہنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ اس نمبر میں مضامین زیادہ ہیں مقالات کم۔ تاہم چند مقالے اپنے عنوان، بیان اور فکر کے حوالے سے متاثر کرتے ہیں۔ ان میں خالد اشرف، شائستہ فاخری، صدیق محی الدین، ابوبکر عباد، احمد صغیر، معصوم عزیز کاظمی، صالحہ زریں وغیرہ کے مقالے ہیں۔

نورشاہ، مشتاق احمد وانی نے کشمیر کے افسانے، نورالحسنین نے جنوبی ہند کے اور سید احمد قادری کے بہار کے افسانوں کا جائزہ بھی الگ زاویہ پیش کرتا ہے۔ مزاحمت، احتجاج، غم وغصہ وغیرہ کے حوالے سے بھی مضامین تاثر چھوڑتے ہیں۔ خاص طور پر احمد صغیر کا مضمون۔ اس شمارے میں شمیم حنفی، عتیق اللہ، قاضی افضال حسین، بیگ احساس، طارق چھتاری وغیرہ کی کمی کھٹکتی ہے۔ راقم کو بھی احساس ہوا کہ وہ بھی اس بزم میں موجود کیوں نہیں۔ اور کچھ یہ بھی کہ کیا یہ سارے مضامین جن کی تعداد 41 ہے۔ 80 کے بعد کے اردو افسانے کی تمام جہتوں و پرتوں، رجحان ومیلان کا احاطہ کرتے ہیں؟ کیا پورے طور پر مقامی اور جزوی طور پر عالمی اور گلوبل مسائل کو اردو افسانہ اپنے دامن میں جذب کر پا رہا ہے؟ کیا وہ اپنے ہی ملک کی دیگر زبانوں کے افسانوی ادب کے مدمقابل کھڑا ہو پا رہا ہے؟ خبر اور اطلاعات کی اس چکا چوند میں گہری سماجی بصیرت اور سنجیدہ انسانی واخلاقی شعور اور زندگی کا نیا عرفان دے پا رہا ہے؟ کیا وہ آج کے بازار واد کے چیلنجز قبول کر پا رہا ہے؟ کیا کوئی یادگار کردار، لازوال افسانہ دے پا رہا ہے؟ سوالات اور بھی ہیں جو اردو فکشن کے صف اول کے ناقد وارث علوی بھی اٹھاتے ہیں۔ محمد حسن اور قمر رئیس مرحوم بھی اٹھاتے تھے۔ وارث علوی تو صاف طور پر کہتے ہیں کہ آج کے افسانے بیدار نہیں کرتے۔ رات کی نیند حرام نہیں کرتے۔ وارث صاحب کے سوالات غلط ہو سکتے ہیں اور راقم کے بھی۔ لیکن آج کی سفاک حقیقتیں بھی غلط ہوں ایسا ممکن نہیں۔ ان حقائق کی تلاش اور سوالات کے جوابات ان مضامین میں کم سے کم نظر آتے ہیں، بلکہ زیادہ تر مضمون نگار آج کے افسانوں سے مطمئن اور تبدیلیوں سے مسرور نظر آتے ہیں اسی لیے ان کے مضامین میں سوالات کم ہیں اور تجزیے اس سے بھی کم۔ اطلاعات زیادہ ہیں کہ یہ سب کے سب اطلاعات کے دور میں سانس لے رہے ہیں۔ لیکن تخلیقی ادب کی تعبیر وتفسیر اور تنقید محض اطلاعات کے سہارے سرخرو نہیں ہوتی۔ حق ادا نہیں کرتی، اسے تو اس منزل مقصود تک پہنچنا پڑتا ہے، ان گہرائیوں کی جانچ پڑتال کرنی پڑتی ہے جہاں کبھی کبھی خود فنکار کی بھی رسائی نہیں ہوتی اس لیے کہ حقیقی تنقید کے پاس علم وفکر تو ہوتے ہی ہیں ذہن اور وژن بھی ہوتا ہے اسی لیے عمدہ اور بامقصد تنقید کو تخلیق در تخلیق کہا گیا ہے۔ (Criticism is creation within creation) تاہم 41 مضامین لکھوا لینا وہ بھی اس زمانے کے اردو کے ادیبوں سے ایک بڑا اور مشکل کام تو ہے ہی۔ کہ وہ اردو کا ادیب بنیادی طور پر لتھار جک ہوتا ہے اور دور اندیش بھی آغاز سے قبل ہی انجام کے بارے میں سوچنے لگتا ہے اور کچھ تو اتنے تیز و طرار ہیں کہ ہر موضوع پر مضمون تیار۔ اس کا عکس اس نمبر میں بھی جھلکتا ہے۔

بہر حال بعض قیمتی مضامین اور سستی قیمت کی وجہ سے یہ نمبر کونسل کے دوسرے نمبروں سے بھی زیادہ قیمتی اور دستاویزی ہے جسے اردو کے ہر قاری کو خریدنا اور پڑھنا چاہیے۔ میں ایک بار پھر خواجہ اکرام الدین اور عبدالحی کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

Prof. Ali Ahmad Fatmi Dept of Urdu, Allahabad University, Allhabad (UP)

تبصرہ وتعارف

گلستان کی کہانیاں

مترجم ومرتب: امیر حسن نورانی
صفحات 68، قیمت 18 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: ڈاکٹر نوشاد عالم، اردو اکادمی
برائے فروغ استعداد اردو میڈیم اساتذہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

فارسی شاعری کا ذکر آتے ہی کچھ خاص نام ذہن کے پردے پر عکس ریز ہو جاتے ہیں ان میں شیخ سعدی کا نام کئی اعتبار سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ وہ بہت بڑے عالم، بلند پایہ ادیب اور فارسی زبان کے استاد شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے بغداد کی یونیورسٹی نظامیہ میں علوم متداولہ کی تحصیل کی۔

ان کی دو کتابوں گلستاں اور بوستاں کو خصوصی شہرت حاصل ہوئی۔ اس میں بھی گلستاں کو معنی خیز پند و نصائح کی وجہ سے بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ یہ ان کا بہت بڑا ادبی کارنامہ ہے دنیا کی تقریباً تمام بڑی اور متمول زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے اردو میں بھی اس کے کئی ترجمے موجود ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب 'گلستاں کی کہانیاں' امیر حسن نورانی کی فارسی سے ترجمہ کردہ ہے۔ یہ 68 صفحات پر مشتمل ایک مختصر کتاب ہے جس میں کل 57 کہانیاں اور 58 ویں مضمون میں عمدہ نصائح شامل ہیں۔ اس میں گلستاں کے آٹھویں باب سے کارآمد نصیحتوں کا ترجمہ بھی شامل ہے۔ امیر حسن نورانی نے نثر کے ساتھ ساتھ نظم کا ترجمہ بھی باریک خط میں درج کر دیا ہے جس سے نثر اور نظم میں امتیاز ہو جاتا ہے۔

قومی کونسل نے اپنے مشن میں ایسے امور شامل کر رکھے ہیں جن سے بچوں کے علم میں اضافہ کے ساتھ ساتھ انھیں روشن اور تابناک مستقبل کی تشکیل میں مدد بھی ملتی ہے۔ یہ اردو کا واحد ایسا بڑا ادارہ ہے جہاں بڑوں کے ذوق کی تسکین کے سامان بہم پہنچانے کے ساتھ ساتھ بچوں کی تعلیم و تربیت اور ان کی شخصیت سازی کے مختلف مراحل پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ اور ماہرین سے کم لاگت پر ایسی کتابیں تیار کراتی ہے جن کو پڑھ کر بچوں میں کچھ کرنے اور ایک اچھا انسان بننے کی تحریک پیدا ہوتی ہے۔ یہ کتاب 'گلستاں کی کہانیاں' بھی اسی کا ایک ساحصہ ہے۔

حکایت اور کہانی کو انسانی شعور کی تاریخ میں ایک خاص مقام حاصل ہے کہ اس سے بزرگوں کے تجربات و مشاہدات سینہ بہ سینہ بآسانی منتقل ہو جاتے ہیں۔ شیخ سعدی نے شاید اسی لیے اس پیرائے کو منتخب کیا تھا کہ انسان کو کام کی بات ایسے لاکھ طریقے سے بتاؤ سمجھاؤ اسے کرنے پر آمادہ کرنا قدرے مشکل ہوتا ہے لیکن وہی بات اگر دلنشیں پیرائے میں ایک حکایت کے انداز میں بیان کی جائے تو یقیناً اس پر اثر کرتی ہے۔

کہنے کو یہ ایک مختصر کتاب ہے لیکن اس میں گلستاں کی بیشتر عمدہ ترین کہانیوں کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ بلکہ گلستاں کا آٹھواں باب جو کلی طور پر نصائح پر مشتمل ہے وہاں سے بھی عمدہ ترین کہانیاں لے کر اس میں شامل کی گئی ہیں۔ کہانیاں آسان اور بامحاورہ زبان میں ترجمہ کی گئی ہیں کہ ایک ہی نشست میں بآسانی ختم کی جاسکیں۔ یہ کتاب عام اردو پڑھنے والوں کے علاوہ طلبا و طالبات کے لیے تیار کی گئی ہے۔ لیکن ان میں بیش قیمت نصائح اور پند و موعظت کی معنویت کو دیکھتے ہوئے کہنا پڑتا ہے کہ یہ ہر عمر کے قاری کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔

امیر حسن نورانی قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے ایک اہم کام یعنی بزرگوں کی ذہنی کاوشوں کو بچوں کے معصوم اذہان تک منتقل کرنے کا خوشگوار اور ذمے داری سے بھرپور فریضہ انجام دیا ہے۔ اس سلسلے میں قدم قدم پر ان کی محنت کا رنگ جھلکتا ہے۔ کوئی ترجمہ کب تخلیق کی منزل میں پہنچ جاتا ہے اور کب ترجمہ نرا ترجمہ رہ جاتا ہے یہ اپنے آپ میں بہت اہم سوال ہے۔ ترجمے کا عمل ان معنوں میں بہت دشوار ہے کہ قاری تک اصل تخلیق کو اس کی پوری لطافت اور تاثر کے ساتھ پہنچایا جائے۔ دوسری چیز یہ کہ ترجمے کی سب سے بڑی خصوصیت جو عمومی طور پر تسلیم کی جاتی ہے وہ اس کی روانی اور اس کا سہل ہونا ہے اس لحاظ سے دیکھا جائے تو امیر حسن نورانی ان دونوں منزلوں سے بغیر کسی مزاحمت کے کامیابی سے نکل گئے ہیں جو اس فن میں ان کی مہارت اور مشق و مزاولت کو اجاگر کرتا ہے۔ کتاب کی قرأت کے وقت ترجمے کی دونوں خصوصیات بہت نمایاں طریقے سے سامنے آتی ہیں۔ کتاب کا گیٹ اپ عمدہ اور قیمت نہایت مناسب ہے۔

اردو املا

مصنف: رشید حسن خاں
صفحات: 706، قیمت: 172 روپے، سنہ اشاعت: 2013
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: ڈاکٹر شریف الدین، صدر شعبۂ اردو
رتن سین ڈگری کالج بانسی، سدھارتھ نگر

رشید حسن خاں کی شخصیت محتاج تعارف نہیں، خاں صاحب کو اردو میں اگر متنی تدوین، بالخصوص کلاسیکی ادب کے متون کی تدوین کا بنیاد گزار کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

خاں صاحب نے اپنے پیچھے کلاسیکی متون کی تدوین کا وہ قیمتی اثاثہ چھوڑا، جو انھیں ادبی دنیا میں زندہ و جاوید رکھے گا۔

1964 میں انھوں نے سب سے پہلے باغ و بہار کو ترقی اردو بورڈ کے لیے معیاری ادب کے سلسلے کے تحت مرتب کیا۔ 1974 میں 'اردو املا' تصنیف کر کے وہ کارنامہ انجام دیا کہ اگر اپنی باقی زندگی میں کوئی بھی تصنیفی کام نہ کرتے تب بھی دنیا میں انھیں ہمیشہ یاد رکھا جاتا۔ خاں صاحب مکتب کے تعلیم یافتہ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انھیں اردو، فارسی، عربی، نحو، صرف، قواعد، عروض و بلاغت اور لغت پر عبور حاصل تھا۔ قدیم مخطوطوں کو پڑھنا اور انھیں درست کرنا خوب جانتے تھے۔ مئی 1974 میں 'اردو املا' جیسی معرکۃ الآرا، کتاب تصنیف کر کے انھوں نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ ہر دور متقدین، متوسطین، اور متاخرین کے املا سے اچھی طرح واقف تھے۔

خاں صاحب نے ہر کلاسیکی متن کی تدوین کے دوران ان کی املا پر خاصی توجہ صرف کی، جن نسخوں کا املا اُس زمانے کے مطابق یا قریب پایا اسے متن میں درج کیا۔ بعض جگہوں پر موجودہ املا کو بھی اختیار کیا۔ تدوین کے دوران نسخۂ اوّل کے املا کی سختی سے

پابندی کی اور واضح اغلاط کی تصحیح کی۔

یہاں میں آپ کی توجہ اس بات کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ رشید حسن خاں نے 'اردو املا' کے صفحہ 304 پر لکھا ہے کہ جن لفظوں کے آخر میں ہائے مختفی لکھی جاتی ہے ان کا تعلق فارسی وعربی سے ہے۔ اردو میں ایسے لفظوں کے آخر میں الف لکھا جائے گا مثلاً ولولہ، جلوہ، بھروسہ، معمہ کو ولولا، جلوا، بھروسا اور معما لکھا جائے گا۔

'اردو املا' تدوین کے دوران خاں صاحب کو بعض ادبی حضرات سے واسطہ پڑا۔ بعض سے قدیم نسخے، بعض سے تذکرے، بعض سے رسائل ومضامین، بعض سے نسخوں کے عکس، بعض سے خطوط کے ذریعے معلومات حاصل کیں۔

دنیا کی ہر زبان کے لیے ضروری ہے کہ اس کے املا کے قاعدے منضبط ہوں اگر قاعدے معین نہ ہوں تو زبان کی یک رنگی کو سخت صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہوگا اور اردو ابھی تک اس طرح کے خطرے میں ہے۔ عربی، فارسی، انگریزی غرض ہر زبان میں جو قاعدے مقرر ہیں ہر لکھنے والا ان کی پوری پوری پابندی کرتا ہے، مگر افسوس اردو والے اپنے کو ہر قید سے آزاد سمجھتے ہیں۔

صحت املا کی طرف بہت کم حضرات نے توجہ کی۔ 1905 میں مولانا احسن مارہروی نے توجہ کی تھی اور رسالہ فصیح الملک میں اہم تجاویز کو پیش کیا تھا۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نے اپنی کتاب علمی نقوش میں تفصیل کے ساتھ مولانا مرحوم کی خدمات کا ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی واحد شخص تھے جنھوں نے اس موضوع کا مستقل موضوع کی حیثیت سے مطالعہ کیا۔ رسالۂ ہندوستانی، رسالۂ اردو، رسالۂ معیار (پٹنہ) میں ان کے اہم مضامین محفوظ ہیں۔ اس کے علاوہ مقدمۂ کلیات ولی، مقدمۂ خطوط غالب، مرتبہ منشی مہیش پرشاد، تبصرۂ مکاتیبِ غالب (مرتبہ عرشی صاحب) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، جس میں انھوں نے املا کے مسائل واغلاط کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا۔

املا دراصل لفظوں میں صحیح صحیح حرفوں کے استعمال کا نام ہے اور جو طریقہ ان حرفوں کے لکھنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے وہ 'رسم خط' کہلاتا ہے۔ املا لفظوں کی صحیح تصویر کھینچتا ہے۔

رشید حسن خاں نے 706 صفحات پر مشتمل کتاب 'اردو املا' میں یہ کوشش کی کہ املا کے مختلف النوع مسائل کا احاطہ کیا جائے۔ غلطیوں کی تصحیح کی جائے۔ اصطلاحات کو صحیح طور پر شامل کیا جائے۔ املا کی مختلف شکلوں پر توجہ دے کر املا کی معیار بندی کی جائے اور مرجح صورتوں کا تعین کیا جائے۔ اس بات کو بہ طور خاص ملحوظ رکھا گیا ہے کہ کسی قسم کی جدت طرازی کو دخل نہ دیا جائے۔

فہرست مضامین سے یقیناً بہت ساری تفصیلات کا احاطہ کیا جاسکتا ہے۔ کتاب کے آخر میں ضروری الفاظ پر مشتمل ایک فہرست بہ ترتیب حروف تہجی بھی شامل ہے اور دیگر بہت سے ضروری مسائل کو مختلف عناوین کے تحت لکھا گیا ہے۔ ایک مستقل باب املائے فارسی سے متعلق ہے۔ چنانچہ فارسی کے ہندوستانی اور کلاسیکی لہجے کی نسبت سے یائے معروف ومجہول، واو معروف ومجہول اور نونِ غنہ کے مسائل وفارسی املا کے عام قاعدوں پر بالتفصیل گفتگو کی گئی ہے۔

'تدوین اور املا' اور 'لغت اور املا' کے عنوان سے دو اجزا شامل کیے گئے ہیں۔ جگہ جگہ اشعار وفقرے بھی ملیں گے۔ کبھی کبھی انھیں اپنے آپ پر بھی شک ہونے لگتا ہے اور وہ معمولی سے لفظ کی مرجح صورت کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کرپاتے اور اپنے ہمعصروں سے پوچھتے ہیں۔

زیرتبصرہ کتاب اپنی نوعیت اور موضوع کے اعتبار سے ایک کارآمد ومفید پیشکش ہے۔ کتاب میں اردو املا کے مختلف پہلوؤں پر دلیل کے ساتھ اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ طلبا، ریسرچ اسکالر اور اساتذہ کے لیے جس بات کی اشد ضرورت ہے مصنف نے اپنی توجہ بطور خاص اُس طرف مبذول کی ہے، مثلاً اشعار کی تشریح، تلفظ اور املا، فرہنگ، لفظوں، محاوروں، ضرب الامثال، لغت، ترکیب، اعراب، علامات، اضافت، رموز و اوقاف، وغیرہ کی خصوصیات پر سیر حاصل، فصیحانہ وبلیغانہ بحث کی گئی ہے۔

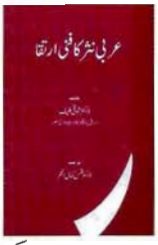

عربی نثر کا فنی ارتقا (ترجمہ)

مصنف: ڈاکٹر شوقی ضیف، ترجمہ: ڈاکٹر شمس کمال انجم
صفحات: 425، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2013
ناشر: الکتاب انٹرنیشنل، نئی دہلی
مبصر: محمد جابر زماں، 134، ستلج ہاسٹل، جے این یو نئی دہلی 67

ترجمہ کہنے کو تو محض پنج حرفی لفظ ہے، لیکن عملی طور پر یہ فن جوئے شیر لانے سے کم نہیں، اس کے باوجود علمی دنیا میں ترجمے کو تخلیق کا درجہ نہیں دیا جاتا۔ پھر بھی بین لسانی تراجم کی اہمیت وانفرادیت سے کسی کو انکار نہیں۔ ترجمہ کسی زبان اور اس کی تہذیب وثقافت سے متعارف ہونے کا بہترین ذریعہ ہے۔ ایک قوم کے علمی ذخیرہ سے دوسری قوم کو روشناس کرانے میں بھی اس کا کردار بہت اہم ہے۔

ترجمہ لسانی ومتنی حوالے سے قلب ماہیت کا عمل قرار پاتا ہے کہ اس کے ذریعے سے فکر وخیال ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل ہوکر اپنے اثر ونفوذ کا عمل مکمل کرتے ہیں۔ اس عمل میں تخلیق یا تحریر اپنی مخصوص ماحولیات اور ثقافت سے باہر نکل کر نئے معاشرتی گروہ کو دعوت فکر دیتی ہے۔ اسی طرح اس کے ذریعے سے اس کی فکری گیرائی و گہرائی کو واقعی طور پر سمجھنے اور پرکھنے کے مواقع بھی ہاتھ آتے ہیں اور اس میں آسانی بھی ہوجاتی ہے۔

یہ مشکل فن ہونے کے باعث دقت نظر اور باریک بینی کا متقاضی ہوتا ہے۔ اس میں معنی ومفہوم کو مدنظر رکھتے ہوئے خیالات وافکار اس طور پر دوسری زبان میں منتقل کرنا ہوتا ہے کہ منشائے مصنف تبدیل ہوئے بغیر اپنی کلی صورت میں قاری کے سامنے آجائے۔ اس دوران مترجم کو دونوں زبانوں کی اصطلاحات سے واسطہ پڑتا ہے۔

زیرتبصرہ کتاب 'عربی نثر کا فنی ارتقا' کا تعلق بھی ترجمے سے ہے۔ یہ عمل ڈاکٹر شمس کمال انجم نے انجام دیا ہے جو بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی، کشمیر میں شعبۂ عربی کے صدر ہیں۔ یہ کتاب عربی زبان وادب کے مشہور مورخ، محقق اور ناقد ڈاکٹر شوقی ضیف کی تصنیف 'الفن و مذاهبه فی النثر العربی' کا اردو روپ ہے۔

اس کتاب میں انھوں نے عربی نثر کے فنی اور ارتقائی سفر کی داستان رقم کی ہے۔ جو عہد جاہلی سے جدید عہد کو محیط ہے۔ کتاب کے ابواب وعناوین کی تقسیم بھی فنی مباحث کے پیش نظر کی گئی ہے اور ہر دور کے حاوی اسلوب نثر سے متعلق نمائندہ تخلیق کاروں کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ اصل کتاب عہد اموی کے بعد نثر کے ارتقا سے متعلق ہے۔ ایسا نہیں کہ اس سے پہلے کے دور کو مصنف نے نظرانداز کردیا ہے بلکہ تسلسل کی تفہیم کے لیے انھوں نے پہلے باب میں مختلف فصول کے تحت جاہلی، اسلامی اور اموی دور کی نثر کو بھی بحث کا موضوع بنایا ہے۔ جس میں عہد جاہلی کی ضرب الامثال، خطابت اور کاہنوں کے مسجع جملوں اور عہد اسلامی میں قرآن کریم، حدیث نبوی اور اسلامی خطابت کے اسلوب سے بحث کی ہے۔ عہد اموی پر بحث کرتے ہوئے عبدالحمید الکاتب کے اسلوب پر خاص توجہ دی گئی ہے؛ کہ اس نے عربی انشا کے اسلوب کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے۔ عباسی دور میں ابن مقفع، سہل بن ہارون اور جاحظ کے ادبی اسالیب کو انھوں نے اپنے

دائرۂ بحث میں مقام عطا کیا ہے۔ دوسرے باب میں تزئین و آرائش اور تصنع کے حوالے سے ابن العمید، صاحب بن عباد، ابواسحاق صابی، ابوبکر خوارزمی، بدیع ہمدانی، قابوس بن وشمگیر، ابوالعلا معری، قاسم بن علی حریری اور صفی کے فکر وفن کو موضوع بنایا گیا ہے۔ تیسرا باب اندلس اور مصر کے نثری اسالیب سے بحث کرتا ہے۔

ڈاکٹر شمس کمال انجم نے اس سے پہلے بھی شوقی ضیف کی معروف تصنیف 'الادب العربی المعاصر فی مصر' کا اردو ترجمہ 'جدید عربی ادب' کے نام سے کیا تھا جسے علمی طبقے میں سراہا گیا۔ جہاں تک اس کتاب کے ترجمے کا مسئلہ ہے اس میں بھی وہ معیار برقرار ہے۔ جس کا ثبوت سید کفیل احمد قاسمی اور حقانی القاسمی کی تحریریں ہیں جو کتاب کے شروع میں بہ طور سند منسلک ہیں۔ ان دونوں تحریروں کی موجودگی میں ترجمے کے بارے میں کچھ کہنا باعث تکرار و تکدر ہوگا۔

کسی دوسرے شخص کے افکار و خیالات کو کسی اور زبان کا جامہ پہنانے کی بہ نسبت اپنے احساس و اکتساب کو قرطاس پر منتقل کرنا بہت آسان ہے؛ اس کے باوجود ڈاکٹر شمس نے بہ ذات خود یہ مشکل اپنے سر لی ہے۔ اس اعتبار سے وہ مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے جو موضوع اٹھایا ہے واقعی اردو میں اس جانب توجہ کی ضرورت تھی اور یہ کتاب ایک حد تک اس کمی کو ضرور پورا کرے گی۔

ترجمے سے استفادہ عام طور پر ہم جیسے لوگ کرتے ہیں جو عربی زبان سے ناآشنا ہیں۔ شاید ترجمہ ایسے ہی لوگوں کے لیے کیا بھی جاتا ہے اور خود مترجم نے بھی اپنے پیش لفظ میں اس کی وضاحت کی ہے۔ ایسی صورت میں ہم 'عجمیوں' کی رعایت تو بہ ہر حال ہونی ہی چاہیے تھی۔ لیکن مترجم کو شاید اس جانب توجہ کرنے کا موقع نہیں مل سکا، جس کا اثر ترجمے میں بھی موجود ہے۔ اصطلاحات اکثر و بیشتر عربی استعمال ہوئی ہیں اور ان کی توضیح بھی نہیں کی گئی ہے۔ علمی ترجمے کا تقاضا تھا کہ ابواب و عناوین کا ترجمہ کرتے ہوئے ان کی اصل کو باقی رکھا جاتا اور نیچے ان کا ترجمہ ذکر کر دیا جاتا اور ضرورت کے مدنظر ان کی تشریح کی جاتی۔ اور کتاب میں استعمال ہونے والی تمام اصطلاحات کی تشریح و توضیح کے لیے جا بہ جا تعلیقات و حواشی رقم کیے جاتے۔ اور آخر میں اسما و اماکن کا انڈکس بھی تیار کیا جاتا۔ شاید 'وقت فرصت' مہیا نہ ہونے کے سبب ایسا ممکن نہیں ہو سکا۔ جا بہ جا کمپیوٹر کا سہو اور اس کی خامیاں بھی کتاب میں در آئی ہیں اور کتاب کی فہرست بھی نامکمل ہے۔ کتاب ابواب پر منقسم ہے تو تمام ابواب کا ذکر فہرست میں ہو جانا چاہیے تاکہ قاری یک بارگی مشمولات کتاب سے واقف ہو جائے۔

خواب وخیال

مصنف: ساحر اندوری

صفحات: 175، قیمت: 100 روپے، سنہ اشاعت: 2012

ناشر: مسلم لائبریری کھجرانا، اندور

مبصر: نظام الدین احمد، 12 تلچ ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی

اردو ادب میں افسانہ نگاری کی روایت بہت پرانی نہیں۔ اس صنف کا وجود بیسویں صدی کے ابتدائی زمانے میں مغربی ادب کے توسط سے ہوا۔ مختصر افسانہ میں اختصار اور ایجاز کی خصوصیت نے اس کے فن میں سادگی، حسن ترتیب اور توازن کی ضرورت پیدا کی۔ یہ حقیقت ہے کہ افسانہ فن کی حیثیت سے برابر آگے بڑھتا رہا ہے۔ آج مختصر افسانے کی ترقی و توسیع کسی دوسری ادبی صنف کی مرہون منت نہیں ہے۔ اس کی خصوصیات نے اسے ہماری زندگی میں مستقل حیثیت عطا کی ہے۔ یہ صنف اپنی خصوصیات کی بنا پر ہی تمام اصناف ادب میں منفرد حیثیت رکھتی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب 'خواب و خیال' ساحر اندوری کا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس میں کل 27 افسانچے اور 33 افسانے شامل ہیں۔ یہ مختصر ترین افسانے ہیں جو کم وقت میں حیرت انگیز انکشافات سے ہمیں آشنا کراتے ہیں۔ بیشتر کہانیوں کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ ان کی بنت میں بڑی فن کارانہ چابکدستی سے کام لیا گیا ہے۔ موجودہ دور میں ہندستان میں جس تہذیب کی پرورش ہو رہی ہے اسے مشترکہ تہذیب کہا جا رہا ہے۔ لیکن عملی زندگی میں انفرادی فکر، احساس اور طرز زندگی کو ترجیح دی جا رہی ہے۔ عام لوگ اپنی تہذیبی روایات سے متنفر ہوتے جا رہے ہیں۔ عمومی طور پر سماجی مذہبی اور تہذیبی احساس کم ہوتا جا رہا ہے۔ زندگی کی اقدار بدلتی جا رہی ہیں۔ انسان رنگ و نسل، ذات پات، زبان، مذہب، علاقہ اور تہذیب کے مختلف خانوں میں بٹتا جا رہا ہے۔ زندگی کے ان تمام چھوٹے بڑے مسائل کو ساحر نے بڑی خوبصورتی سے اپنے افسانوں میں سمیٹا ہے۔ ان کے افسانے اور خاص طور سے ان کی منی کہانیوں کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے جن میں زندگی اور سماج کے کئی اہم پہلوؤں کی سچائیوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سچ کے قریب پہنچتے ہوئے انھوں نے جس طرح فکر و شعور پر قابو رکھتے ہوئے اس کے بعض نمونے پیش کیے ہیں ان کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ وہ حیات و کائنات کے مسائل پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ 'خواب و خیال' میں اس کی کئی مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں مجھے یقین ہے کہ ان کی کوشش اہل نظر کو ضرور اپنی جانب متوجہ کرے گی۔

ساحر اندوری نے زندگی کے حقائق کی غیر مشروط جستجو اور شناخت پر توجہ مرکوز کی ہے۔ انھوں نے موجودہ مسائل کو فطری ڈھنگ سے محسوس کیا ہے اور نئی نسل کی ذاتی سوچ اور نجی مجبوریوں کو سیاسی اور سماجی نظام سے ہم آہنگ کر کے اسے ایک تخلیقی جہت عطا کی ہے اور عصر حاضر میں زندگی کے تیزی سے بدلتے ہوئے نظام کو سمجھنے اور اس کو فنی شعور کے ساتھ قاری تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔

'خواب و خیال' میں جو تصورات کی دنیا آباد ہے وہ ان کے اسلوب کی برجستگی کے ساتھ ان کی نگہداشت کا بھی مظہر ہے۔ ان کے کئی افسانے چونکانے والے ہیں۔ بیگم آپ، خالی کرسی، لاؤ میرے روپئے، نئی عم کی نئی نسل، رخصتی، اجڑی بستی، طلاق کا کھیل، سلگتے سکے، اپنے حصے کا درد۔ اور بھی کئی افسانے ایسے ہیں جو قابل مطالعہ ہیں۔ ان کی کہانیوں میں سادہ مزاجی کا عمل صاف طور پر قاری کو متاثر کرتا ہے۔

اردو افسانے نے ہر زمانے اور ہر دور میں اپنی الگ شناخت بنائی ہے اور اپنی پہچان نئے ناموں سے کروائی ہے۔ بیسویں صدی کے اواخر سے جو تبدیلیاں سیاسی، سماجی اور تہذیبی و ثقافتی سطح پر رونما ہوئیں، اس نے زندگی کے سانچے کو بڑی حد تک بدل دیا۔ نئے مسائل پیدا ہوئے جن کا حل نئی نسل کو ڈھونڈنا تھا۔ اس دور کا پورا کرب ساحر کے افسانوں میں ملتا ہے۔ نئے تجربات، ایجادات و انکشافات، مسائل کی بہتات، اقدار کی شکست و ریخت، سماجی شعور کو ساحر نے اپنے افسانے میں نئے انداز سے پیش کیا ہے۔

مختصر یہ کہ کہانی کار نے فنکاری کا ثبوت دیتے ہوئے معاشرے کی سچائیوں کو سامنے رکھنے کی اچھی کوشش کی ہے۔ بعض افسانے دل کو جھنجھوڑتے ہیں اور قاری کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ سماج کی تلخ حقیقتوں کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ افسانہ نگار نے کسی ایک طبقے، مخصوص معاشرے اور موضوعات تک خود کو محدود نہیں رکھا ہے بلکہ سماج کے بیشتر قابل توجہ مسائل کو موضوع بنایا ہے اور نہایت خوبی سے انھیں برتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ساحر کی نظریں سیاست، سماج اور اس عہد کے خلفشار کا مطالعہ گہرائی سے کرتی ہیں۔

ساحر اندوری نے افسانوی ادب کی تخلیق کی جانب سنجیدہ قدم اٹھایا ہے۔ان کے افسانوں کی زبان اور اسلوب عام فہم ہے۔ یہ مجموعہ اپنی گوناگوں خصوصیات کی بنا پر اہمیت کا حامل ہے۔اس اعتبار سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ ساحر اندوری اپنے فن پاروں کی تخلیق میں بہت حد تک کامیاب ہیں۔۔امید ہے کہ ادبی حلقوں میں اس کتاب کی پذیرائی ہوگی۔

دھار

مصنف: یاسین احمد

صفحات: 184، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2011

ناشر: الانصار پبلی کیشنز، ریاست نگر، حیدرآباد۔ 59

مبصر: عابد انور، ڈی 64، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی

کہانی، افسانے اور ناول معاشرے کا آئینہ ہوتے ہیں۔ کہانی اور افسانے میں سماج کے کسی نہ کسی ان چھوئے موضوع کو کہانی کا حصہ بنایا جاتا ہے اور کہانی کار کسی واقعے کو قوت متخیلہ سے کام لیتے ہوئے اس طرح پیش کرتا ہے کہ ہر قاری کو پڑھنے کے دوران اپنی کہانی یا گرد و پیش کی کہانی کا گمان ہوتا ہے۔ اگر اس طرح کی چیزیں کہانی میں نہیں ہیں تو اسے معاشرے کا عکاس قطعی نہیں کہا جاتا ہے۔ کہانی کار کی خوبی ہی یہی ہوتی ہے کہ وہ کم لفظوں میں معاشرے کے اس پہلو کو اجاگر کر دیتا ہے جو معاشرے کے لیے ناسور بنا ہوا ہے۔ جیسے عصمت چغتائی کا ناول 'چوتھی کا جوڑا' پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ یہ ہر گھر کی کہانی ہے۔ جہیز کے رسم ورواج سے چھٹکارا نہیں۔ جہیز جیسی ناسور رسم کی وجہ سے ہندوستان میں لڑکیاں غیر برادری کے لڑکوں کے ساتھ شادی کرنے پر مجبور ہیں۔ معاشرتی اور مذہبی ٹھیکیداروں کو فکر نہیں ہوتی لیکن جب ایسی لڑکیاں مایوس ہوکر کسی غیر قوم کے لڑکوں سے شادی کر لیتی ہیں تو ان لوگوں کو اپنا مذہب خطرے میں نظر آنے لگتا ہے۔ کچھ اسی طرح کی کہانی کو افسانہ نگار یاسین احمد نے اپنے افسانے کا موضوع بنایا ہے۔

یاسین احمد نے اپنے افسانے میں ملک کے، مسلمانوں کے حالات، غیرت وحمیت اور مسلم نوجوانوں کو دہشت گردی کے الزام میں جیل میں ڈالے جانے جیسے واقعات وغیرہ کو افسانے کا مرکزی کردار بنایا ہے۔ اس میں عورتوں کی نفسیات، وقت کے ساتھ بے وقعت ہوتے انسان، جذبہ انسانیت اور انسانی جدت طرازی کے خاص پہلو کا احاطہ کیا گیا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب 'دھار' میں 28 افسانے ہیں۔ دھار کتاب کا آخری افسانہ ہے۔ پہلا افسانہ 'تیس پہ چھ' ایک دھوبن کی کہانی ہے جس کا مرد کسی عورت کے ساتھ ناجائز تعلق قائم کر لیتا ہے۔ یہ عام سی کہانی لگتی ہے لیکن اس افسانے میں بیان کیے گئے جمیلہ کے مکالمے کا وہ حصہ سماج اور سماجی ٹھیکے داروں کے دلوں پر دستک دیتا ہے جس میں عورت اور مرد کے درمیان سماجی تفریق کو اجاگر کیا گیا ہے۔

دوسرا افسانہ 'نکم' ہے۔ یہ دراصل ہندوستان کے مشہور فلم ساز گھرانہ کے اردگرد اور ہیروئن کے برتے جانے والے رویے کے آس پاس گھومتا ہے جس نے ہندوستانی سینما کو کئی یادگار فلمیں دی ہیں لیکن ان کی فلموں میں کچھ مناظر ایسے ہوتے تھے جو کسی بھی مہذب معاشرے کے لیے سوہان روح تھے۔ اس نے تقریباً ہر فلم میں ہیروئن کو بے لباس یا نیم برہنہ ضرور کیا تھا۔ یہ کہانی اسی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اس کردار کو سدھیر کمار کی شکل پیش کیا گیا ہے۔ اس افسانے میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ وقت کا پہیہ ضرور گھومتا ہے۔ انسان جو کام کرتا ہے ایک نہ ایک دن اس کی اولاد کو ضرور بھگتنا پڑتا ہے۔

اسی طرح مسٹر یاسین ''کوئی گناہ نہیں کیا'' کے نام افسانے میں سماج کے ایک مسئلے کی طرف اشارہ کیا ہے جس کی اجازت آسمانی صحیفوں میں ہے لیکن سماج میں اسے معیوب تسلیم کیا جاتا ہے۔ نکاح ثانی کوئی بری چیز نہیں ہے لیکن ہندوستانی معاشرے میں روا نہیں سمجھا جاتا ہے اور لوگ دوسری شادی کرنے کے بجائے زنا کے راستے کو اختیار کرنا زیادہ سہل سمجھتے ہیں۔ شادی کا مقصد ہی عورت کو تحفظ فراہم کرنا ہے خواہ وہ عورت جوان ہو یا بوڑھی یا معذور، لیکن معاشرہ اس نظریہ سے نہیں دیکھتا وہ صرف جنسی نظریے سے دیکھتا ہے۔ اس افسانے میں ان معاشرتی صورت حال کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ ''میں نے اس بے سہارا اور معذور عورت سے نکاح کیا ہے۔ ہوس مٹانے کی خاطر نہیں، اپنی عاقبت سنوارنے کے لیے وظیفے کے کاغذات پر میں نے اس عورت کا نام لکھ دیا ہے''۔ 'جلا ہے جسم جہاں' میں انھوں نے مرد ذات کی اس جبلت کو پیش کیا ہے جس میں وہ عورت کے حسن کا دیوانہ تو ہوتا ہے لیکن اس کے ماضی کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں ہوتا اور جب بھی موقع ملتا ہے وہ اسے یاد دلانا نہیں بھولتا۔ عورت کا پیشہ جو بھی رہا ہو لیکن جب وہ کسی مرد سے شادی کرتی ہے تو وہ اپنا سب کچھ فراموش کر کے شوہر کے ساتھ آتی ہے مگر شوہر اسے اس کا ماضی یاد دلانے پر مصر رہتا ہے۔ اس افسانہ میں یہی بات کہنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ''میں تو اپنا ماضی وقت کے سینے میں دفن کر کے آئی تھی۔ اس یقین کے ساتھ کہ ان گندی اور تاریک گلیوں سے مجھ کو کوئی آواز نہیں دے گا۔ لیکن آپ کے اندر چھپے ہوئے مرد نے مجھ کو احساس دلا دیا کہ میری اوقات کیا ہے؟ میں سب کچھ بن سکتی ہوں لیکن کسی کی بیوی نہیں بن سکتی''۔

یاسین احمد کا ایک اور افسانہ 'سمتوں کا تعین' بین مذاہب شادی کے سلگتے ہوئے موضوع پر محیط ہے۔ اس افسانہ میں انھوں نے اس شادی سے ہونے والا کرب بیان کیا ہے۔ عام طور پر معاشرہ ایسی شادیوں کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتا اس لیے اس سے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ جہاں معاملات اور لین دین میں پریشانی ہوتی ہے وہیں بچوں کی شادی بیاہ کا بھی مسئلہ درپیش ہوتا ہے۔ کبھی کبھی ایسے تکلیف دہ مرحلے سے گزرنا ہوتا ہے جس کی توقع انھیں نہیں ہوتی۔ حالانکہ ہندوستان میں اس طرح کی شادیاں فروغ پا رہی ہیں اور کچھ حد تک شہری سماج اسے تسلیم بھی کرنے لگا ہے لیکن اس کے منفی اثرات کسی نہ کسی لمحے میں لازمی طور پر مرتب ہوتے ہیں۔ ''میں اپنے بزرگوں کی غلطی کی سزا بھگت رہی ہوں''۔ شبانہ پرسکون لہجے میں بولی۔ میں نہیں چاہتی کہ میرے بطن سے پھر ایک اور شبانہ جنم لے۔ دنیا کے ہر مذہب نے محبت کی تعلیم دی ہے لیکن اسی محبت نے اپنی بارگاہ میں مذہب کی بلی چڑھائی ہے ایسا سودا مجھے منظور نہیں''۔ شبانہ نے اپنا موبائل بند کر دیا اور موبائل کے سینے سے آدتیہ کا نمبر نکال دیا۔

اس کے علاوہ مسٹر یاسین کے افسانے درماں، بددعائیں، ستون، پن، مسز انجلینا فرنانڈیس، خطاکار، بجھا ہوا سورج، پاسبان، بے بسی، جواز'' بھی سماج میں پھیلی برائیوں، برتے جانے والے رویوں اور مسلم نوجوانوں کو کس طرح دہشت گرد بنا کر پیش کر دیا جاتا ہے، کے گرد گھومتے نظر آتے ہیں۔ افسانے کی زبان سیدھی سادی ہے۔ روایات سے انحراف کرتے ہوئے مصنف نے اپنی کتاب پر کسی کو کچھ لکھنے کی زحمت نہیں دی۔ کتاب میں کوئی پیش لفظ نہیں ہے، کوئی مقدمہ نہیں ہے، کوئی تقریظ نہیں۔ کتاب کی پشت پر مصنف کی دیگر تصانیف کے تحت چار کتابوں کے نام درج ہیں۔ اس کے علاوہ مصنف کے بارے میں کوئی معلومات درج نہیں ہے۔ شاید مصنف نے یہ سمجھ لیا ہوگا کہ انھیں اپنے بارے میں یا کتاب کے بارے میں کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے انھیں، ان کے

افسانے اوران کی کتاب کے بارے میں تو بچہ بچہ جانتا ہوگا اگر کوئی نہیں جانتا تو ان کا کوئی قصور نہیں بلکہ ان کے جہل کا قصور ہے۔ بدقسمتی سے میں بھی انھی جہلا میں سے ہوں۔ کتابت، طباعت اچھی ہے۔ قیمت تین سو روپے ہے شاید اردو اکادمیوں کو فروخت کے لیے رکھی گئی ہے۔

غمگسار

مصنف: وکیل نجیب
صفحات: 320، قیمت: 160 روپے، سنہ اشاعت: 2012
مبصر: ڈاکٹر محمد نوشاد عالم، شعبۂ اردو، اولڈ جی ڈی سی
موتی طبیلہ، اندور 452001 (مدھیہ پردیش)

اردو زبان وادب میں ادب اطفال کا فقدان تو نہیں مگر صورتحال اتنی تسلی بخش بھی نہیں کہی جاسکتی ہے۔ مگر آج اردو کے ادب اطفال میں تخلیق کاروں کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے۔ 1857 کے بعد محمد حسین آزاد، مولانا الطاف حسین حالی، علامہ اقبال، اسمٰعیل میرٹھی، افسر میرٹھی، ڈاکٹر ذاکر حسین، شفیع الدین نیّر اور دوسرے تخلیق کاروں نے ادب اطفال کی طرف خاص طور پر دھیان دیا اور ادھر کئی ادب اطفال کے لکھنے والوں کے نام ابھر کر سامنے آرہے ہیں جن میں وکیل نجیب کا نام سب سے اہم اور سرفہرست ہے۔ لیکن اردو زبان وادب کے لیے یہ ستم ظریفی سے کیا کم ہے کہ ادب اطفال کو معیاری اور سنجیدہ ادب انھیں سمجھا جاتا تھا اور اس کے قلم کاروں کو وہ عزت ومرتبہ نہیں دیا جاتا تھا جو دوسرے ادیب وشاعر کو ملتا تھا، مگر اب صورتحال مختلف ہے اور آج ادب اطفال میں لکھنے والوں کی تعداد بہت زیادہ تو نہیں لیکن تسلی بخش ضرور ہے۔

اردو کے ادب اطفال میں وکیل نجیب کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں، اب تک ان کے کئی کہانیوں کے مجموعے، ڈرامے اور ناول منظر عام پر آچکے ہیں اور بچوں کی دنیا میں مقبول ہوکر ادبی حلقوں سے بھی داد تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ بقول سلام بن رزاق:

''وکیل نجیب کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے قلم کو سرتاسر بچوں کے لیے وقف کردیا ہے۔''

زیر تبصرہ کتاب 'غمگسار' وکیل نجیب کا نیا ناول ہے، جسے رحمانی پبلی کیشنز سے شائع کیا ہے، اس سے پہلے بھی مصنف کی کئی تصانیف یہاں سے شائع ہو چکے ہیں۔

ناول کی کہانی روشن ضمیر اس کی والدہ، راکیش کمار جی اور دھرمیش کمار جی وغیرہ کے اردگرد گھومتی نظر آتی ہے، جو مہاراشٹر کے آکولہ، پونہ اور ممبئی جیسے اضلاع تک محدود ہے۔ روشن ضمیر اس ناول کا مرکزی کردار ہونے کے ساتھ ساتھ انسانیت کا غمگسار کی حیثیت سے بھی دکھائی دیتا ہے۔ ناول کا پلاٹ حق وباطل کی جنگ اور حسد وہمدردی پر مشتمل ہے۔ جس میں حق کی فتح ہوتی ہے اور باطل کی ہار۔ اس ناول کے ذریعے مصنف نے تاریخ اسلام اور انبیائے کرام کے کئی واقعات کو بحسن خوبی کامیابی کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی ہے، علاوہ ازیں اس ناول کی ایک اہم خوبی غیبی طاقت کا راز ہے جو ناول کے آخر میں مصنف کے ذریعے اس سے پردہ اٹھایا جاتا ہے۔

ناول میں حقیقی اور غیر حقیقی دونوں طرح کی کہانیاں ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ چلتی رہتی ہیں۔ تاریخ اسلام کے واقعات کے ساتھ ساتھ روشن ضمیر اور راکیش کمار جی اور ان کے خاندان کی فرضی کہانی چلتی رہتی ہے۔ ناول نگار اس ناول کے ذریعے اسلامی معلومات بھی طلبا وطالبات تک پہنچانا چاہتا ہے۔ کئی مقامات پر تاریخ اسلام اور انبیائے کرام کے واقعات کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ وہ ناول ہی کے پلاٹ معلوم ہوتے ہیں۔

ناول میں قدم قدم پر حیرت انگیز واقعات، غیر متوقع حالات وحادثات آتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے قاری کے اندر دلچسپی اور تجسس ناول کے آخر تک برقرار رہتا ہے۔ ناول کے زیادہ تر کردار غیر مسلم ہیں اور وہ اردو زبان بولتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس ناول کے ذریعے ناول نگار ہر جگہ اسلام کی تعلیم دیتے ہوئے بھی نظر آتا ہے۔

ناول کے دوسرے کرداروں میں راجیش کمار جی کے لڑکے کملیش وجگدیش اور لڑکی کلپنا وماں کے علاوہ ان کا بھائی دھرمیش کمار جی اور ان کی بیٹی وغیرہ مثبت کردار میں نظر آتے ہیں، جبکہ منفی کرداروں میں پرمود ٹھاکر آر ایس ایس کا کارکن، پرماتما نند اور دینیش ملہوترہ وغیرہ اہم کردار ہیں۔

اردو کے ادب اطفال میں وکیل نجیب کے خدمات اور قربانیوں کو فراموش کرنا ناممکن ہے۔ ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ ناول 'غمگسار' بچوں اور بڑوں میں ان کے دوسرے ناولوں کی طرح مقبول ومعروف ہوگا۔

اردو صحافت کا ارتقا

مصنف: معصوم مرادآبادی
صفحات: 224، قیمت: 150 روپے
ناشر: مبصر: عاقل زیاد، سمستی پور (بہار)

اردو صحافت کے لیے موجودہ عہد کافی نیک فال ہے اور آئے دن نئے انقلابات سے اردو قارئین محظوظ ہورہے ہیں۔ آزادی سے قبل اور 1857 کے غدر سے پہلے اردو صحافت میں جو تجربے ہوئے دیگر زبانوں کے لئے بھی مشعل راہ تھے۔ اس سے انکار نہیں کہ تب متحدہ ہندوستان میں اردو صحافت ہی کا بول بالا تھا اور کم سے کم وسائل کے رہتے اس وقت کی صحافت نے جس نظریے کی بنیاد رکھی اس کی وجہ سے اہل اردو آج بھی فخر محسوس کررہے ہیں۔ آزادی کے بعد اردو صحافت کا زور کم ہونے لگا اور اس کی وجہ بھی موجودہ قارئین کی سمجھ سے باہر نہیں ہے، تاہم یہ کہنا کسی طور بیجا نہیں ہوگا کہ تقسیم ملک کے بعد نہ صرف اردو صحافت کو بلکہ اردو زبان کو بھی ایک بڑا نقصان ہوا۔ آج ایک بار پھر اردو زبان نے نئے بال وپر نکالے جس کی وجہ سے زبان کی سطح پر بھی اور اردو صحافتی نظریات میں نکھار آیا۔ کوئی ایک دہائی پہلے تک جو کہا جاتا تھا کہ اردو صحافت کا کوئی اپنا نظریہ نہیں ہے غلط ثابت ہونے لگا اور نت نئے تجربات کی بنا پر حالیہ دہائی میں اردو صحافت میں بڑی خوش آئند تبدیلیاں آئیں۔

معصوم مرادآبادی کی تازہ تصنیف 'اردو صحافت کا ارتقا' چار ابواب پر مشتمل ہے۔ لیکن اس سے پہلے باب میں تاریخی ارتقا پر مدلل روشنی ڈالی گئی ہے۔ فنی ارتقا اور تکنیکی ارتقا کے تحت بھی انہوں نے کافی جان فشانی سے کام کیا ہے جو تحقیق کے طلبا کے لیے بہت ہی کارآمد ہے۔ آخری باب 'چند نامور صحافی' کے تحت مصنف نے اپنے ہم عصر صحافیوں اور کچھ سینئرس کے حالات وکوائف، نیز ان کی طرز تحریر پر روشنی ڈالی ہے۔ اس طرح معصوم مرادآبادی نے خود اپنے تجربوں کی روشنی میں صحافت کے طالب علموں کی بڑی حد تک رہنمائی کی ہے اور اس آنے والی نسل بھی ان کے تجربوں سے فیضیاب ہوسکتی ہے۔ اس کے علاوہ کتاب میں کہیں کہیں پروف یا کمپوزنگ کی غلطی ہے جس کی وجہ سے تھوڑی الجھن محسوس ہوتی ہے۔ صفحہ 153 پر ''قابل ذکر بات یہ ہے کہ 1994 میں وزیر اعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ کے ایما پر جسٹس راجندر سچر کی قیادت میں.....'' میرا خیال ہے یہاں تاریخ پر صحیح طریقہ سے توجہ نہیں دی گئی اور اسے 2004 ہونا چاہئے۔ ایک اور بات عرض کرنا

چاہوں گا، جیسا کہ مصنف نے اپنی کتاب میں صفحہ 154 پر 'پریس کونسل کی سب کمیٹی کی رپورٹ' کے تحت پوائنٹ 8-7-6 میں اردو اخباروں کے لئے سرکاری اشتہارات اور جس ڈی اے وی پی کا ذکر انہوں نے کیا ہے قابل مطالعہ تو ہے، مگر اس سے زیادہ قابل تجزیہ بھی ہے۔ دراصل یہی وہ نکات ہیں جس کی وجہ سے اردو اخبارات سے زیادہ اخبار مالکان نے ترقی کی ہے یا وہ تنزلی کے شکار ہوئے۔ مصنف اس نکتہ سے خوب واقف ہیں کہ صرف ڈی اے وی پی کی فراہمی کے لیے کتنے ہی اردو اخبارات آر این آئی میں رجسٹرڈ ہیں۔ یہ صورتحال کسی ایک ریاست یا ایک شہر کی نہیں بلکہ حالیہ دنوں میں ہندوستان کے تقریباً ہر چھوٹے بڑے شہروں میں کئی اخبارات رجسٹرڈ ہیں اور سرکاری مراعات پانے کی ہوسنا کی کے سبب اردو صحافت کی جڑ کھودنے کا کام کر رہے ہیں۔ وہ لاکھ کوششوں کے بعد بھی حکومت کے تابع ہیں اور ان کے خلاف ایک قدم بھی اٹھانا گوارہ نہیں کرتے۔ بیشتر نے اخبار کو سچ کے اظہار کے لیے نہیں بلکہ اپنی روزی کا ذریعہ بنا لیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ آج کوئی اللہ کا بندہ اگر سپریم کورٹ میں یہ رٹ داخل کرے کہ اشتہارات کی وجہ سے آج ہندوستان میں ہزاروں اردو اخبارات صرف سرکاری دفاتر میں ہی دیکھے جاتے ہیں، مارکیٹ میں ان کا دور تک کہیں نام ونشان نہیں ہے۔ اس کے علاوہ مجموعی طور پر کتاب یقیناً ایک دستاویز کی طرح ہے جس سے حوالہ جاتی مطالعہ میں مدد ملتی ہے۔ اس کتاب کی اشاعت میں اردو اکادمی دہلی کا مالی تعاون شامل ہے۔

ترقی پسند اردو غزل کا آغاز و ارتقا

مصنف: ڈاکٹر محمد صادق

صفحات: 272، قیمت: -/300 روپے، سنہ اشاعت: 2012

زیر اہتمام: کتابی دنیا، دہلی

مبصر: روبی نکہت، 236، شپرا ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی

زیر نظر کتاب 'ترقی پسند اردو غزل کا آغاز وارتقا' کے مصنف ڈاکٹر محمد صادق مدھیہ پردیش سے تعلق رکھتے ہیں جہاں وہ درس وتدریس کے پیشے سے وابستہ ہیں۔ یہ ان کی پہلی باضابطہ تصنیف ہے۔ جسے انھوں نے پی ایچ.ڈی کے مقالے کے طور پر تحریر کیا ہے جیسا کہ ان کے نگراں اور استاد ڈاکٹر فداء المصطفیٰ فدوی کے دو ورقی مقدمہ سے واضح ہے۔ زیر تبصرہ کتاب پانچ ابواب میں تقسیم کی گئی ہے: جس کا پہلا باب 'اردو غزل کی فنی روایت اور ترقی پسند تحریک' ہے۔ جس میں غزل کے ہیئتی مباحث پر روشنی ڈالنے کے ساتھ کلاسیکی غزل کے تناظر میں ترقی پسند غزل کی معنویت پر گفتگو کی گئی ہے۔ دوسرا باب 'ترقی پسند اردو غزل کی تشکیل' ہے اس باب میں ترقی پسند فکر کے سرچشموں پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور کلاسیکی اور ترقی پسند غزل کے خصائص متعین کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کا تیسرا باب 'ترقی پسند غزل کا ارتقا 1935 سے 1947 تک' ہے۔ جس میں 1947 تک کی ترقی پسند غزل پر تبدیل ہوتے رجحانات کی روشنی میں گفتگو کی گئی ہے۔ چوتھے باب 'ترقی پسند غزل کا ارتقا 1947 سے 1960 تک' میں غزل کو رد کرنے کے رجحان پر بحث کی گئی ہے۔ پانچواں باب 'ترقی پسند غزل کا ارتقا 1960 سے 2000' ہے اس باب میں جدیدیت اور ترقی پسند فکر کی کشمکش اور دونوں کے انفرادی رجحان کی وضاحت کی گئی ہے۔ اور ترقی پسند تحریک کے موضوعات کے تناظر میں اس دور کے شعرا کے فکر وفن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ آخر میں 'ماحصل' کے عنوان سے مصنف نے نتائج بحث کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ اور ترقی پسند غزل کی عہد بہ عہد ترقی اور اس کی سمت و رفتار پر بھی مختصر روشنی ڈالی ہے۔

ترقی پسند تحریک نے اردو ادب پر دیرپا اثرات چھوڑے ہیں۔ اس سبب سے ناقدین ادب نے بھی اس جانب کچھ زیادہ توجہ دی ہے۔ اس سے پہلے بھی اس موضوع پر سراج اجملی کی کتاب 'ترقی پسند تحریک اور اردو غزل' اور یعقوب یاور کی تصنیف 'ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری' کے علاوہ ممتاز الحق کی کتاب 'اردو غزل کی روایت اور ترقی پسند غزل' وغیرہ شائع ہو چکی ہیں۔ یہ سبھی تصانیف بھی پہلے پی ایچ.ڈی کے مقالے کے طور پر ہی تحریر کی گئی ہیں اور ڈگری ملنے کے بعد شائع ہوئی ہیں۔ ان کے علاوہ بھی ایسی تصانیف ہیں جو آزادنہ تنقید کے طور پر لکھی گئی ہیں۔ ایسے عام موضوع پر ڈاکٹر صادق کی تصنیف کئی سوالات کھڑے کرتی ہے۔ اول یہ کہ اتنے سارے مصنفین نے غالباً ترقی پسند شاعری/غزل کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔ یا ڈاکٹر صادق نے اپنے سے قبل کے ناقدین کی آرا سے اختلاف کرتے ہوئے ان سے جداگانہ نقطۂ نظر پیش کیا ہو جو ترقی پسند شعریات کی تشکیل میں معاون ہو۔ کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے میں نے ان سارے سوالوں کا جواب تلاش کرنے کی بہتیری کوشش کی اور اس تصنیف کا جواز تلاش کیا۔ لیکن افسوس کے سوا کچھ اور ہاتھ نہ لگا۔ پوری کتاب کے مطالعہ کے بعد بھی ایسا کوئی نکتہ اور مسئلہ میری کم بیں نگاہ میں نہ آسکا جسے واقعی معنوں میں جواز پر محمول کیا جا سکے۔ ہاں دوران مطالعہ جو چند باتیں ہاتھ آئیں ان کا ماحصل یہ ہے۔ زیر تبصرہ تصنیف کا طریقۂ نقد یہ ہے کہ ترقی پسند فن پاروں اور فن کاروں پر براہ راست روشنی ڈالنے کے بجائے مصنف نے ترقی پسند متن کے فکری اور فنی نکات سے متعلق پیش کی جانے والی رایوں کی تشریح وتوضیح کی روش اختیار کی ہے اور اقتباسات کے ذریعہ اپنے نتائج کو مزین کیا ہے۔ اس طرح ان کا طریقۂ تحریر Documentary Research Method کو اعتبار عطا کرتا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے فکری انفراد کی توضیح وتشریح میں بھی ان کا یہ رویہ واضح ہے۔ اس طرح فکری پس منظر والے حصے میں ترقی پسند تحریک کی پوری تاریخ (مع اجلاس ومیٹنگ) سمیٹنے کی سعی مسعود بہر حال ملتی ہے۔ اسی طرح موضوع کی وضاحت میں جیسے جیسے وہ آگے بڑھے ہیں تو انھی کا بیان کردہ فکری پس منظر ان کی نظروں سے اوجھل ہوتا گیا ہے۔ انھوں نے باقر مہدی، مظہر امام اور خلیل الرحمٰن اعظمی جیسے شاعروں کو بھی ترقی پسند شاعری کا حصہ قرار دے دیا ہے۔ اور اس کے جواز پر کوئی بحث نہیں کی ہے۔ مجموعی طور پر یہ ان کی ایک کوشش ہے جس پر محترم مصنف لائق مبارک باد ہیں۔

کہانی کا درد

مصنف: ساحر کلیم

ضخامت: 104 صفحات، قیمت: 100 روپے، سنہ اشاعت: 2012

ناشر: نوائے دکن پبلی کیشنز، رشید پورہ، اورنگ آباد، مہاراشٹر

مبصر: ڈاکٹر ہمایوں اشرف

شعبۂ اردو، نو با بھاوے یونیورسٹی، ہزاری باغ

'کہانی کا درد' ساحر کلیم کی منی کہانیوں اور افسانچوں کا ایک دلچسپ اور فکر انگیز مجموعہ ہے۔ اس سے قبل ان کی تین کتابیں 'موم کی گڑیا' (افسانچے اور منی کہانیاں) 2000، 'ٹوٹا ہوا شیشہ' (افسانے) 2010 اور 'سونے کی اینٹ' (بچوں کی کہانیاں) 2011 اشاعت پذیر ہو کر ارباب ذوق سے داد وتحسین حاصل کر چکی ہیں۔

ساحر کلیم سرزمین دکن کے ایک ابھرتے ہوئے فنکار ہیں جو افسانہ نگاری، شاعری، تنقید کے علاوہ بچوں کے ادب سے بھی گہرا شغف رکھتے ہیں۔ زیر نظر کتاب کی ابتدا میں عارف خورشید کا ایک تعارفی مضمون شامل ہے جس میں انھوں نے ساحر کلیم کی کہانیوں کو

سوندھی مٹی کی مہک سے تعبیر کیا ہے۔ موصوف کے الفاظ ہیں:

''ان کے موضوعات زمین سے جڑے ہوئے ہیں۔ جس پر تخیلات کی گھنگھور گھٹا اور مشاہدات کی رم جھم برسات سے افسانے کی سوندھی مٹی مہک اٹھتی ہے''۔ (ص 2)

اردو میں افسانچہ اور منی کہانی ایک علیحدہ صنف کی حیثیت سے مقبول ہو چکی ہیں اور ان کے جواز، تعریف، اوصاف اور فنی لوازم پر باضابطہ مضامین اور کتابیں بھی لکھی گئی ہیں لیکن انہیں سنجیدگی سے اپنانے والوں کا آج بھی فقدان ہے۔ اکثر و بیشتر افسانہ نگار تجربے کے نام پر قول، لطیفہ، پہیلی، نثری نظم، فکر پارہ اور بے معنی چند جملے لکھتے رہے ہیں۔ سعادت حسن منٹو، جوگندر پال اور رتن سنگھ نے جو روایت قائم کی، اس کا شائبہ کم ہی نظر آتا ہے۔

افسانچہ یا منی کہانی افسانوی نثر کی ایسی قسم ہے جس میں ایجاز و اختصار بنیادی شرط ہے۔ یہ دراصل کوزے میں سمندر بھرنے کے مترادف ہے۔ ان کی معنوی اور اشاریتی بلاغت اپنے اندر ایک جہان معنی پوشیدہ رکھتی ہے۔ ساحر کلیم افسانہ اور منی کہانی کے اسرار و رموز سے آشنا ہیں۔ وہ ان کے لئے مواد اپنے آس پاس بکھری ہوئی زندگی سے اخذ کرتے ہیں اور انھیں بہت گھما پھرا کر پیش نہیں کرتے بلکہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معنوی جہت پیدا کر دیتے ہیں۔ ساحر دونوں صنف میں جو واضح فرق ہے، اس سے بھی کما حقہ واقف ہیں۔ بقول عارف خورشید:

''وہ جانتے ہیں کہ افسانچہ کہیں سے بھی شروع ہو کر کہیں بھی ختم ہو جاتا ہے اور قاری کو سوچ و فکر کی دعوت دے جاتا ہے اور منی کہانی میں کہانی پن ہوتا ہے اور وہ ایک مکمل واقعہ کو ترتیب وار اپنی گرفت میں لیتی ہے۔ قاری کو سوچنے کے لیے کچھ نہیں چھوڑتی''۔ (ص:4)

'کہانی کا درد' میں 96 افسانچے اور منی کہانیاں شامل ہیں جو نثری نظم کی ہیئت میں لکھی گئی ہیں۔

ساحر کلیم کی منی کہانیاں اور افسانچے اپنے اختصار کے باوجود نثری ارتکاز و قطعیت کے حامل ہیں جن میں کہانی اور بیانیہ کا عمل قائم و دائم ہے۔ صوری اور معنوی اعتبار سے یہ کتاب قابل لحاظ ہے۔ سرورق بھی دلکش اور جاذب نظر ہے۔ افسانوی ادب کے شائقین اس کا مطالعہ ضرور کریں۔

تین ناول

مصنف: رحمٰن عباس

صفحات: 527، قیمت: 500 روپے، سنہ اشاعت: 2013

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

مبصر: خان احمد فاروق، صدر شعبۂ اردو، حلیم مسلم پی جی کالج، کانپور

اردو فکشن میں جن لوگوں کو بہت جلدی بغیر کسی سہارے کے قارئین کی توجہ حاصل ہوگئی ان میں رحمٰن عباس کا نام بلا تامل شامل کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے اپنی پہلی تحریر سے موضوعات اور اسلوب دونوں سطح پر اردو کے ڈھلے ڈھلائے رویوں سے الگ راستہ نکالنے کی کوشش کی اور اس کو ان کی عالمی ادبیات سے واقفیت پر محمول کیا جاسکتا ہے اور یہ واقفیت ان کے تینوں ناولوں میں نظر آتی ہے۔ مگر اس سلسلہ میں دوسروں کے بارے میں میں کیا کہہ سکتا ہوں مجھے اس وقت گراں گزرتی ہے جب یہ واقفیت مضمون نگاری کی شکل اختیار کرنے لگتی ہے۔ اس جملۂ معترضہ سے قطع نظر ان ناولوں میں رحمٰن عباس نے جو موضوعات اور مسائل اٹھائے ہیں وہ واقعی اہم ہیں کیونکہ ابھی تک ہمارے یہاں اس طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ یہ مسائل اس لیے بھی اہم ہیں کہ عام طور سے اردو فکشن نے اپنے موضوعات کو عدم تحفظ، مساوات اور مسلم مسائل تک ہی محدود رکھا ہے اور خاص طور سے مسلم کہانی کاروں میں منٹو اور غلام عباس کے علاوہ نئے کہانی کاروں کی اکا دکا کہانیوں کو چھوڑ معلوم ہوتا ہے کہ اردو کہانی صرف مسلم قاری کے لیے ہی لکھی جارہی ہیں۔ ان کی پہلی طویل کہانی (جس کو وہ ناول کہتے ہیں) 'نخلستان کی تلاش' ایک نہایت پراثر اور گہرے عشق (رومانی نہیں) کا بیانیہ ہے جو سرسری نظر میں 'جمال' اور 'فریدہ' کے عشق کی داستان معلوم ہوتی ہے مگر... ''سمٹے تو دل عاشق پھیلے تو زمانہ ہے'' کی طرح فسطائی نظام کے خلاف ایک آواز ہے جو ''اپنے عزیزوں (انسانوں) کی زندگی کو مستقبل کے Holocaust (اصل متن میں املا غلط) بچانا' چاہتا ہے۔ مگر بچانے والا ہی (جمال) اچانک غائب ہو جاتا ہے۔ ''(ان نوجوانوں کی طرح) جو وطن عزیز میں سیاسی فسطائیت کے خلاف گفتگو کا خواب دیکھتے ہیں۔'' مجھے یہ معلوم کر کے بڑی حیرت ہوئی کہ اس ناول پر فحاشی کا مقدمہ قائم ہوا جو ہنوز جاری ہے اور مصنف اس سلسلہ میں قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کر چکا ہے۔ اس ناول میں فحش کیا ہے یہ مجھے بہت غور سے پڑھنے کے باوجود بھی معلوم نہیں ہوا۔ لیکن اگر مقدمہ قائم کرنے والوں کے نزدیک فسطائی نظام کے خلاف آواز اٹھانا فحش بات ہے تو یہ ناول واقعی فحش ہے اور میں ان پر ہنس سکتا ہوں۔ 'ایک ممنوعہ محبت کی کہانی' جو واقعی بہت اچھا اور پر اثر ناول ہے اور بہت ہی فکر انگیز اور سنجیدہ مسائل کو سامنے لاتا ہے جہاں ابھی ہماری نظر نہیں ہے۔ حالانکہ اس 'جماعت' کے تعلق سے سلام بن رزاق کا ایک افسانہ خاصہ موضوع بحث رہ چکا ہے۔ مگر زبان، ثقافت اور حب وطنی کے تعلق سے رحمٰن عباس نے اس ناول کو سورل، کویت اور لبنان تک جس طرح سمیٹ لیا ہے وہ ان کی گہری تخلیقی سرشت کا پتہ دیتا ہے۔ اسی ناول میں صفحہ 264 پر مصنف 1984 میں سکھوں کے قتل عام کا ذکر کرتا ہے لیکن 93-1992 اور 2002 میں مسلمانوں کے قتل عام کا ذکر بھول جاتا ہے۔ اس ناول کو اردو کا آنچلک ناول بھی کہا گیا جس کو میں مناسب نہیں سمجھتا کیونکہ اس میں جو مسائل اٹھائے گئے ہیں وہ کوکن یا سورل تک محدود نہیں ہیں مثلاً دیوبندی، بریلوی، شیعوں کی آپسی نفرتیں بیشتر مسلم ممالک تک پھیل چکی ہیں۔ ہاں یہ بات ضرور کہی جاسکتی ہے کہ کوکنی اور مراٹھی الفاظ کی بھرمار ناول کی قرأت میں لطف کے ساتھ رخنہ بھی بنتی ہے۔ ناول لفظیات سے نہیں مسائل سے آنچلک بنتے ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ ہم ابھی ان سے قطعی نا واقف ہی نہیں بلکہ نا بلد ہیں۔ دوسرے مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصنف شعوری طور پر لہجہ کو مقامی اور گھر در بنانے کے لیے اس زبان کا استعمال کرتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی جب وہ عشق اور معاملات عشق کا بیان کرتا ہے تو ان کے قلم میں ایک روانی آجاتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایسے لمحات میں دل کی دھڑکن خون کی رفتار سوا کر دیتی ہے اور یہ انداز ان کے مطالعے اور تجربے دونوں کا غماز ہے۔ لیکن یہ اسلوب ان کے پہلے ہی دو ناولوں میں ملتا ہے۔ تیسرے ناول 'خدا کے سائے میں آنکھ مچولی' میں الگ ہو جاتا ہے۔ لیکن موضوعاتی اعتبار سے یہ تینوں ناول ایک خاص ربط رکھتے ہیں۔ اگر 'تین ناول' کو بھی ان کے ناولوں کی اشاعت کے مطابق ہی شائع کیا جاتا نئے پڑھنے والے بھی آسانی سے اس میں ممکن ہے یہ ربط تلاش کر لیتے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ابتدا میں ہی اگر کسی تخلیق کار کی کوئی اہم تخلیق سامنے آجاتی ہے تو وہ بہت دنوں تک غیر شعوری طور پر اس کے ذہن میں جگہ بنائے رہتی ہے اور قاری بھی اس سے اسی معیار کی توقع کرتا ہے۔ 'ایک ممنوعہ محبت کی کہانی' رحمٰن عباس کے آگے پیچھے کے دونوں ناولوں سے بہتر اور دیر تک یاد رکھا جانے والا ناول ہے اور اردو کے فکشن نگاروں کو 'اپنے سوا' بھی دیکھنے کی جانب متوجہ کرتا ہے اور مزید یہ کہ رحمٰن عباس کا معیار بھی متعین کرتا ہے۔

چوتھا فنکار

مصنف: شبیر احمد

صفحات: 192، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2013

مبصر: ذاکر فیضی

روم نمبر E-7، برہمپتر اہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی

زیر نظر افسانوی مجموعہ 'چوتھا فنکار' نوجوان فنکار شبیر احمد کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ جس میں کل پندرہ کہانیاں شامل ہیں۔ یہ تمام ہی افسانے اردو کے معیاری رسائل میں شائع ہوکر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ کہانی 'چوتھا فنکار' اُن کا شاہکار افسانہ ہے، جس میں انھوں نے داستانوی انداز اختیار کرتے ہوئے بہت خوبصورت پیرائے میں اپنی بات کو کہا ہے اور خوب کامیابی کے ساتھ کہا ہے۔ شبیر احمد نے بہت کم وقت میں اردو افسانہ نگاروں میں اپنی منفرد شناخت قائم کی ہے۔ جس کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

ہر فنکار کے اپنے احساسات اور تجربات ہوتے ہیں۔ چوتھا فنکار کے فنکار شبیر احمد نے بھی اپنے احساسات کو اَوزار بنا کر بہترین افسانے 'تراشے' ہیں۔ شبیر احمد کے افسانے اس اعتبار سے بھی کامیاب اور قابل مطالعہ ہیں کہ وہ قاری کو بوجھل پن کا احساس نہیں ہونے دیتے۔ ان کے افسانے پڑھتے ہوئے قاری کو اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی بلکہ تجسّس کا ایک سلسلہ رہتا ہے جو اختتام پر رکتا ہے یا تجسّس کو ایک نیا موڑ دے دیتا ہے۔

کہانی 'کہر آلود ندی' میں شبیر احمد نے بزرگ لوگوں کی جو نفسیات پیش کی ہے وہ یقیناً قابل ستائش ہے۔ یہ کہانی پڑھتے ہوئے زندگی کے لیے بزرگوں کے احساسات اور ان کے تجربات کا ہمیں علم ہوتا ہے۔ اس کہانی میں بزرگوں کی زندگی، ان کے رکھ رکھاؤ، بول چال اور عادات واطوار کا انہوں نے شاندار نقشہ کھینچا ہے شبیر احمد نے دکھانے کی کوشش کی ہے کہ انسان زندگی کے آخری پڑاؤ پر کتنا لاچار اور بے بس ومجبور ہو جاتا ہے اور فطرت کے ہاتھوں کیسی کیسی تکلیفیں جھیلتا ہے۔

بہت کم تعداد میں افسانے تخلیق کرنے کے باوجود شبیر احمد کامیاب افسانہ نگاروں کی فہرست میں اپنا نام درج کرا چکے ہیں، اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنے بیشتر افسانوں کو بنگال کے پس منظر میں تحریر کیا ہے۔ جن سے اردو قارئین کو مانوسیت نہیں تھی۔ اور دوسری اہم وجہ یہ ہے کہ وہ افسانہ تخلیق کرتے ہوئے بہت ہوشیاری اور فنکارانہ چابک دستی سے کام لیتے ہیں۔

شبیر احمد کے تجربات ہی ان سے افسانے لکھواتے ہیں۔ ان کی خوبی یہ بھی ہے کہ وہ مقامی زبان اور لہجہ کا استعمال اتنی خوبصورتی کے ساتھ کرتے ہیں کہ گراں نہیں گزرتا۔ انہوں نے اپنا افسانوی اسلوب خود وضع کیا ہے۔ شبیر احمد اپنی بات کہنے کا فن بخوبی جانتے ہیں۔ ان کی کہانیاں احساس کی کہانیاں ہیں جن میں ختم ہوتی تہذیب وثقافت کو خوبصورت ڈھنگ سے پیش کیا گیا ہے۔ کہانی 'کنگن' میں انھوں نے 'کنگن' کے سہارے نئی تہذیب، نئے معاشرے کا ایسا دلکش منظر پیش کیا ہے جو بہت کم کہانی کاروں کو نصیب ہوتا ہے۔ کہانی کے اختتام پر مرکزی کردار کی جو نفسیات شبیر احمد نے قاری کے سامنے پیش کی ہے وہ بہت شاندار ہے۔ شبیر احمد اپنی کہانیوں میں شائستہ رواں اور شگفتہ زبان استعمال کرتے ہیں۔ ان کی کہانیوں کا فریم اس طرح تیار ہوتا ہے کہ معمولی بات بھی نرالی اور دلچسپی سے بھرپور ہوتی ہے کہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو معنی کے نئے نئے لباس پہناتے نظر آتے ہیں۔

امید ہے کہ شبیر احمد کا یہ تخلیقی قلم پوری رفتار اور روانی کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھے گا اور اپنے نئے رنگ اردو کے افسانوی حلقے میں بکھیرتا رہے گا اور قارئین کی داد حاصل کرتا رہے گا۔

پانی سے مانجھی تک: تنقید کے آئینے میں

مصنفہ: شگفتہ یاسمین

ضخامت: 144 صفحات، قیمت 200 روپے

سنہ اشاعت: 2013

ملنے کا پتہ: براؤن بک پبلی کیشنز، نئی دہلی

مبصر: نوشاد منظر

ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ

زیر نظر کتاب 'پانی سے مانجھی تک: تنقید کے آئینے میں' شگفتہ یاسمین کی تنقیدی کتاب ہے۔ اس کتاب میں شگفتہ یاسمین نے غضنفر کے آٹھ ناولوں 'پانی'، 'کینچلی'، 'دویہ بانی'، 'فسوں'، 'وش منتھن'، 'مم'، 'شوراب' کے علاوہ 'مانجھی' کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ ان تجزیات کے علاوہ پیش لفظ، غضنفر کی ناول نگاری کا مجموعی تاثر' اور 'غضنفر سے ایک ملاقات' (انٹرویو) بھی اس کتاب کا حصہ ہیں۔

کتاب کا پہلا مضمون 'غضنفر کی ناول نگاری کا مجموعی تاثر' ہے۔ اس مضمون میں مصنفہ نے غضنفر کے ناولوں کا ارتقائی منازل کی روشنی میں جائزہ لیتے ہوئے غضنفر کی انفرادیت بتانے کی کوشش کی ہے۔

شگفتہ یاسمین نے غضنفر کے ناولوں کا تجزیہ اس کی سن اشاعت کے لحاظ سے کیا ہے۔ اس طرح کتاب کے دوسرے حصے میں ناول 'پانی' کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ ناول 'پانی' کی اشاعت 1989 میں عمل میں آئی۔ یہ وہی زمانہ ہے جب پیغام آفاقی کا ناول 'مکان' اور عبدالصمد کا مشہور ناول 'دوگز زمین' شائع ہوئے تھے۔ بقول شگفتہ یاسمین غضنفر کا ناول 'پانی' اپنے موضوع اور زبان کے لحاظ سے معاصر ناولوں میں ممتاز ہے۔ شگفتہ یاسمین لکھتی ہیں کہ ناول کا مرکزی خیال واضح نہیں ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ناول میں مرکزی خیال کی وضاحت کس حد تک ضروری ہے؟ اور جس ناول کا مرکزی خیال مبہم ہو اسے بڑا ناول کہنا کہاں تک صحیح ہوگا؟

مذکورہ کتاب کا دسرا باب 'کینچلی: زندگی کا روپ بہروپ' ہے۔ شگفتہ یاسمین نے کتاب کے اس حصے میں غضنفر کے ناول 'کینچلی' کا جائزہ پیش کیا ہے۔ ناول 'کینچلی' 1993 میں منظر عام پر آیا۔ شگفتہ یاسمین نے ناول کے تین اہم کردار 'دانش'، 'مینا' اور 'سجن' کے نفسیات کا جائزہ بڑی خوبی کے ساتھ کیا ہے۔ ناول 'کینچلی' کے اس تجزیے کی خوبی یہ ہے کہ وہ قاری کو ناول پڑھنے کے لیے مجبور کرتا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب کا ایک مضمون 'جبینِ وقت پہ جبر انسانی: دویہ بانی' بھی ہے۔ یہ غضنفر کے تیسرے ناول 'دویہ بانی' کا تجزیہ ہے۔ ناول 'دویہ بانی' میں سماج کے اس پسماندہ طبقہ (شیڈول کاسٹ) کو موضوع بنایا گیا ہے جس کا استحصال سماج میں برسوں سے ہوتا رہا ہے۔ غضنفر کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے خوش اسلوبی کے ساتھ سماج کے اس طبقے کی کہانی یوں پیش کی ہے کہ جبر واستحصال کی کہانی ہونے کے باوجود طرف داری معلوم نہیں ہوتی۔ شگفتہ یاسمین نے نہایت ایمانداری کے ساتھ ناول 'دویہ بانی' کا تجزیہ کیا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب 'پانی سے مانجھی تک: تنقید کے آئینے میں' شگفتہ یاسمین کی ایک اچھی کتاب ہے۔ کسی تخلیق کار کی زندگی میں ان کی تصانیف کا جائزہ لینا یا اس پر تنقید کرنے کی ہمت کرنا اپنے آپ میں اہم ہے۔ شگفتہ یاسمین کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے غضنفر کے ناولوں پر تنقید کرتے وقت بڑی حد تک ایمانداری کا ثبوت پیش کیا ہے، انھوں نے جہاں غضنفر کے ناولوں کی خوبیوں کا ذکر کیا ہے وہیں غضنفر کے ناولوں کی خامیوں کو بھی پیش کر دیا ہے۔ امید کی جاسکتی ہے کہ شگفتہ یاسمین کی یہ کتاب علمی حلقے میں پسند کی جائے گی۔

عالمی اردو نامہ

پاکستان

لاہور کی عالمی ادبی وثقافتی کانفرنس

پاکستان کے ثقافتی مرکز لاہور میں 23 تا 25 نومبر 2013 کو چوتھی الحمرا عالمی ادبی وثقافتی کانفرنس کا انعقاد کیا گیا۔ اس سہ روزہ کانفرنس میں عالمی اردو بستی سے پاکستان کے علاوہ امریکہ، برطانیہ، جرمنی، ایران، مصر، ہندوستان اور بنگلہ دیش کے مندوبین نے شرکت کی۔ اس کانفرنس کے روح رواں ممتاز مزاح نگار اور شاعر جناب عطاء الحق قاسمی تھے۔ پاکستان کے وزیراعظم نواز شریف نے کانفرنس

کا افتتاح کرتے ہوئے ہندوستان کے ساتھ پائیدار دوستی کے عزم کا اظہار کیا تو کانفرنس کے آخری اجلاس میں 'امن کی آشا اور ہمارا میڈیا' کے زیرعنوان مذاکرے میں تمام سینئر پاکستانی صحافیوں نے اس بات پر زور دیا کہ ہندو پاک کے عوام کو پُرامن بقائے باہم کے اصول پر کاربند ہوکر اپنے بنیادی مسائل کی طرف توجہ کرنی ہیں۔ غریبی، بھوک، کرپشن اور دہشت گردی کے خلاف متحد ہوکر جہاد کرنا ہے۔

کانفرنس کی افتتاحی تقریب میں وزیراعظم نواز شریف کے ساتھ جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال تشریف فرما تھے، جنھوں نے 'مسلم ثقافت کے روشن چہرے' پر بڑی بھرپور روشنی ڈالی۔ اردو کے دو عظیم فکشن نگار عبداللہ حسین (مصنف اداس نسلیں) اور انتظار حسین کی موجودگی نے کانفرنس میں چار چاند لگا دیے۔ ایران اور مصر سے اردو کے دو اساتذہ ڈاکٹر علی بیات اور ڈاکٹر ابراہیم مصری بھی رونق افروز تھے، جن کی تقریر سن کر نواز شریف کو یہ کہنا پڑا کہ ''یہ تو ہم سے بھی اچھی اردو بولتے ہیں۔'' ڈاکٹر علی بیات نے اردو زبان وادب میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے اور وہ تہران یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے صدر ہیں، جہاں 80 طلبا اور طالبات اردو ادب کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

افتتاحی اجلاس کے بعد اردو افسانے پر مبنی دوسرے اجلاس میں اردو افسانے کو انتظار حسین، عبداللہ حسین، انور سجاد، منشا یاد اور مسعود مفتی کے تناظر میں پرکھنے کی کوشش کی گئی۔ اس نشست کی صدارت ڈاکٹر سلیم اختر اور ڈاکٹر رضوان الرحمٰن نے کی اور میزبان کے طور پر ڈاکٹر آصف فرخی شریک رہے۔ اظہار خیال کرنے والوں میں ممتاز افسانہ نگار اور کالم نویس محترمہ زاہدہ حنا کے علاوہ 'سب رنگ' ڈائجسٹ کے بانی مدیر شکیل عادل زادہ کے علاوہ مسعود اشعر، نیلم احمد بشیر، ڈاکٹر مبین مرزا اور سعادت سعید نے مایۂ ناز افسانہ نگاروں کے فن پاروں کے تناظر میں دلچسپ تجزیے پیش کیے۔ مقررین کا خیال تھا کہ اردو میں مکالماتی فکشن کا آغاز انتظار حسین نے کیا اور ان کے افسانے انسانی، اخلاقی اور روحانی زوال کو پیش کرتے ہیں۔ شکیل عادل زادہ نے عبداللہ حسین کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ان کی تخلیق کے شیش محل میں رنگارنگی ہے۔

سیمینار کے دوسرے اجلاس کا موضوع 'تصوف اور ہمارا ادب' تھا۔ اس اجلاس میں پینلسٹ کے طور پر انیق احمد، بلال محبوب، منصور آفاق (برطانیہ) اور پروفیسر لوکس (جرمنی) ڈاکٹر صغریٰ صدف اور بابا یحییٰ خان جیسے بیدار مغز قلم کاروں نے شرکت کی اور اردو ادب پر تصوف کے اثرات کا بھرپور جائزہ لیا۔ کانفرنس کی تیسری نشست کا موضوع 'جمالیات کی اخلاقیات' تھا۔ اس نشست کے کوآرڈینیٹر ذوالفقار علی زلفی تھے جبکہ پینلسٹ میں فقیر سید اعجاز الدین، راحت نوید مسعود، قدوس مرزا، یاسمین حمید اور احمد شاہ وغیرہ نے شرکت کی۔ کانفرنس کے پہلے دن کا اختتام معروف رقاصہ ناہید صدیقی کے کلاسیکل رقص پر ہوا۔

کانفرنس کے دوسرے روز یعنی 24 نومبر کا پہلا اجلاس 'طنز ومزاح' کے نام تھا۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر یونس بٹ تھے۔ میزبان عطاء الحق قاسمی کے علاوہ مزاحیہ شاعر ڈاکٹر انعام الحق کی موجودگی اس محفل کی رونقوں کو دوبالا کر رہی تھی۔ اس نشست میں جہاں ایک طرف اردو اسکالروں نے پطرس بخاری، شفیق الرحمٰن، مشتاق احمد یوسفی، ابن انشاء، کرنل محمد خاں اور عطاء الحق قاسمی کے منتخب فن پاروں کی قرأت کی، وہیں پاکستان کے معروف مزاح نگار حسین احمد شیرازی نے طنز ومزاح کے فن کا نہایت بلیغ انداز میں تعارف پیش کیا۔ اس نشست میں اداکار شجاعت ہاشمی نے اپنی دلکش آواز سے حاضرین کو متاثر کیا۔ نئے لکھنے والوں میں اشفاق احمد ورک، گل نوخیز اختر، وقار خاں، حافظ مظفر محسن اور علی رضا احمد نے یہ احساس دلایا کہ پاکستان میں طنز ومزاح کے نئے لکھنے والوں کا پورا اعتماد موجود ہے۔

دوسرے دن کا چوتھا اجلاس 'ہندوستان میں اردو۔ مسلمانوں کی زبان؟' کے عنوان سے منعقد ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا اور نظامت ممتاز شاعرہ کشور ناہید نے کی۔ دیگر شرکا میں ڈاکٹر تحسین فراقی، عطاء الحق قاسمی اور ڈاکٹر عبدالواحد (بنگلہ دیش) شامل تھے۔ ہندوستان کی نمائندگی کیول دھیر اور راقم الحروف نے کی۔ اس موضوع پر ڈاکٹر تحسین فراقی نے ہندوستان کے غیر مسلم اردو ادیبوں اور شاعروں کی اردو خدمات پر روشنی ڈالی۔ راقم الحروف نے ہندوستان میں اردو زبان کی موجودہ صورت حال پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ جن علاقوں میں اردو تعلیم کا بندوبست ہے، وہاں اردو زبان وادب نے ترقی کی ہے اور جہاں اردو تعلیم کے سوتے خشک ہو چکے ہیں، وہاں اردو زبان جاں بلب ہے۔ البتہ مرکزی اور ریاستی حکومتیں اردو زبان وادب کی ترویج واشاعت میں مصروف ہیں۔ مرکزی حکومت کی وزارت برائے فروغ انسانی وسائل کے تحت قائم قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی خدمات لائق تحسین ہیں۔ ملک کی 16 ریاستوں میں اردو اکیڈمیاں قائم ہیں

اور تمام اہم یونیورسٹیوں میں اردو کے شعبے قائم ہیں۔

دوسرے روز کی نشست کا اختتام کل پاک و ہند مشاعرے پر ہوا۔ جس کی صدارت ممتاز پاکستانی شاعر ظفر اقبال نے کی اور مہمان خصوصی انور شعور تھے اس مشاعرے میں جن تین ہندوستانی شعرا کو مدعو کیا گیا تھا ان میں فرحت احساس، شبنم عشائی اور علینا عترت رضوی شامل تھیں۔ مشاعرے کی نظامت غریدہ فاروقی نے کی۔ اس مشاعرے میں 50 سے زیادہ مقامی شعرا نے اپنا کلام سنایا اور بیشتر نے سامعین سے داد وصول کی۔

آخری روز یعنی 25 نومبر کے پہلے اجلاس کا عنوان تھا 'شاعری میں نئی اصناف کا مستقبل'۔ اس اجلاس کی صدارت کشور ناہید نے کی اور مہمان خصوصی کے طور پر ڈاکٹر خورشید رضوی اور ڈاکٹر شبنم عشائی (سرینگر) شریک ہوئیں۔ جبکہ پینلسٹ میں مسعود اشعر ڈاکٹر عبدالواحد (بنگلہ دیش) ڈاکٹر علی بیات (ایران)، پروفیسر نعمان الحق، اصغر ندیم سید، انعام الحق جاوید اور منصور آفاق نے مباحثے میں حصہ لیا۔ دوسرا اجلاس کلاسیکل اور جدید موسیقی پر مبنی تھا۔ اس اجلاس کے کوآرڈینیٹر ڈاکٹر عمر عادل تھے اور پینلسٹ میں حامد علی خاں، احمد عقیل روبی، عقیل عباس جعفری اور ڈاکٹر امجد پرویز تھے۔

کانفرنس کا اختتامی اجلاس امن کی آشا اور ہماری میڈیا کے موضوع پر خاصی اہمیت کا حامل تھا اور اس اجلاس کو خطاب کرنے کے لیے ہندوستان سے راقم الحروف کے علاوہ ٹائمس آف انڈیا (حیدرآباد) کے ایڈیٹر کنگ سکھ ناگ کو مدعو کیا گیا تھا۔ جبکہ پاکستان کی نمائندگی وہاں کے ممتاز صحافیوں نجم سیٹھی، محمود شام، عارف نظامی، مجیب الرحمٰن شامی، سہیل وڑائچ، افتخار احمد، سلیم صافی، اوریا مقبول جان اور آفاق خیالی (امریکہ) نے کی۔

ہندو پاک کے درمیان امن قائم کرنے کے لیے میڈیا کے کردار پر طویل مباحثے کے دوران دونوں ملکوں کے سینئر صحافیوں نے یہ محسوس کیا کہ امن کی آشا خطے کے لیے ناگزیر ہے۔ صدارتی خطاب میں مہمان خصوصی نجم سیٹھی نے کہا جنگ گروپ اور جیوٹی وی کی طرف سے شروع کی گئی امن کی آشا عوامی خواہشات پر مبنی ہے۔ چیئرمین الحمرا عطاء الحق قاسمی نے کہا کہ اب ہم سب ماضی کی تمام باتوں کو بھلا کر نئے مستقبل کو بنیں۔ جنگ کی فضا بھی قائم نہ ہونے دیں۔ ایڈیٹر ٹائمز آف انڈیا کنگ سکھ ناگ نے کہا کہ ہم اتنے پاس ہو کر بھی اتنے دور ہیں۔ ہندوستان میں پاکستان کو لے کر بہت تحفظات ہیں۔ امن کو لے کر دونوں ملکوں کو سرکاری سطح پر الزام تراشیوں سے اجتناب کرنا ہوگا۔ عوامی رابطوں میں مزید وسعت لانی ہوگی۔ راقم الحروف نے کہا کہ صحافت کو کثافت سے نکالنا ہوگا۔

سہ روزہ کانفرنس کا اختتام محفل موسیقی پر ہوا۔ جس میں پاکستانی موسیقاروں حامد علی خاں، عطاء اللہ، صنم ماروی، ترنم راز اور سارہ رضا خاں نے خوبصورت سماں باندھ دیا۔

رپورٹ: معصوم مرادآبادی، ایڈیٹر روزنامہ 'جدید خبر' نئی دہلی، 13 دسمبر 2013

نیپال

نیپال کے اردو شاعر کو اعزاز

نئی دھلی: اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن و یونائیٹڈ مسلم دہلی کی جانب سے نیپال کے معروف شاعر زاہد آزاد جھنڈانگری صدر انجمن ارتقائے اردو ادب کو حفیظ میرٹھی عالمی اردو ایوارڈ سے سرفراز کیے جانے پر نیپال کی ادبی تنظیموں نے خوشی کا اظہار کیا اور مبارکباد پیش کی، ایک استقبالیہ تقریب میں مدرسہ خدیجۃ الکبریٰ، کرشنانگر، نیپال کے شیخ الحدیث مولانا مطیع اللہ مدنی نے کہا کہ زاہد آزاد جھنڈانگری نے مشاعروں اور ادبی پروگراموں کے ذریعے اردو کی جو خدمت کی ہے وہ لائق تحسین ہیں، انھوں نے ایوارڈ کے ذریعہ ہندوستان کے معروف شعرا و نظمائے مشاعرہ کو ہمالیائی اردو ادب ایوارڈ دے کر نمایاں خدمت انجام دی ہیں، ہم انھیں صمیم قلب سے مبارک باد پیش کرتے ہیں، مولانا عبدالقیوم مدنی استاذ مدرسہ خدیجۃ الکبریٰ نے کہا کہ نیپال میں اردو ادب کے حوالہ سے زاہد آزاد ایک نمائندہ شخصیت کے طور پر معروف ہیں انھیں حفیظ میرٹھی عالمی یوم اردو ایوارڈ برائے شعری ادب سے سرفراز کیا جانا خوش آئند بات ہے، مولانا محمد اکرم عالیاوی نے کہا کہ برادرم زاہد آزاد ملک نیپال میں اردو کا چراغ روشن کرنے میں اپنی توانائی صرف کریں گے اور ملک وملت کے تئیں اپنی خدمات جاری رکھیں گے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 18 نومبر 2013

کمپیوٹر کے ذریعے اردو میں ترجمہ

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی میں ایسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر سمیع رفیق نے امریکن ٹرانسلیٹرس ایسوسی ایشن سین اینٹونیو ٹیکساس، امریکہ میں منعقدہ 54ویں سالانہ بین الاقوامی کانفرنس میں 60 منٹ کا علمی مظاہرہ کیا۔ ڈاکٹر سمیع رفیق کے مقالے کا موضوع 'فیمنسٹ لیکسس ان انگلش ٹرانسلیشنز آف ویمنس رائٹنگ ان اردو' تھا۔ وہ اس بین الاقوامی کانفرنس میں مقالہ پیش کرنے والی واحد ہندوستانی تھیں۔ کانفرنس میں دنیا بھر کے ممتاز مترجم، ترجمان اور ماہرین نے شرکت کر کے جاپانی، چینی، سلیوک، ٹرکش، عربی، ہیرو، اسپینش، پرتگالی، جرمن، فرانسیسی اور اٹالین زبانوں کے علاوہ دیگر زبانوں کے علمی مظاہرے بھی پیش کیے گئے کانفرنس میں پہلی بار ڈاکٹر سمیع رفیق نے اردو زبان کے تراجم پیش کیے۔ انھوں نے 1500 مترجمین اور ترجمانوں سے تبادلۂ خیال بھی کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 15 نومبر 2013

برطانیہ

لندن میں ناول نگار کے ساتھ ایک شام

لندن: یارک شائر ادبی فورم نے برطانیہ میں مقیم مشہور ناول نگار، افسانہ نویس اور شاعر مقصود الٰہی شیخ کو برطانیہ میں اردو ادب کی خدمات کے عوض بریڈفورڈ یونیورسٹی کی طرف سے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری ملنے کی خوشی میں

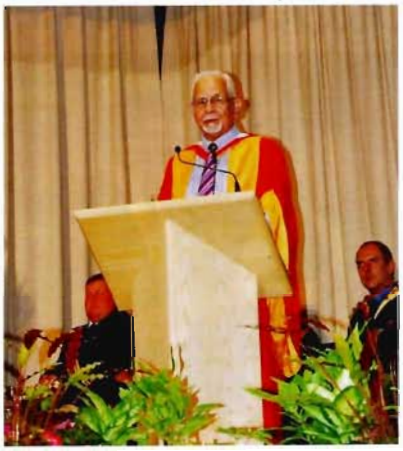

ان کے اعزاز میں 9 نومبر کو ایک تقریب کا اہتمام کیا۔ اس تقریب کی صدارت بریڈفورڈ میں پاکستانی قونصل خلیل احمد باجوا نے کی۔ جب کہ خصوصی مقررین میں بشیر احمد کاظمی اور ظفر نے شرکت کی۔ اس تقریب کی نظامت اشتیاق میر اور محترمہ غزل انصاری نے مشترکہ طور پر انجام دی۔ مسٹر مقصود الٰہی شیخ کو بریڈفورڈ یونیورسٹی نے ان کی ادبی خدمات کے عوض ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دی تھی۔ وہ برطانیہ سے شائع ہونے والے ضخیم ادبی رسالے مخزن کے ایڈیٹر ہیں۔ بیرون ممالک اردو کی ترویج و اشاعت میں وہ نمایاں رول ادا کر رہے ہیں۔ انھوں نے اردو کو کبھی روزی روٹی کا ذریعہ نہیں بنایا لیکن اردو کے فروغ میں انھوں نے ناقابل فراموش اور گراں قدر حصہ ادا کیا۔ ان کی ادبی خدمات کے عوض میں حکومت پاکستان انھیں باوقار ایوارڈ نشان امتیاز سے بھی نواز چکی ہے۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 9 نومبر 2013

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

خبر نامہ

اردو کے ہندوستانی سافٹ ویئر کا کپل سبل کے ہاتھوں اجرا

اردو ملک میں رابطے کی زبان ہے: کپل سبل

نئی دھلی: (یو این آئی) اس تاثر کو دوٹوک مسترد کرتے ہوئے کہ اردو زبان کا دائرہ مسلمانوں تک محدود ہے مرکزی وزیر مواصلات کپل سبل نے کہا کہ ہندوستان دنیا کا واحد ملک ہے جسے ہندی، اردو اور انگریزی کی شکل میں ملک گیر سطح پر رابطے کی تین زبانوں سے مالا مال ہونے کا شرف حاصل ہے۔

ٹی ڈی آئی ایل کے اشتراک سے قومی اردو کونسل کی اردو زبان کے لیے حسب حال کردہ تکنالوجیوں اور ان کے اطلاق کے سافٹ ویئر کا اجرا کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ مجوزہ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف لینگویجز میں اردو کا شعبہ نمایاں ہوگا۔

انھوں نے سائنسی اور تکنیکی محاذ پر اردو کے فروغ کو مہمیز لگانے پر زور دیتے ہوئے کہا کہ وہ ایک سینٹرل مانیٹرنگ کمیٹی بنانے پر زور دیں گے تاکہ روز افزوں مبتدل ٹکنالوجی کے منظر نامے پر اردو کبھی پیچھے نظر نہ آئے۔

مسٹر سبل نے کہا کہ اردو کے تعلق سے ایک طرح سے ان کا خواب شرمندہ تعبیر ہو رہا ہے جس کے لیے وہ اپنی موجودہ وزارت کے ساتھ ان تمام وزارتوں، محکموں اور شعبوں خاص طور پر اردو کونسل کے ممنون ہیں جن کی اجتماعی کوششوں سے ہم یہاں کسی پیش رفت کو دیکھنے اور سمجھنے کے لیے یکجا ہوئے ہیں۔

انھوں نے اردو کو اطلاعاتی تکنالوجی کے محاذ پر فروغ دینے سے خاطر خواہ دلچسپی لینے پر مسٹر کپل سبل کا شکریہ ادا بھی کیا۔

اس موقعے پر کونسل کے وائس چیئر مین پروفیسر

اردو کے ہندوستانی سافٹ ویئر کا کپل سبل کے ہاتھوں اجرا کا ایک منظر

کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے اس انقلابی قدم کو مسلسل حسب حال بنانے یعنی اَپ ڈیٹ کرنے پر زور دیا تاکہ رفتار زمانہ سے ہم آہنگی برقرار رہے۔ انھیں نے اس حوالے سے کہا کہ ایک سینٹر آف ایکسی لنس فار اردو قائم کیا جانا چاہیے۔

خواجہ اکرام نے تفصیلات بتاتے ہوئے کہا کہ اب تک ہم صرف اردو کی فونٹس کو منظر عام پر لا سکے تھے لیکن اب سی ڈیک، ٹی ڈی آئی ایل اور کونسل کی کوششوں سے باس آپریٹنگ سسٹم کو منظر عام پر لانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اب تک ہم غیر ملکی آپریٹنگ سافٹ ویئر استعمال کر رہے تھے اور اب ہم اپنی بھاشا اپنے سافٹ ویئر کے تعلق سے خود کفیل ہو گئے ہیں۔ اس موقعے پر باس کے ساتھ ساتھ اردو لائیکس، ونڈوز اور آکاش ٹیبلیٹ پر بچوں کی اردو کتابوں کا بھی اجرا ہوا۔

وسیم بریلوی نے بھی وزارت اور وزیر موصوف کے بھرپور تعاون کا شکریہ ادا کیا اور اردو والوں کے لیے اسے ایک بڑی کامیابی سے تعبیر کیا۔ تقریب کے شرکا میں اعلیٰ وزارتی نمائندوں بالخصوص سی ڈیک کے سربراہ ایم ڈی کلکرنی، ڈائٹی کے سکریٹری جے ستیہ نارائن نے بھی اظہار خیال کیا۔ استقبالیہ کلمات ڈاکٹر راجندر کمار نے پیش کیے اور اظہار تشکر محترمہ سورن لتا نے کیا۔ ان کے علاوہ پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر انور پاشا، پروفیسر ابن کنول، پروفیسر عبدالحق، پرفیسر قاضی عبیدالرحمن ہاشمی، کونسل کے رکن شیخ علیم الدین اسعدی، حافظ مطلوب کریم، فاروق انجینئر، فرید احمد، اسسٹنٹ ڈائریکٹر شمع کوثر یزدانی اور مختلف شعبہ ہائے زندگی کی دیگر شخصیات شامل تھیں۔

یو این آئی اردو، رابطہ عامہ سیل (کونسل)، 16 دسمبر 2013

ایس سی ایس ٹی کے طرز پر معاشی طور پر پسماندہ مسلم طلبہ کو تعلیمی وظائف دیے جائیں

قومی اقلیتی تعلیمی نگراں نفاذ کمیٹی کا مطالبہ

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، کے زیر اہتمام فروغ اردو بھون میں قومی اقلیتی تعلیمی نگراں نفاذ کمیٹی کی میٹنگ منعقد ہوئی اس میٹنگ میں اقلیتوں کی تعلیمی صورتحال سے متعلق نفاذ کے ان نکات پر غور وخوض کیا گیا جو کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں مرکزی حکومت کو پیش کی ہیں۔ میٹنگ کے ایجنڈے میں تعلیمی وظائف کا معاملہ سرفہرست رہا۔ کمیٹی کے صدر ڈاکٹر ظہیر آئی قاضی نے کہا کہ ہائر ایجوکیشن میں جو تعلیمی وظائف اور مراعات درج فہرست ذات وقبائل کے طلبہ کو وزارت برائے سماجی انصاف و بہبود کی جانب سے مل رہی ہیں وہی وظائف حکومت معاشی طور پر پسماندہ مسلم طلبہ کو بھی دے۔ انھوں نے کہا کہ کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں اس کی پرزور سفارش کی تھی لیکن ان دنوں یہ معاملہ مرکزی وزارت خزانہ کے زیر غور ہے اس لیے کمیٹی وزارت سے یہ مطالبہ کرتی ہے کہ وہ جلد از جلد اسے منظوری دے تاکہ نفاذ کی راہ آسان ہو سکے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اسی طرز پر لڑکیوں کے لیے ہنرمندی کے کورسیز کا بھی خاکہ تیار کیا گیا ہے جس کے نفاذ کی صورتوں پر غور وخوض جاری ہے۔ کمیٹی کے رکن اور ممتاز عالم دین مولانا ولی رحمانی نے کہا کہ کمیٹی نے اقلیتی، اکثریتی آبادی والے اضلاع میں ایجوکیشنل ہب بنائے جانے کی بھی سفارش کی ہے، جس کے تحت لڑکیوں کے لیے گرلز ہاسٹل، اسکول، کالج، آئی ٹی آئی کالج قائم کیے جانے کی تجویز پیش کی گئی ہے اور ان تمام اسکیموں کا نفاذ این جی اوز کے تحت کرائے جانے کا بھی خاکہ پیش کیا گیا ہے، جس کی منظوری کا انتظار کمیٹی کو ہے۔ انھوں نے کہا کہ اسی طرح نیشنل ٹریننگ کالج کے ضابطوں سے متعلق بھی سفارشات حکومت کو پیش کی گئی ہیں۔ جس میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ پرانے اور قدیم اداروں کو نئے ضابطوں سے مستثنیٰ رکھا جائے۔ میٹنگ میں اداروں کے قیام کے تعلق سے پیش آرہی دشواریوں بالخصوص آراضی کے معاملات وقف آراضی کے استعمال ادارے کھولنے کے لیے شرائط سرٹیفکیٹ جیسے متعدد پہلوؤں پر بھی غور وخوض کیا گیا۔ مولانا ولی رحمانی نے مزید کہا کہ کمیٹی اس بات کی خواہاں ہے کہ تعلیمی اسکیموں کا نفاذ این جی اوز کے ذریعے نہ صرف کرایا جائے بلکہ ان کا نفاذ ایک ہی کیمپس میں ہو تاکہ متعدد تعلیمی اسکیمیں بیک وقت مختلف شفٹوں میں چلائی جا سکیں۔ اسی طرح آئین کی دفعہ 30 کے تحت اقلیتوں کو ملنے والی مراعات کو بھی یقینی بنائے جانے پر غور وخوض کیا گیا۔ کمیٹی کے صدر ڈاکٹر ظہیر آئی قاضی نے کہا کہ ان میں سے بیشتر سفارشات مرکزی حکومت کے زیر غور ہیں اور وہ اب منظوری کے مرحلے میں ہیں انھوں نے کہا کہ کمیٹی امید کرتی ہے کہ حکومت منظوری کے عمل میں مزید تیزی لائے گی تاکہ نفاذ کی راہیں آسان ہو سکیں۔ کمیٹی کی رکن اور معروف سماجی کارکن محترمہ تیستا سیتلواڑ، حسیب احمد، ڈاکٹر خالد شیخ کے علاوہ وزارت فروغ انسانی وسائل کے نمائندے جناب کے پی جے جرالڈ نے بھی شرکت کی۔

ڈاکٹر ظہیر آئی قاضی کی صدارت میں قومی اقلیتی تعلیمی نگراں نفاذ کمیٹی کی میٹنگ کا منظر

پریس نوٹ، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 21 نومبر 2013

کونسل کے پیپر ماشی ڈپلومہ کورس کا آغاز

سرینگر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ترقی کی سمت ایک قدم اور آگے بڑھاتے ہوئے ششماہی پیپر میشی ڈپلومہ کا آغاز کیا ہے۔ اس سلسلے میں یونیورسٹی آف کشمیر کے اشتراک سے یونیورسٹی کیمپس میں ایک پریس کانفرنس کا انعقاد کیا گیا۔ جس میں پیپر ماشی ڈپلومہ کے آغاز کا باقاعدہ اعلان کیا گیا۔ اس موقع پر کونسل کے وائس چیئرمین پروفیسر وسیم بریلوی نے کہا کہ پیپر ماشی کے فن کے ساتھ ہمارا ایک تہذیبی رشتہ ہے۔ پروفیسر وسیم بریلوی اور ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے یونیورسٹی آف کشمیر کے کارگزار وائس چانسلر پروفیسر اے ایم صوفی اور دیگر عہدیداران کا بھی شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے کہا کہ یونیورسٹی آف کشمیر کے بھرپور تعاون اور ماہرین کی مدد سے ہی کونسل اس ڈپلومہ کو آج متعارف کر پائی ہے۔ پروفیسر صوفی نے کونسل کے اس قدم کی ستائش کی اور انھوں نے کہا کہ سری نگر سے پیپر ماشی کا آغاز ایک اہم ترین قدم ہے کیونکہ پیپر ماشی ریاست جموں وکشمیر کی تجارت سے بھی وابستہ ہے کونسل نے اسے تعلیم سے جوڑ کر اس فن کو نئی جہت دینے کی کوشش کی ہے۔ ڈائریکٹریٹ آف لائف لانگ لرننگ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر غلام حسن میر نے کہا کہ یہ پروگرام ڈائرکٹریٹ کے زیر اہتمام چلایا جائے گا تاکہ طالبہ وطالبات اس ڈپلومہ سے متعارف ہوں اور فائدہ اٹھا سکیں۔ پروفیسر اے ایم شاہ نے اس مشترکہ کوشش کی ستائش کی اور متعلقہ اداروں کو مبارکباد بھی پیش کی انھوں نے امید ظاہر کی کہ اس سے روزگار کی نئی راہیں ہموار ہوں گی اور اس فن کو فروغ حاصل ہوگا۔ اس موقع پر پروفیسر غلام نبی خیال کے علاوہ کونسل کے اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر اجمل سعید نے بھی شرکت کی۔

روزنامہ ہندوستان ایکسپریس، دہلی، 21 نومبر 2013

قومی اردو کونسل جلد ہی اردو کی نادر و نایاب آڈیو ویڈیو ریکارڈنکس اردو پورٹل پر لائے گی

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، حکومت ہند کے زیر اہتمام اردو کی کلاسکی شخصیات پر مبنی آڈیو ویڈیو ریکارڈنکس کے موضوع پر ایک میٹنگ کا انعقاد کونسل کے صدر دفتر فروغ اردو بھون میں کیا گیا۔ میٹنگ کی صدارت کونسل کے وائس چیئرمین پروفیسر وسیم بریلوی نے کی اور ماہرین کا استقبال کونسل کے

میٹنگ کے دوران پروفیسر وسیم بریلوی، خواجہ محمد اکرام الدین، بشارت احمد، ایم رحمت اللہ، شکیل حسن شمسی، شکیل اختر اور ڈاکٹر کلیم اللہ

ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے کیا۔ اپنے صدارتی کلمات میں پروفیسر وسیم بریلوی نے کہا کہ کونسل اردو کی نامور عبقری شخصیات بالخصوص شعرا و ادبا کی آڈیو ویڈیو ریکارڈنکس کے سلسلے میں خاصی کوشش کرتی رہی ہے اور اس کے مثبت نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ کمپیوٹر ٹکنالوجی کے اس دور میں آڈیو، ویڈیو ریکارڈنکس کی اہمیت خاصی بڑھ جاتی ہے اس لیے کونسل ان نایاب ریکارڈنکس کے حصول کی کوشش کر رہی ہے انھوں نے کہا کہ ان ریکارڈنکس کی مدد سے محبان اردو اب اپنے پسندیدہ کلاسیکی شعرا و ادبا کو سن اور دیکھ سکیں گے۔

میٹنگ کی غرض و غایت بتاتے ہوئے کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے کہا کہ کونسل حالیہ دنوں میں اس تعلق سے خاصی کوشش کرتی رہی ہے اور اس کوشش کے نتیجے میں کونسل اب اردو پورٹل لانے کی تیاری کر رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ کونسل اشتہارات و اپیلوں کے ذریعے ملک بھر سے اس قسم کی نادر و نایاب ریکارڈنکس جمع کرتی رہی ہے اور یہ سلسلہ ابھی بھی جاری ہے۔ انھوں نے محبان اردو سے ایک مرتبہ پھر اپیل کی کہ وہ نادر و نایاب ریکارڈنکس کے حوالے سے کونسل سے کسی بھی وقت رابطہ کر سکتے ہیں۔ کونسل اس کے اخراجات بھی برداشت کرے گی، انھوں نے کہا کہ اب تک جگر مرادآبادی سمیت دیگر شعرا کے کلام کی آڈیو ویڈیو ریکارڈنکس موصول ہوئی ہیں، جنھیں جلد ہی اردو پورٹل کے ذریعے منظر عام پر لایا جائے گا۔ میٹنگ میں دوردرشن کے سابق ڈائرکٹر جناب بشارت احمد اور روزنامہ انقلاب کے مدیر جناب شکیل حسن شمسی اور دوردرشن کے اردو مشیر ڈاکٹر ایم رحمت اللہ اور ریڈیو جامعہ کے مدیر جناب شکیل اختر نے شرکت کی اور اس تعلق سے کونسل کو اپنی آرا پیش کیں۔ ان ماہرین نے کونسل کے اس قدم کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ اس قدم سے نئی اردو نسل کو نہ صرف خاصا فائدہ ہوگا بلکہ آنے والی نسلیں بھی اس سرمایے سے مستفید ہوتی رہیں گی۔ انھوں نے کہا کہ یہ ایک انتہائی اہم قدم ہے اور وقت کی ضرورت بھی ہے۔ میٹنگ میں کونسل کے ریسرچ آفیسر ڈاکٹر کلیم اللہ نے بھی شرکت کی۔

پریس نوٹ، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 9 دسمبر 2013

اردو زبان کا مستقبل تاریک نہیں بلکہ روشن ہے: پروفیسر وسیم بریلوی

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، حکومت ہند کے زیر اہتمام فاصلاتی نظام تعلیم کے موضوع پر فروغ اردو بھون میں ایک میٹنگ کا انعقاد کیا گیا جس میں کونسل کے تحت چل رہے فاصلاتی نظام تعلیم سے متعلق صورت حال پر غور و خوض کیا گیا۔ میٹنگ کی صدارت کونسل کے وائس چیئرمین پروفیسر وسیم بریلوی نے کی جب کہ استقبالیہ کلمات کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے پیش کیے۔ اپنے صدارتی کلمات میں پروفیسر وسیم بریلوی نے کہا کہ اردو والوں کو ہرگز مایوس ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ اردو زبان کا مستقبل تابناک ہوسکتا ہے اگر اردو والے اپنی ذمے داری کے سلسلے میں مزید سنجیدہ ہوں۔ انھوں نے کہا کہ کونسل اردو زبان کو تعلیم اور روزگار سے جوڑنے کے لیے موثر قدم اٹھاتی آئی ہے، یہی وجہ ہے کہ آج اردو کو کمپیوٹر ٹکنالوجی سے جوڑنے کا خواب شرمندۂ تعبیر کیا جا سکا ہے۔ اردو زبان کو مشترکہ تہذیب کی علامت قرار دیتے ہوئے کہا کہ یہ محبت کی زبان ہے اس لیے اردو والوں کو بڑی محبت سے اردو کو گھر گھر پہنچانا ہوگا اور اس کے دائرے کو وسیع سے وسیع تر کرنے میں سرگرم ہونا ہوگا۔

فاصلاتی نظام تعلیم سے متعلق کمیٹی برائے فاصلاتی نظام (اردو) کے اراکین کا استقبال کرتے ہوئے کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے کہا کہ اردو خواندگی کو فروغ دینے

فاصلاتی نظام تعلیم سے متعلق میٹنگ کا منظر

کے لیے کونسل ملکی سطح پر اردو عربی ڈپلومہ کورسیز چلا رہی ہے اور آج ملک کی 22 ریاستوں میں 598 اردو تعلیمی مراکز قائم کیے جا چکے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس میٹنگ میں مزید 50 سے 70 مراکز قائم کیے جانے کی تجویز پر غور و خوض جاری ہے اور جلد ہی اردو آبادی کے تناسب سے مزید مراکز قائم کیے جائیں گے۔ انھوں نے کہا کہ اردو تعلیم بالخصوص حروف کی شناخت اور رسم الخط ایک اہم ترین مسئلہ ہے اور کونسل اس مسئلے کے حل کے لیے بھی کوشاں ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو تعلیمی مہم کے تحت ہر سال تقریباً 50,000 اردو طلبہ کو ان مراکز سے جوڑا جاتا ہے اور کونسل فی مرکز کم از کم 56000/- روپے کی رقم کی منظوری دیتی ہے۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ نئے مجوزہ مراکز کے قیام سے اس تعداد میں مزید اضافہ ہو سکے گا۔ میٹنگ میں کمیٹی کے اراکین نے اپنی اپنی تجاویز بھی پیش کیں اور مجوزہ مراکز کے قیام کی تجویز کا خیر مقدم کیا۔ اتر پردیش اردو عربی فارسی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر انیس انصاری نے کہا کہ اردو کی حوصلہ افزائی کی مزید ضرورت ہے تاہم ریاستی سطح پر کونسل اپنے مراکز کی نگرانی کا بھی نظم کرے۔ کمیٹی کے رکن اور معروف شاعر انور جلال پوری نے بھی اردو رسم الخط کو عام کرنے پر زور دیا۔ کونسل کے ذمے داران نے ان تجاویز کو تسلیم کرتے ہوئے کہا کہ جلد ہی ہر ریاست میں نگرانی کا مزید نظم کیا جائے گا۔ میٹنگ میں پروفیسر صابرہ حبیب، نیلوفر خان، کے۔ ملک العزیز، سعید احمد خاں، ڈاکٹر محمد احسن، ڈاکٹر حنان خان، ڈاکٹر اسرائیل رضا، حبیب الرحمٰن نیازی، محمد عمر، فرحت بیگ عرف سنی بیگ اور ڈاکٹر حسن احمد نظامی کے علاوہ کونسل کے ریسرچ آفیسر ڈاکٹر کلیم اللہ سمیت دیگر عہدیداران نے بھی شرکت کی۔

پریس نوٹ، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 10 دسمبر 2013

قومی اردو کونسل اپنے تمام مراکز کی نگرانی علاقائی سطح پر کرائے گی، کونسل کی ایک اہم میٹنگ میں لیا گیا فیصلہ

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، حکومت ہند کے اردو، عربی، خطاطی اور کمپیوٹر مراکز ملکی سطح پر قائم ہیں ان مراکز کی نگرانی اور کارکردگی کو بہتر بنانے پر سنجیدگی سے غور وخوض کیا جاتا رہا ہے اور اب متفقہ طور پر یہ فیصلہ لیا ہے کہ قومی اردو کونسل علاقائی سطح پر اپنے تمام مراکز کی نگرانی کرائے گی تاکہ کونسل ان مراکز کی کارکردگی اور زمینی حقائق کا پتہ لگا سکے۔ نیز ان کی کارکردگی کو فعال بنا سکے۔ اس ایجنڈے کے تحت کونسل کے زیر اہتمام فروغ اردو بھون میں ایک اہم میٹنگ کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت کونسل کے وائس چیئرمین پروفیسر وسیم بریلوی نے کی اس موقعے پر انھوں نے کہا کہ مراکز کے نظام اور کارکردگی کو

فکر وتحقیق کے نئے 'افسانہ نمبر' کا اجرا

فعال بنانے کے لیے ضروری ہے کہ علاقائی سطح پر نگرانی علاقائی اراکین کی مدد سے ہی کرائی جائے۔ انھوں نے کہا کہ کونسل کے تمام مراکز خاصی اہمیت کے حامل ہیں کیونکہ کونسل ان مراکز کی مدد سے اردو کو تعلیم اور روزگار سے جوڑنے کی مہم چلا رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان کا رشتہ عربی زبان وادب سے بھی خاصا گہرا ہے اس لیے کونسل عربی مراکز بھی چلا رہی ہے، جہاں فنکشنل عربی کا یک سالہ اور دوسالہ ڈپلومہ کورس پڑھایا جارہا ہے۔ ان مراکز سے بڑی تعداد میں مدارس کے طلبہ بھی وابستہ ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اب جلد ہی اردو عربی مراکز کے طرز پر فارسی مراکز کا قیام عمل میں لایا جائے گا۔ عربی ڈپلومہ کمیٹی کے تمام اراکین کا پرتپاک خیر مقدم کرتے ہوئے کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے کہا کہ علاقائی سطح پر قائم ہونے والے مونیٹرنگ سیل سال میں تین مرتبہ مراکز کا معائنہ کریں گے اور ان مراکز کی کارکردگی سے کونسل کو مطلع کریں گے۔ انھوں نے کہا کہ کونسل مراکز کی تعداد میں اضافے کے ساتھ ساتھ اساتذہ کی تعداد میں بھی اضافہ کرے گی۔ اب تک پچاس طلبہ پر ایک استاد مقرر کیا جاتا تھا اور پچاس کے بعد کی تعداد میں ضابطے کے تحت دو استاتذہ کونسل فراہم کرتی تھی لیکن اب اس ضابطے میں ترمیم کی جارہی ہے اور پچاس کے بعد پچھتر طلبہ کی تعداد پر دو اساتذہ فراہم کیے جائیں گے۔ ہر مرکز پر طلبہ کی تعداد 100 مقرر کی گئی ہے۔ میٹنگ میں موجود عربی ڈپلومہ کورس کمیٹی کے تمام اراکین نے کونسل کے ان اقدام کی بھرپور تائید کی اور اپنی آرا پیش کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ وہ اس سلسلے میں کونسل کی بھرپور معاونت کریں گے۔ اس دوران کونسل کے سہ ماہی رسالہ 'فکر وتحقیق' کے خصوصی شمارہ (نیا افسانہ نمبر) کا اجرا کونسل کے وائس چیئرمین پروفیسر وسیم بریلوی، کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین، کمیٹی کے رکن ڈاکٹر محمد عبدالحکیم ازہری، ریسرچ آفیسر جناب کلیم اللہ کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ میٹنگ میں کمیٹی کے رکن پروفیسر مسعود انور علوی، عاشق رضا خاں، سہیل بیگ اور مولانا صغیر اختر سمیت کونسل کے دیگر عہدیداران نے بھی شرکت کی۔

پریس نوٹ، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 11 دسمبر 2013

قومی اردو کونسل کا مولانا ابوالکلام آزاد کی ہمہ گیر شخصیت پر سہ روزہ قومی سیمینار کا فیصلہ

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، حکومت ہند حال ہی میں اردو زبان سے متعلق قومی و بین الاقوامی سمینار کے انعقاد کے بعد اب ہندوستان کے عظیم مجاہد آزادی قوم وملک کے معمار اور ملک کے پہلے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد کی حیات وخدمات کے موضوع پر سہ روزہ قومی سمینار کا انعقاد کرے گی۔ مولانا آزاد پر سمینار کی ایک تجویز کونسل کی مجلس عاملہ کی جانب سے آئی تھی جس پر عمل آوری کرتے ہوئے کونسل نے ایک سمینار کمیٹی تشکیل دی تھی۔ اس کمیٹی کی پہلی میٹنگ حال ہی میں فروغ اردو بھون میں منعقد ہوئی جس کی صدارت کونسل کے وائس چیئرمین پروفیسر وسیم بریلوی نے کی۔ میٹنگ میں سمینار کے تمام تر پہلوؤں پر سنجیدگی سے غور وخوض کیا گیا اور یہ فیصلہ لیا گیا کہ کونسل فروری 2014 کے آخر یا مارچ 2014 کے پہلے ہفتے میں مولانا آزاد پر ایک قومی سمینار کا انعقاد دہلی میں کرے گی۔ اس موقعے پر انھوں نے کہا کہ مولانا آزاد کے قومی، سماجی، مذہبی، تعلیمی، سیاسی اور صحافتی افکار ونظریات کو عام کرنے کی اشد ضرورت ہے اس لیے کونسل نے مولانا آزاد پر سمینار کرانے کا فیصلہ لیا ہے۔

کمیٹی کے اراکین کا خیر مقدم کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے کیا۔ سمینار کی تفصیلات بتاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ مولانا آزاد پر سہ روزہ سمینار کے چار مختلف اجلاس ہوں گے جس میں مولانا آزاد کی مجموعی خدمات، ان کی شخصیت کے مختلف

مولانا آزاد پر سیمینار سے متعلق پروفیسر وسیم بریلوی کی صدارت میں ہوئی میٹنگ کا منظر

پہلوؤں اور عصر حاضر میں ان کی معنویت وضرورت پر مقالات پیش کیے جائیں گے۔ اس سمینار میں ملک کے نامور ماہرین، مورخین، دانشور وعلمی شخصیات کو مدعو کیا جائے گا۔ افتتاحی اجلاس کے بعد پہلے سیشن میں مولانا آزاد کی بازیافت پر مقالات پیش کیے جائیں گے دوسرے اجلاس میں تکثیری معاشرے میں مولانا آزاد کی معنویت، تیسرے اجلاس میں مولانا کے تعلیمی تصورات ومختلف نصابات میں مولانا آزاد پر اسباق کا جائزہ لیا جائے گا۔ تاہم ان کی ثقافتی وصحافتی خدمات پر بھی مقالات پیش کیے جائیں گے، چوتھے اور آخری اجلاس میں مولانا آزاد پر مستقبل قریب میں کیے جانے والے کاموں کا لائحہ عمل پیش کیا جائے گا۔ سمینار کمیٹی کے اراکین بالخصوص جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر محمد میاں، دہلی اردو اکادمی کے وائس چیئرمین اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ اسلامیات کے صدر پروفیسر اختر الواسع، کونسل کے رکن شیخ علیم الدین اسعدی نے میٹنگ میں شرکت کی اور سمینار کے حوالے سے اپنی تجاویز کونسل کو پیش کیں۔ میٹنگ میں کونسل کے ریسرچ آفیسر کلیم اللہ، ریسرچ اسسٹنٹ مسرور احمد، ڈاکٹر قاسم انصاری اور ٹی اے ڈاکٹر جاوید اقبال نے بھی شرکت کی۔

پریس نوٹ، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 12 دسمبر 2013

کونسل نے رواں سال میں تقریباً پچاس لاکھ روپے کی اردو کتابوں کی خرید کو منظوری دی

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، حکومت ہند اردو کتابوں اور قلم کاروں کی حوصلہ افزائی ملکی سطح پر کرتی ہے اور اپنی پالیسی کے تحت کتابوں کی تھوک خریداری بھی کرتی ہے۔ اس مقصد کے تحت کونسل کے زیر اہتمام فروغ اردو بھون میں ایک میٹنگ کا انعقاد کیا گیا جس میں سال 14-2013 میں تھوک خریدی گئی کتابوں کی تفصیلات پیش کی گئیں اور کتابوں، رسائل، جرائد کی تھوک خریداری کو منظوری دی گئی۔ Bulk-Purchase کمیٹی کی دوسری میٹنگ کونسل کے وائس چیئرمین پروفیسر وسیم بریلوی کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ اس موقعے پر انھوں نے کہا کہ کونسل نے رواں سال کے دوران تقریباً 50 لاکھ روپے کی اردو کتابوں، رسائل و جرائد کی ریکارڈ ساز خریداری کی ہے جو کہ اردو زبان وادب کے لیے ایک خوش آئند بات ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ کونسل اردو کی تمام معیاری کتابوں، رسائل و جرائد کی خریداری کر کے اردو قلم کاروں کی حوصلہ افزائی کرتی رہتی ہے اور یہ مشن بدستور جاری ہے۔

کمیٹی کے تمام اراکین کا خیر مقدم کرتے ہوئے کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد خواجہ اکرام الدین نے کہا کہ کونسل پہلے Bulk-Purchase کمیٹی کی میٹنگ سال میں ایک مرتبہ کرتی تھی لیکن رواں سال کے دوران دو میٹنگوں کا انعقاد کیا گیا اور اب ہر سال دو میٹنگیں ہوا کریں گی تا کہ زیادہ سے زیادہ اردو کی معیاری کتابوں، رسائل و جرائد کی خریداری کی جا سکے اور ان کی حوصلہ افزائی ممکن ہو سکے۔ انھوں نے کہا کہ پچاس لاکھ کی خریداری کا ریکارڈ اسی لیے ممکن ہو سکا ہے کیونکہ کونسل نے امسال کتابوں کی تھوک خریداری دوسری مرتبہ کی ہے۔ اس میٹنگ میں 189 اردو کتابیں، 11 نئے رسائل و جرائد، 9 عربی و فارسی کتابیں اور 40 پرانے رسائل کے لیے منظوری دی گئی۔ انھوں نے تمام مدیران سے اپیل بھی کی کہ وہ اپنے رسائل و جرائد RNI سے چھ ماہ کے اندر رجسٹرڈ کرالیں تا کہ انھیں مراعات فراہم کرنے میں کونسل کو آسانی ہو سکے اور اپنے رجسٹریشن کی بنا پر وہ دیگر اداروں سے بھی مالی امداد حاصل کر سکیں۔ انھوں نے زور دے کر کہا کہ اردو قلمکار ہرگز مایوس نہ ہوں بلکہ وہ عہد حاضر کی ضرورتوں اور موضوعات کے پیش نظر تخلیقات و تصنیفات کا سلسلہ جاری رکھیں۔ میٹنگ میں پروفیسر فضیل احمد قادری، پروفیسر صغیر افراہیم، غلام نبی خیال، پروفیسر علی احمد فاطمی، پروفیسر شہناز نبی، فیروز بخت احمد، اصغر ویلوری اور عابد رضا بیدار نے بھی شرکت کی اور کتابوں کی خریداری میں اپنی تجاویز کونسل کو پیش کیں۔ ان تمام اراکین نے اس ریکارڈ ساز خریداری کے لیے کونسل کو مبارکباد بھی پیش کی اور کہا کہ کونسل کے اس قدم سے اردو قلم کاروں کو ایک نئی قوت ملی ہے۔

کتابوں کی تھوک خریداری سے متعلق میٹنگ کا منظر

میٹنگ میں کونسل کے ریسرچ آفیسر جناب شاہنواز خرم، لائبریرین محترمہ ساجدہ بیگم، ریسرچ اسسٹنٹ ڈاکٹر قاسم انصاری، محترمہ فرح دیبا اور اقبال حسین نے بھی شرکت کی۔

پریس نوٹ، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 13 دسمبر 2013

قومی اردو کونسل کے تعاون سے

اردو کے 'عروج وارتقا' پر سمینار

لکھنؤ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے اردو کا عروج وارتقا اور اس کی ضرورت کے موضوع پر ایک سمینار جامعۃ القرا کھدرا کے زیر اہتمام رائے اوما ناتھ بلی آڈیٹوریم قیصر باغ میں وزیر مملکت عابد رضا کی صدارت میں ہوا جس کی سرپرستی قاضی شہر مفتی ابوالعرفان فرنگی محلی نے کی اور بطور مہمان خصوصی ملی کونسل کے نائب صدر یاسین علی عثمانی نے شرکت کی۔ سیمنار سے خطاب کرتے ہوئے مولانا یاسین علی عثمانی نے کہا کہ اردو صرف ایک زبان کا نام نہیں بلکہ یہ ہندوستان کا صدیوں کا تہذیبی ورثہ ہے اور اس سے انکار کرنے والے ملک کے ساتھ ناانصافی کر رہے ہیں۔ وزیر مملکت عابد رضا خاں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ ہمیں اردو کی حالت کا احساس ہے، اس کی فکر ہے، ہم نے اس پر غور کیا ہے۔ ہمیں اپنی مادری زبان کو محفوظ رکھتے ہوئے اپنے بچوں کو اردو تعلیم سے آشنا کرانا ہوگا۔ اردو کا پیغام ہے کہ مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا اور ہمیں اس پیغام کو اپنے ہم وطنوں تک پہنچانا چاہیے کہ اردو اتحاد اتفاق پیدا کرنے والی زبان ہے۔ روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 26 نومبر 2013

پروفیسر رفیق میموریل لیکچر

الہ آباد: قومی اردو کونسل کے تعاون سے شعبۂ عربی و فارسی الہ آباد یونیورسٹی میں چوتھا پروفیسر رفیق یادگاری خطبہ

منعقد کیا گیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شعبۂ اسلامیات کے سابق صدر و نامور دانشور پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے 'ہندوستان میں صوفی لٹریچر' کے عنوان پر خطبہ پیش کیا۔ پروگرام کی صدارت پروفیسر نعیم الرحمٰن فاروقی نے کی۔ پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ صوفی لٹریچر کو چار حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ملفوظات، تذکرہ، مکتوبات اور تصوف کے موضوع پر لکھی جانے والی دیگر کتابیں، پروفیسر واسع نے کہا کہ حضرت داتا گنج بخش پہلے صوفی ہیں جنھوں نے ہندوستان میں تصوف کے موضوع پر تصنیف وتالیف کی ابتدا کی اور کشف المحجوب جیسی معرکۃ الآرا کتاب تصنیف کی جو نہ صرف تصوف کے موضوع پر پہلی کتاب ہے بلکہ فارسی ادب کی بھی پہلی کتاب کہی جاسکتی ہے۔ دوسرا سب سے بڑا نام حضرت شرف الدین یحییٰ کا ہے حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کا نام بھی تصنیف و تالیف کے میدان میں اہم ہے۔ انھوں نے تصوف سے متعلق جو کچھ بھی لکھا وہ بہت اہمیت کا حامل ہے۔ حضرت گیسودراز کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے تصوف کی اہم کتابوں کی شرح بھی لکھی، نیز آپ نے قرآن کی صوفیانہ تفسیر بھی تصنیف فرمائی جو ہندوستان میں اس نوع کی پہلی تفسیر تھی۔ پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ الہ آباد کے اہم صوفی بزرگ شاہ محبّ اللہ الہ آبادی کی شخصیت ایک انجمن کی طرح تھی۔ ڈاکٹر حسنین اختر نے معزز مہمانوں کا تعارف پیش کیا اور صدر شعبۂ پروفیسر عبدالقادر نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ اپنے صدارتی خطبہ میں پروفیسر نعیم الرحمٰن فاروقی نے ملفوظات وتذکروں میں بیان شدہ حکایات کا ذکر کرتے ہوئے کہا یہ صوفی ادب کا بہت اہم حصہ ہیں جن پر کام کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ پروگرام میں پروفیسر عقیل رضوی اور پروفیسر بی پی سنگھ نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر حسنین اختر نے کی اور شکریہ کے کلمات ڈاکٹر محمود مرزا نے ادا کیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا'، دہلی، 25 نومبر 2013

سیتاپور میں قومی یکجہتی مشاعرہ

خیرآباد: روشنی نیشنل سیوا گرام ادیوگ سنستھان ضلع سیتاپور (یوپی) کے روشنی کمپیوٹر سینٹر خیرآباد کے گراؤنڈ میں قومی اردو کونسل کے اشتراک سے بتاریخ یکم نومبر کو قومی یکجہتی آل انڈیا مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ مشاعرے کی صدارت صدر جمہوریہ ایوارڈ یافتہ محترمہ مست حفیظ رحمانی سیتاپوری نے کی اور نظامت کے فرائض محترم رئیس انصاری لکھنوی نے انجام دیے جب کہ مہمان خصوصی کے طور پر محترمہ شمینہ شفیق صاحبہ ممبر راشٹریہ مہیلا آیوگ بھارت سرکار اور جناب حاجی محمد حنیف انصاری صاحب چیئرمین نگر پالیکا خیرآباد نے شرکت کی اور اپنے خیالات اردو کے فروغ کے سلسلے میں ظاہر کیے اس تاریخی مشاعرے میں ارشاد کانپوری، ترنم کانپوری، سلیم تابش لکھنوی، عرفان لکھنوی، رئیس انصاری لکھنوی، زینت مرادآبادی، فرقت لکھیم پوری، رفیق ناگوری اجین، عزم گونڈوی، تابش مہدی دہلوی، شکیل گیاوی، عمر فاروقی لہرپوری، کامنی ورما لہرپور، خوشتر رحمانی، رضوان، محفوظ، انوار ندیم سیتاپوری، ڈاکٹر عزیز خیرآبادی، منظر ابرار بدایونی، کشش مرادآبادی، مجاز سلطانپوری و دیگر مقامی شعرا نے بھی اپنے کلام سے نوازا۔ بذریعہ ڈاک: زین العابدین (منیجر)، روشنی نیشنل سواگرام ادیوگ سنستھان، خیرآباد سیتاپور، 22 نومبر 2013

ہندوستان میں اردو صحافت آزادی کے بعد

وشاکھاپٹنم: بزم اصنام وشاکھاپٹنم کے زیر اہتمام قومی اردو کونسل کے تعاون سے ہوٹل بدھل پارک میں زیر صدارت ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی عظیم الشان نیشنل سیمینار منعقد کیا گیا۔ بحیثیت مہمانِ خصوصی جناب ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین ڈائرکٹر قومی اردو کونسل نے شرکت کی۔ سیمینار کا موضوع 'ہندوستان میں اردو صحافت: آزادی کے بعد' جس میں ملک کی 17 ریاستوں سے مندرجہ ذیل دانشوروں کے (ریاست وائز) مقالات پیش کیے گئے۔ مہمان خصوصی جناب ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین اور صدر محفل جناب ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی شال پوشی کے بعد سیمینار کا آغاز ہوا۔ نظامت صدر بزم اصنام جناب عثمان نے کی۔ مقالہ نگاروں میں پروفیسر مقبول فاروقی (آندھراپردیش)، اختر شاہجہاں پوری (اترپردیش)، خاور نقیب (اڈیشہ)، ڈاکٹر سید احمد قادری (بہار)، ڈاکٹر افضل مصباحی (پنجاب)، ڈاکٹر سجاد بخاری (تمل ناڈو)، پروفیسر قدوس جاوید (جموں کشمیر)،

قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر خواجہ محمد اکرام الدین سیمینار میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے

ایم زیڈ خان (جھارکھنڈ)، امتیاز احمد انصاری (چھتیس گڑھ)، کمال جعفری (دہلی)، ڈاکٹر نذیر فتح پوری (راجستھان اور صوبہ مہاراشٹر)، ڈاکٹر آفاق عالم صدیقی (کرناٹک)، رشید افروز (گجرات)، ڈاکٹر سیفی سرونجی (مدھیہ پردیش)، امتیاز احمد راد (مغربی بنگال)، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے اپنی صدارتی تقریر اور اپنے مقالہ میں آزادی کے بعد پورے ہندوستان میں اردو صحافت کا بھرپور جائزہ پیش کیا۔ مذکورہ بالا مقالہ نگاروں میں جو مقالہ نگار کسی وجہ سے بذات خود شریک نہیں ہوسکے انھوں نے اپنا نمائندہ بھیج دیا تھا۔ اس موقعے پر تمام مقالہ نگاروں کے مضامین کو عثمان انجم نے ترتیب دے کر بنام 'ہندوستان میں اردو صحافت: آزادی کے بعد' کتابی شکل میں شائع کیا جس کی رسم اجرا مہمانِ خصوصی ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین اور ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کے ہاتھوں انجام دی گئی۔ قومی اردو کونسل کی کارگزاری اور اردو کی پیش رفت کے سلسلے میں مہمانِ خصوصی ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے دلچسپ انداز میں تفصیل بیان کی اور سامعین کو بہت ساری نئی جانکاری دی ساتھ ہی وشاکھاپٹنم میں اردو کے فروغ کے لیے اپنی وساطت سے بعض اہم کام کرنے کا وعدہ بھی کیا۔ شام کے 7 بجے Jalauddyanavanam SSR Function Hall میں کل ہند مشاعرہ و کوی سمیلن منعقد ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے کی جب کہ نظامت جناب اطیب اعجاز مدیر ماہنامہ 'لمس کی خوشبو' (حیدرآباد) نے کی۔ مہمانِ خصوصی ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے اپنی صدارتی تقریر میں اردو اور ہندی کے آپسی تعلقات کو ملک اور قوم کی ترقی اور قومی یکجہتی کا ضامن قرار دیتے ہوئے کہا کہ:

''اردو اور ہندی میں فرق صرف اتنا اک خواب دیکھتی ہے اک دیکھتی ہے سپنا''

مزید برآں انھوں نے اپنی تقریر میں یہ بھی کہا کہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ادبی محافل میں ہندوستانیت کو گنگا جمنی تہذیب کہہ کر جنوب کی ساحلی تہذیب کو یکسر نظرانداز کردیا جاتا ہے۔ میرے خیال میں ہندوستانی تہذیب کو 'گنگا جمنی اور ساحلی تہذیب' کا نام دیا جائے تو ہمارے آپسی تعلقات مزید مستحکم ہوں گے اور صحیح معنوں میں یہ ہندوستانی تہذیب کہلائے گی۔ اس مشاعرے میں صدر مشاعرہ ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین کے ہاتھوں تین کتابوں کا اجرا بھی کیا گیا۔ آخر میں جناب کیپٹن ایس آر کمار نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

رپورٹ: ضیاء الرحمٰن فرزندی، وشاکھاپٹنم، 5 دسمبر 2013

اردو سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی :

مولانا آزاد کا یوم پیدائش

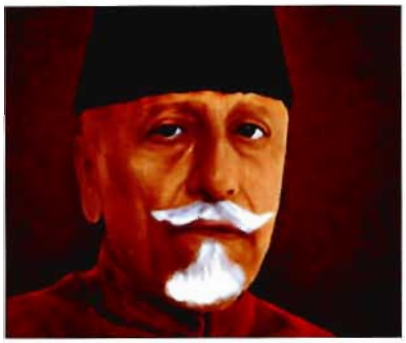

ابوالکلام آزاد کی 125 ویں سالگرہ پر قومی پورٹل کا اجرا

نئی دھلی: وزارت برائے اقلیتی امور نے آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم اور بھارت رتن مولانا ابوالکلام آزاد کی قوم پرستی اور متحدہ ہندوستان کے نظریہ کو بڑے پیمانے پر فروغ دینے کے لیے ہیریٹیج پورٹل (ویب سائٹ) کا اجرا کیا۔ قومی سطح کی یہ پورٹل سائٹ اس سے پہلے مہاتما گاندھی پر جاری کی گئی تھی۔ پورٹل کے اجرا کے موقعے پر وزیر اعظم کے مشیر سیم پٹروڈا، پلاننگ کمیشن کی ممبر سیدہ حمید، قومی اقلیتی کمیشن کے چیئرمین وجاہت حبیب اللہ، ممبر پارلیمنٹ راجیو شکلا، محسنہ قدوائی، نجمہ ہپت اللہ، احمد سعید ملیح آبادی، جسٹس سچر اور بڑی تعداد میں اہم شخصیات موجود تھیں۔ اقلیتی امور کے وزیر کے رحمان خان نے یہاں نئی دہلی میں واقع نیشنل میڈیا سینٹر میں مولانا آزاد کی یاد میں پورٹل سائٹ کا اجرا کرتے ہوئے کہا کہ ''مولانا آزاد کی 125 ویں سالگرہ کے موقعے پر جس پورٹل سائٹ کا اجرا کیا گیا ہے وہ یقیناً عوام وخواص کو مولانا آزاد کی وراثتوں سے روشناس کرنے میں مددگار ثابت ہوگا۔'' انھوں نے مزید کہا ''مولانا کی سیاسی زندگی قابل تقلید ہے۔'' وزیر اعظم کے مشیر سیم پٹروڈا نے اپنی تقریر میں پورٹل سائٹ کے بارے میں بتایا کہ ''ایک عظیم قائد کی وراثتوں کی حفاظت کے لیے یہ سائٹ بنائی گئی ہے، جس میں مولانا آزاد کی زندگی اور ان کی تخلیقات کو شامل کیا گیا ہے۔ اس سائٹ میں مولانا آزاد کی 20 کتابیں (اردو انگلش)، 60 سے زائد نادر تصاویر اور ان کی صحافتی زندگی سے متعلق اہم معلومات ڈالی گئی ہیں۔ انھوں نے پورٹل کی تیاری میں اقلیتی وزارت اور مولانا آزاد ایجوکیشنل فاؤنڈیشن کی کارکردگی کو بہتر قرار دیا۔ پلاننگ کمیشن کی ممبر سیدہ حمید جنھوں نے مولانا آزاد کی سوانح لکھی ہے، خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''ملک کی آزادی اور اس کی تعمیر کے لیے مولانا آزاد کی قربانیوں کو بھلایا نہیں جاسکتا۔ قومی اقلیتی کمیشن کے چیئرمین وجاہت حبیب اللہ نے مولانا آزاد کو بہتر مسلمان اور بہترین قوم پرست قرار دیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 نومبر 2013

ساگر یونیورسٹی میں اردو ہندی شعبوں کا جلسہ

ساگر: ڈاکٹر ہری سنگھ گور سینٹرل یونیورسٹی، ساگر، مدھیہ پردیش میں مولانا ابوالکلام آزاد کے یوم پیدائش پر 'قومی یوم تعلیم' کا انعقاد کیا گیا۔ شعبۂ اردو کے زیر اہتمام اور شعبہ ہندی اور ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ کے اشتراک سے منعقد اس پروگرام کا افتتاح مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر سرہری سنگھ گور کی تصاویر پر گلہائے عقیدت پیش کرتے ہوئے کیا گیا۔ شعبۂ اردو کے سربراہ پروفیسر فداء المصطفیٰ فدوی نے کلیدی خطبہ دیتے ہوئے کہا کہ مولانا ابوالکلام آزاد ہندوستان کی جدوجہد آزادی کی دیومیکر نمائندہ شخصیتوں میں سے ایک عظیم شخصیت تھے۔ ایڈلٹ ایجوکیشن کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر سنجے شرما نے کہا کہ مولانا آزاد ایک طرف مولانا تھے اور دوسری طرف آزاد بھی تھے، اسی لیے انھوں نے ایسا سیکولر ماحول بنانے کی کوشش کی جو اپنی مثال آپ ہے۔ ایڈلٹ ایجوکیشن کی سربراہ پروفیسر پرتیبھا پانڈے نے مولانا آزاد کی سماجی تعلیم کے تئیں ان کی خدمات بیان کیں۔ اس موقعے پر پروفیسر گنیش شنکر گری اور پروفیسر چندابین نے بھی اظہار خیال کیا۔ پروگرام کی نظامت شعبہ کے استاد ڈاکٹر افضل مصباحی نے اور ہدیہ تشکر ڈاکٹر وسیم انور نے پیش کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 نومبر 2013

سدھارتھ نگر میں خاص تقریب

سدھارتھ نگر: مولانا ابوالکلام آزاد کا ملک کی آزادی میں اہم رول رہا ہے۔ انھوں نے انگریزوں کی بڑی ذہنیت اور فرقہ پرستی کو چیلنج کیا۔ مذکورہ خیالات کا اظہار دوشنبہ کو لوہیا کلا بھون میں مولانا ابوالکلام آزاد کے یوم پیدائش کے موقعے پر مجاہد آزادی مولانا عبدالقیوم رحمانی فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام منعقد ایک پروگرام کے دوران مہمان خصوصی اسمبلی اسپیکر ماتا پرساد پانڈے اپنے خطاب کے دوران کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں مولانا آزاد کے نقش قدم پر چل کر قومی یکجہتی اور ہم آہنگی کو برقرار رکھنا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ یہ بات کم لوگ جانتے ہیں کہ مولانا آزاد ہندو مسلم اتحاد کے لیے قرآنی آیات اور ہدایت کی وکالت کی تھی۔ وہ انتہائی زور دے کر کہا کرتے تھے کہ ہندو مسلم اتحاد کی نشاندہی پیغمبر انسانیت محمدؐ کے واقعات زندگی میں نمایاں طور موجود ہے۔ پروگرام کے صدر بدر عالم تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ ان کے علاوہ طلبا یونین کے سابق ضلع صدر خلق اللہ ڈاکٹر ایم عباسی اور سرور انور ایڈوکیٹ، محمد شفیع عباسی وغیرہ نے بھی خطاب کیا۔ اس موقعے پر سینئر صحافی قطب اللہ خاں اور ستیہ پرکاش گپتا کو مہمان خصوصی اسمبلی اسپیکر ماتا پرساد پانڈے شال اور مومنٹو پیش کر کے ان کو اعزاز سے نوازا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 نومبر 2013

دربھنگہ میں جلسۂ یوم آزاد

دربھنگہ: ہندوستان کی جنگِ آزادی اور آزاد ہندوستان کی تعمیرِ نو کی تاریخ کے اوراق اس حقیقت کی شہادت پیش کرتے ہیں کہ جدید ہندوستان کو سنوارنے میں جن چند شخصیات نے اپنا خونِ جگر صرف کیا ان میں مولانا ابوالکلام آزاد اولیت درجہ کے حقدار ہیں۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر مشتاق احمد، پرنسپل ملّت کالج، دربھنگہ و سابق ڈائرکٹر مولانا ابوالکلام آزاد چیئر، ایل این متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ نے کیا۔ انھوں نے کہا کہ عہدِ حاضر میں ہندوستان کی تاریخ کو سیاسی مفاد میں مسخ کیا جارہا ہے جو اس ملک کی گنگا جمنی تہذیب اور فرقہ وارانہ یگانگت کے لیے مضر ہے۔ جلسے کی نظامت ڈاکٹر انیس احمد نے کی اور اظہارِ تشکر ڈاکٹر رضوان احمد نے پیش کی۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 12 نومبر 2013

لکھنؤ میں اردو یونیورسٹی کا جلسہ

لکھنؤ: مولانا آزاد نے ہندوستان کے نظامِ تعلیم کو ایک نئی راہ بخشی اور بے شمار ادارے قائم کیے۔ ان خیالات کا اظہار مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر محمد میاں نے لکھنؤ کیمپس کے زیر اہتمام آزاد ڈے پر منعقدہ خصوصی تقریب کے دوران جے شنکر ہال رائے اوما ناتھ بلی آڈیٹوریم میں کیا۔ پروفیسر محمد میاں نے کہا کہ حیدرآباد میں جلد ہی لڑکیوں کے ڈگری کالج کا آغاز ہونے جارہا ہے ملک کے مختلف حصوں میں اردو میڈیم اسکول اور ڈگری کالجز کے لیے زمین ہموار کی جارہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ یونی ورسٹی کی ترجیحات میں ووکیشنل اور پروفیشنل تعلیم کے ساتھ ساتھ عورتوں کو تعلیم یافتہ بنانا شامل ہے۔ ہم کوشش کررہے ہیں کہ مولانا آزاد کو نصاب کا حصہ بنایا جائے اس کے لیے ضروری کوششوں کا آغاز ہوچکا ہے، ہماری خواہش ہے کہ مولانا کی تصانیف کا مختلف زبانوں میں ترجمہ کرایا جائے اور ان کے نام پر گیلری قائم کی جائے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ ذرائع ابلاغ کے صدر پروفیسر شافع قدوائی نے مولانا آزاد کے بنیادی تصورات پر کلیدی خطبہ پیش کیا۔ عابد سہیل نے کہا کہ مولانا آزاد متحدہ ہندوستان کے حفاظتی دستے کے آخری سپاہی تھے۔ صدارتی خطاب میں پروفیسر آصفہ زمانی نے مولانا آزاد کی سیرت اور ان کے کارناموں کو پیش کیا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی لکھنؤ کیمپس کی انچارج ڈاکٹر وسیم بیگم نے خیر مقدمی کلمات ادا کیے۔ نظامت ڈاکٹر عشرت ناہید نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 14 نومبر 2013

مولانا آزاد اور تعلیم

علی گڑھ: مولانا آزاد کے افکار و خیالات کو عام کرنے کے ساتھ ساتھ اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ان کے خیالات اور ان کے احساسات کو حکومتیں اپنی پالیسیوں کے ذریعے نافذ کرنے کی کوشش کریں۔ ان خیالات کا اظہار مشہور قانون داں ڈاکٹر شکیل صمدانی، اے ایم یو نے 'نورجن سیوا سمیتی' کے ذریعے منعقدہ سیمینار 'مولانا ابوالکلام آزاد اور تعلیم' کے موضوع پر مدرسہ مسکان مولانا آزاد نگر میں بولتے ہوئے بطور مہمانِ خصوصی کیا۔ اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن کے سابق زونل صدر نسیم شاہد نے کہا تعلیم کے بغیر کوئی بھی قوم ترقی نہیں کرسکتی، اس لیے ضروری ہے کہ غریب بستیوں میں اسکول و کالج کھولے جائیں۔ صدارت کرتے ہوئے نورفاؤنڈیشن، لکھنؤ کے صدر اور مشہور عالم دین مولانا مصطفیٰ ندوی نے کہا کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی پوری زندگی اخلاص کے ساتھ ملک اور قوم کے لیے صرف کردی۔ پروگرام کے کنوینر اور نورجن سیوا سمیتی کے سکریٹری نظام الدین نے کہا کہ مولانا آزاد فرقہ پرستی کو چیلنج کرنے والے، مذہب اور ذات سے اوپر اٹھ کر ملک سے محبت کرنے والے، عالم دین، شاعر اور ہندو مسلم ایکتا کے مینار تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13 نومبر 2013

علامہ اقبال کا یومِ پیدائش

جذبے کو فکر میں ڈھالنا اقبال کی انفرادیت: پروفیسر عبدالحق

نئی دھلی: 'علامہ اقبال اکادمی انڈیا نئی دہلی' کے زیر اہتمام جنگ پورہ نئی دہلی میں برصغیر کے عظیم شاعر و فلسفی علامہ اقبال کے 136 ویں یوم پیدائش پر ایک ادبی تقریب کا انعقاد عمل میں آیا۔ پروگرام کی نظامت پروفیسر عبدالحق نے کی، جب کہ صدارت کے فرائض پروفیسر توقیر احمد خان صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی نے انجام دیے۔ پروفیسر عبدالحق نے کہا کہ فکر کو جذبے میں جذبے کو فکر میں ڈھال دینے کی ہنرمندی اقبال کی انفرادیت ہے۔ سہیل انجم نے کہا کہ اقبال صرف مسلمانوں کے یا اسلامی شاعر نہیں تھے۔ وہ محبِ وطن شاعر تھے۔ پروفیسر توقیر احمد خان نے صدارتی خطبے میں کہا کہ اقبال ہندوستان اور یوروپ کا شاعر نہیں تھے بلکہ وہ عالمی اور آفاقی شاعر تھے۔ سلمان فیصل نے 'بچوں کے اقبال ٹیکنالوجی کے عہد میں' کے عنوان سے مختصر اور جامع مقالہ پیش کیا۔ افسانہ حیات نے 'اقبال ہندوستان اور سیکولرزم'، محمد ارشاد نے 'اقبال کا پیغام زمانے کی زبانی' ڈاکٹر علی ادریسی نے 'اقبال کی معنویت' ڈاکٹر سرفراز جاوید نے 'پیغام اقبال تلمیحات' کے موضوع پر مقالے پیش کیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 11 نومبر 2013

اقبال کو خراجِ عقیدت

دیوبند: یومِ اردو کے موقع پر شاعر مشرق علامہ اقبال کی گراں قدر خدمات کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے کل ہند اردو رابطہ کمیٹی کی جانب سے ایک میٹنگ کا انعقاد دارالعلوم چوک پر واقع کمرشیل ہاؤس میں کیا گیا جس میں عمائدین شہر نے شرکت کی۔ اس موقع پر مولانا طارق قاسمی نے علامہ اقبال کے سوچ و فکر پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ درحقیقت اردو کی ترویج و اشاعت میں علامہ اقبال کی تحریک نے موثر رول ادا کیا ہے۔ انھوں نے کہا اردو کے فروغ و تحفظ کے لیے ہر ممکن اقدام کرنے پر زور دیا۔ میٹنگ کی صدارت مولانا طارق قاسمی نے کی اور نظامت محمد افضل قاسمی نے۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی 10 نومبر 2013

دہلی میں سیمینار

نئی دھلی: اردو اکادمی کے نائب چیئرمین پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ اردو کے مسائل کو حل کرنے کے لیے اردو والوں کی محنت رنگ لاسکتی ہے، صرف حکومتوں کی مہربانی سے کوئی زبان زندہ نہیں رہتی اور یہ بات اردو زبان و ادب پر بھی لازم ہوتی ہے۔ اختر الواسع غالب اکادمی میں علامہ اقبال کے یومِ پیدائش کے موقع پر یونائیٹڈ مسلم آف انڈیا اور اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے زیر اہتمام منعقد قومی سیمینار سے خطاب کررہے تھے۔ پروگرام کے کنوینر ڈاکٹر سید احمد خاں نے کہا کہ اردو ہماری تہذیبی شناخت ہے، جس کی بیداری کی ذمے داری ہم پر عائد ہوتی اور اسی مقصد سے اس قسم کا پروگرام ہر سال منعقد کیا جاتا ہے۔ اس موقع پر جسٹس شکیل احمد خاں، عبدالحق، رام پرکاش کپور سمیت دیگر لوگوں نے بھی خطاب کیا۔ نظامت سہیل انجم نے کی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 10 نومبر 2013

اعتذار

اردو دنیا (نومبر 2013) کے شمارے میں ایس ایم رحمت اللہ کا مضمون شائع ہوا ہے جس میں تصویر کسی اور قلمکار کی شائع ہوگئی ہے۔ ادارہ اس سہو کے لیے معذرت چاہتا ہے۔ (ادارہ)

سوامی روشن کے زیر نگرانی کل ہند رباعی اُتسو

دھلی: رباعی اپنی شاعرانہ خوبصورتی اور موزونیت کی وجہ سے اردو کی سرحد کو عبور کر کے ہندی شاعری میں بھی مقبول ہوتی نظر آ رہی ہے، کاویہ شودھ سنستھان (مرکز تحقیق نظم) کی طرف سے اس کے سرپرست اعلیٰ سوامی ڈاکٹر شیاما نندن سرسوتی روشن کی نگرانی میں ایک کل ہند رباعی اُتسو (جشن رباعی) کا انعقاد انڈیا انٹرنیشنل سینٹر نئی دہلی میں کیا گیا جس میں ملک کے طول وعرض سے ماہرین عروض وفن اردو ہندی زبانوں کے اساتذہ، محققین و دانشوران کے علاوہ ہندی اور اردو کے ممتاز رباعی گو شعرا نے شرکت کی۔ اس پروگرام کے ابتدائی حصے میں سوامی شیاما نندن سرسوتی روشن کی چار کتابوں 'روشن رباعیات'، 'حسن رباعیات'، ہندی میں 'رُکھتی ہو قدم'، 'کوئی بات بنے' کی رسم اجرا عمل میں آئی۔ اس پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی (الہ آباد) نے کہا کہ سوامی نندن سرسوتی روشن فنِ رباعی پر پوری دسترس رکھتے ہیں اور رباعی گو شعرا میں اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں، پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی نے زور دے کر کہا کہ رباعی کے صرف بارہ ہی اوزان ہیں ان میں ایک حرف کے اضافے سے یہ چوبیس ہو جاتے ہیں اور سوامی جی نے ان سبھی اوزان میں سوامی جی کو اس صدی کا سب سے بڑا فی البدیہہ رباعی گو شاعر قرار دیا۔ پروفیسر تنویر چشتی ممبر پلاننگ کمیشن اتراکھنڈ نے سوامی شیاما نند سرسوتی روشن کو ان کی خدماتِ رباعی کے اعتراف میں رباعی رشی کے اعزاز سے نوازا جس کی تائید سامعین اور مسند صدارت سے بھی کی گئی، انھوں نے کہا کہ سوامی شیاما نندن روشن مہاراج نے صنف رباعی کی کمیت اور کیفیت دونوں اعتبار سے کافی وقیع سرمایہ چھوڑا ہے انھوں نے کہا کہ سوامی جی نے رباعی میں بہت سے کامیاب تجربے کیے ہیں مثلاً ہائیکو رباعی، مثلث رباعی، زنجیر رباعیات کے علاوہ بھی اور کئی صنعتوں کا بڑا خوبصورت استعمال ان کے یہاں ملتا ہے۔ پروفیسر گنگا پرشاد مل، پروفیسر طلحہ رضوی برق، ڈاکٹر اخلاق آہن نے بھی اظہار خیال کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج'، دہلی، 28 نومبر 2013

جدوجہد آزادی اور اردو ادب پر قومی سیمینار

نئی دھلی: معروف علمی، ثقافتی اور ادبی تنظیم 'ایس دیژن' کے زیر اہتمام مرکزی وزارت ثقافت ہند و انڈین کونسل برائے تاریخی تحقیق (آئی سی ایچ آر) کے تعاون سے

'جدوجہد آزادی اور اردو ادب' پر منعقدہ قومی سیمینار کا ایک منظر

'ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں اردو ادب کا رول' کے موضوع پر 2 روزہ قومی سیمینار کا افتتاح کیا گیا۔ تین مورتی ہاؤس کے نہرو میموریل اینڈ لائبریری میں منعقد کیے گئے اس قومی سیمینار کی افتتاحی تقریب کی صدارت غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری اور جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے سابق پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کی، جب کہ مہمان خصوصی کے طور پر آئی سی آر کے سابق نائب صدر اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی نے شرکت کی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے پروفیسر ابوالکلام قاسمی مہمان ذی وقار کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ کلیدی خطبہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر اور صدر شعبہ اردو پروفیسر ایم شافع قدوائی نے پیش کیا۔ اس سے قبل پروگرام کا افتتاح کرتے ہوئے ایس ویژن کی صدر اور ڈاکٹر کے آر نارائنن سینٹر برائے دلت اور اقلیتی مطالعات کی اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر مہر فاطمہ حسین نے خیر مقدمی کلمات ادا کیے اور تمام مہمانان کا استقبال کیا۔ انھوں نے سیمینار کے اغراض ومقاصد بیان کیے۔ آخر میں جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے شعبہ فارسی سے وابستہ ڈاکٹر اخلاق احمد آہن نے اظہار تشکر کیا۔ ڈاکٹر شگفتہ یاسمین نے افتتاحی پروگرام کی نظامت کی۔ اس موقع پر رام پور رضا لائبریری کے ڈائرکٹر پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین اور دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے سابق صدر پروفیسر صادق بھی بطور خاص موجود تھے۔ افتتاحی تقریب میں مہمانان خصوصی سید شاہد مہدی و دیگر مہمانان کے ہاتھوں ڈاکٹر سجاد اختر کی مرتب کردہ کتاب 'حیات اللہ انصاری: شخصیت اور فن' کا اجرا بھی کیا گیا۔ اس موقع پر رام پور رضا لائبریری نے اپنی کتابوں کی نمائش کا اہتمام بھی کیا۔ اس موقع پر سید شاہد مہدی نے ادب اور صحافت پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے آزادی کی جدوجہد پر اردو کے ادبی سرمایہ کو نوآبادیاتی تناظر میں دیکھنے کی ضرورت پر زور دیا اور کہا کہ ملک کی جدوجہد آزادی کے دور میں اردو ادبا و صحافیوں کی قربانیوں نے عوام کی ذہن سازی کا کام کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا'، دہلی، یکم دسمبر 2013

دھلی: ——————

ذوق کو خراجِ عقیدت

نئی دھلی: انجمن ترقی اردو اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام ایوان غالب میں یوم ذوق کا اہتمام کر کے عظیم شاعر ذوق کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا، جس میں بڑی تعداد میں ادبا، شعرا اور مختلف علوم وفنون کے افراد موجود تھے۔ جلسے کی ابتدا میں انجمن ترقی اردو دہلی شاخ کے جنرل سکریٹری شاہد ماہلی نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ انجمن ترقی اردو دہلی شاخ پچھلے 40 برسوں سے یوم ذوق کا اہتمام کر رہی ہے۔ اس موقع پر شمیم حنفی نے کہا کہ اکثر وبیشتر ہمارے علما ذوق وغالب کا موازنہ کرتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ دونوں شعرا نے اپنے خیالات کی بلندی کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر رضا حیدر نے اپنی تقریر میں کہا کہ ہمارے بعض نقادوں نے ذوق کو کسی بھی طرح سے غالب سے کم نہیں سمجھا بلکہ اکثر وبیشتر نقادوں نے ذوق کو غالب پر ترجیح دی ہے۔ رضا حیدر نے قصائد ذوق کا بھی ذکر کیا اور جسٹس سر سلیمان کے قصائد ذوق کے انتخاب پر بھی روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ ذوق کے کلام کی خوبی یہ ہے کہ سماج کے ہر طبقے میں ذوق کے کلام کو بڑی دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے۔ جلسے کی نظامت ڈاکٹر رضا حیدر نے کی۔ اس جلسے میں ذوق کی زمین میں ایک شعری نشست کا بھی اہتمام کیا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 20 نومبر 2013

اردو میں ووٹر لسٹ بنانے پر الیکشن کمیشن کی تعریف

نئی دھلی: دہلی اسمبلی انتخابات میں جہاں دہلی الیکشن کمیشن نے زیادہ سے زیادہ ووٹ ڈلوانے کے لیے

(دائیں سے) پروفیسر عبیدالرحمٰن ہاشمی، پروفیسر ابن کنول، پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر مشیرالحسن، ظہیر انصاری، مشرف عالم ذوقی، ڈاکٹر مولا بخش اور ڈاکٹر مشتاق صدف 'تحریرنو' کے تازہ خصوصی شمارہ کا اجرا کرتے ہوئے

لوگوں میں بیداری مہم چلائی۔ وہیں دہلی میں پہلی مرتبہ اردو زبان میں رائے دہندگی پر چی کا آغاز کر کے اردو طبقے میں خوشی کی لہر پیدا کی۔ حالانکہ اردو طبقے کی جانب سے متعدد بار حکومت سے مطالبہ کیا جاتا رہا ہے کہ مسلم اکثریتی علاقوں میں اردو زبان کے فروغ اور اردو دانوں کی سہولت کے لیے سرکاری دستاویزات میں اردو زبان شامل کریں۔ کیونکہ صوبہ دہلی کی دوسری سرکاری زبان اردو ہے جو نہ صرف سب سے زیادہ بولی اور سمجھی جاتی بلکہ یہاں سب سے زیادہ اردو زبان بولنے والے موجود ہیں۔ الیکشن کمیشن کی جانب سے انتخابات کے دوران اردو کا استعمال ایک خوش آئند عمل ہے۔

روزنامہ 'صحافت'، دہلی، 5 دسمبر 2013

تحریرنو کے پانچ سال مکمل

نئی دھلی: اردو ماہنامہ 'تحریرنو' کے 5 سال مکمل ہونے پر اردو سوسائٹی انڈیا کے زیر اہتمام بستی حضرت نظام الدین میں واقع غالب اکادمی میں ایک تہنیتی جلسہ کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر پروفیسر مشیرالحسن نے کی، مہمان خصوصی معروف نقاد و شاعر پروفیسر عتیق اللہ اور مہمانان اعزازی پروفیسر عبیدالرحمٰن ہاشمی اور پروفیسر ابن کنول تھے۔ متین امروہوی نے منظوم نذرانہ عقیدت پیش کیا۔ اس موقعے پر پروفیسر مشیرالحسن نے کہا کہ آج نوجوانوں میں کافی تبدیلی آچکی ہے اور وہ اختصار و آسان زبان کو پسند کرنے لگے ہیں۔ لہٰذا ادبا و تخلیق کاروں کو اس بات کو ملحوظ رکھتے ہوئے نوجوانوں کی دلچسپی اور ضرورت کے مطابق مضامین و موضوعات کا انتخاب کرنا چاہیے۔ ظہیر انصاری نے کہا کہ بغیر اشتہارات کے رسائل و اخبارات کی اشاعت ایک دشوار کن کام ہے۔ پروفیسر عتیق اللہ نے کہا کہ آج کے دور میں بھی اردو رسائل و اخبارات کا قاری مرا نہیں ہے، مدیران نے قاری کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی، مدیران عام قاری کی ضرورت، دلچسپی و شوق کا خیال نہیں رکھ پا رہے ہیں جس کی وجہ سے اردو کا قاری اردو کے رسائل و اخبارات سے دور ہو رہا ہے۔ پروفیسر عبیدالرحمٰن ہاشمی نے کہا کہ الیکٹرانک میڈیا نے زبان و ادب کو کافی نقصان پہنچایا ہے جس کی وجہ سے سطحیت کو بڑھاوا ملا ہے اور اخلاقی قدروں کا زوال ہوا ہے۔ پروفیسر ابن کنول نے کہا کہ اردو سب کی زبان ہے خواہ وہ انجینئر ہو یا ڈاکٹر۔ فرحت احساس نے کہا کہ آج میڈیا میں خودکلامی جیسی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ مشرف عالم ذوقی نے کہا کہ آج کے دور میں سماج و سیاست کو بھی ادب کا حصہ بنایا جانا چاہیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا'، دہلی، 18 نومبر 2013

سرسید کے آبائی مکان کو محفوظ رکھنے کی تجویز

نئی دھلی: امریکہ میں مقیم ہندوستانی سائنسداں ڈاکٹر مسرت علی نے ہندوستان کے مسلمانوں کو جدید تعلیم سے متعارف کرانے، انگریزی تعلیم کی جانب راغب کرنے اور اگلی نسلوں کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا عظیم تحفہ دینے والے سرسید احمد خان کو اپنے ہی وطن میں فراموش کر دیے جانے پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے سرسید کے اثاثوں کو محفوظ رکھنے اور اسے ان کی یادگار بنانے کی پیشکش کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ دہلی میں وہ مکان ہے جہاں سرسید احمد پیدا ہوئے تھے۔ اس مکان کی تاریخی حیثیت ہونی چاہیے، لیکن اسے نظرانداز کر دیا گیا۔ انھوں نے کہا کہ ان کی خواہش ہے کہ سرسید کے اس آبائی مکان کو میوزیم میں تبدیل کیا جائے، اس کے لیے وہ حکومت سے بھی کوئی فنڈ نہیں چاہتے بلکہ یہ کام اپنے خرچ سے کرنا چاہتے ہیں۔ حکومت کو تو اسے ایک تاریخی مکان کی حیثیت دینے کا اعلان کرنا چاہیے۔ سرسید احمد خان پر فیچر فلم تیار کر رہے فلم ساز شعیب چودھری نے کہا وہ کئی ماہ سے اس فلم پر کام کر رہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ میری فلم میں سرسید احمد خان نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، مولوی سمیع اللہ خان، مولوی ذکاء اللہ خان، مولانا حالی، تھیوڈر بیک، سید احمد سید محمود، راجہ جے کشن، سید محمد احمد، مولوی نذیر احمد اور باقر علی خان جیسے اہم کردار بھی شامل ہیں جس کے لیے ریسرچ ورک جاری ہے۔ اس موقعے پر ٹیکنالوجی شعبہ سے وابستہ کرتیش ورما اور انوش سنہا نے بھی سرسید احمد کی یادگاروں کے تحفظ کے لیے ذاتی طور پر پرانے منصوبہ کے تعلق سے بات کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا'، دہلی، 2 دسمبر 2013

آندھرا پردیش:

اردو ماضی، حال اور مستقبل

ورنگل: شعبہ اردو اسلامیہ کالج ورنگل کی جانب سے 'اردو ماضی، حال اور مستقبل' کے موضوع پر ایک روزہ سمینار کا انعقاد 26 نومبر 2013 کو کالج گراونڈ میں کیا گیا۔ سیمینار کے روح رواں ڈاکٹر عزیز احمد عرسی پرنسپل اسلامیہ کالج تھے۔ ڈاکٹر سید تاج الدین لیکچرار اردو اسلامیہ کالج نے افتتاحی کلمات ادا کیے اور تمام مہمانان کا استقبال کیا۔ ڈاکٹر خواجہ عزیز احمد عرسی نے سمینار کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی اور کہا کہ سمینار کے ذریعہ ان عوامل کا جائزہ لینا ہے جن کے باعث اردو انحطاط پذیر ہو رہی ہے ان چیلنجز سے بھی واقف ہونا ہے جو مستقبل میں اردو کے فروغ میں حائل ہیں۔ پروفیسر اکبر علی خاں وائس چانسلر تلنگانہ یونیورسٹی نظام آباد نے بطور مہمان خصوصی کے حیثیت سے شرکت کی اور سمینار کے ساونیئر کی رسم اجراء انجام دی اور خطاب کرتے ہوئے کہا کہ سمینار کا موضوع دراصل اردو کے جدید چیلنجز سے متعلق رکھا گیا ہے اس پر بہت زیادہ گفتگو کی ضرورت ہے۔ سمینار کا کلیدی خطبہ پروفیسر خالد سعید مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے دیا انہوں نے کہا کہ ہر زبان سیکولر ہے اردو زبان کے سیکولر ہونے سے متعلق بہت زیادہ پروپگنڈہ کیا جاتا ہے دراصل یہ اردو کے سیکولر ہونے کی دلیل ہے۔ افتتاحی پروگرام کی نظامت جناب محی الدین نے کی۔ سیمینار کا اختتام جناب عزیز احمد عرسی کے شکریہ پر ہوا۔

پریس ریلیز، عبدالعزیز، حیدرآباد، 8 دسمبر 2013

اتر پردیش:

مسلم یونیورسٹی کے لٹریری کلب کا فیض پر جلسہ

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے لٹریری کلب کے زیر اہتمام نامور انقلابی شاعر فیض احمد فیض کی فکری اور شعری وراثت کے تعلق سے منعقدہ پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے ویسٹ ایشین اسٹڈیز شعبہ میں ایسوی ایٹ پروفیسر اور جنرل ایجوکیشن سینٹر کے سابق کوآرڈینیٹر پروفیسر عارف رضوی نے فیض احمد فیض کی حیات اور شعری خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ فیض نہ صرف بلند پایہ شاعر تھے بلکہ انھوں نے شاعری کے توسط سے تاریخ کی بازدید کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا'، دہلی، 26 نومبر 2013

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں 'صنف کی تشکیل، امتیازات اور اردو کی اصناف سخن' پر منعقدہ سیمینار کا منظر

مسلم یونیورسٹی میں اصناف سخن پر سیمینار

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے سینٹر آف ایڈوانس اسٹڈی کے زیر اہتمام 'صنف کی تشکیل، امتیازات اور اردو کی اصناف سخن' پر دو روزہ قومی سیمینار کے افتتاحی جلسے کی صدارت کرتے ہوئے ممتاز دانشور شمس الرحمٰن فاروقی نے کہا کہ ادب ایک نظام ہے اور اصناف اس کا تحتی نظام۔ نظام کی حیثیت آزاد ہوتی ہے اور اصناف کے امکانات کو شاعر اپنے طور پر استعمال کرسکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ انگریزی زبان میں نثری نظموں کا چلن ہے مگر اردو زبان میں نثری نظم کی کوئی ضرورت ہمارے یہاں نہیں ہے۔ انھوں نے اردو زبان کی مختلف اصناف پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے صنف کی تشکیل اور اردو کی اصناف سخن کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا۔ افتتاحی جلسہ میں کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر عتیق اللہ نے کہا کہ یہ موضوع انگریزی زبان میں بہت قدیم ہے۔ شکاگو اسکول میں انگریزی صنف پر سب سے زیادہ کام ہوا ہے جب کہ اردو میں شمیم احمد اور جاوید نے اس موضوع پر سب سے زیادہ لکھا ہے۔ انھوں نے کہا کہ قصیدہ ہماری قدیم ترین صنف ہے اور اس نے شعر کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ آرٹس فیکلٹی کے سابق ڈین اور اردو کے ممتاز ناقد پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے موضوع کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ نئے تصورات شعر میں صنف کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ ساتھ ہی زبان کی اہمیت کے ساتھ صنف کی اہمیت ہے اور متن کا تصور صنف کے بغیر نہیں کرسکتے۔ اس سے قبل شعبۂ اردو کے سربراہ پروفیسر عقیل احمد نے استقبالیہ کلمات ادا کیے۔ سیمینار کے کنوینر پروفیسر قاضی افضال حسین نے نظامت کی جب پروفیسر محمد زاہد نے شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس'، دہلی، 26 نومبر 2013

مسلم یونیورسٹی کے ادبی جلسہ سے قاضی عبدالستار کا خطاب

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے طلبا کی تخلیقی صلاحیتوں اور تنقیدی بصیرتوں کا اظہار قابلِ ستائش

جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے پدم شری قاضی عبدالستار، پروفیسر صغیر افراہیم اور صدر شعبہ پروفیسر عقیل احمد

اور ان کے روشن مستقبل کی ضمانت ہے۔ ان خیالات کا اظہار شعبہ کے سابق پروفیسر پدم شری قاضی عبدالستار نے شعبۂ اردو کی ریسرچ ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام آرٹس فیکلٹی لاؤنج میں منعقدہ ادبی تقریب کی صدارت کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے کہا کہ کسی تخلیق کی قرأت میں تلفظ اور وقت کا لحاظ رکھتے ہوئے اگر پیش کش بہتر ہو تو اس مصروف ترین دنیا میں بھی ادبی ذوق وشوق قائم رہ سکتا ہے۔ ریسرچ ایسوسی ایشن کے کنوینر پروفیسر صغیر افراہیم نے تقریب کی غرض و غایت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ شعبہ کے طلبا کی ذہنی اور تخلیقی قوتوں کے اظہار کے لیے ایسوسی ایشن مسلسل اس طرح کے پروگرام منعقد کرتی رہی ہے اور آج کے پروگرام میں پروفیسر قاضی عبدالستار کی موجودگی طلبا کی صلاحیتوں کے نکھار میں معاون ثابت ہوگی۔ اس موقعے پر علیم ہاشمی نے اپنا مقالہ 'راجندر یادو کی ادبی خدمات: ایک جائزہ' پیش کرتے ہوئے معروف ہندی فکشن نگار راجندر یادو کی ادبی خدمات کو سراہا۔ اے بی فردوسی نے 'افسانہ درگور' کے ذریعے عصر حاضر میں زنا بالجبر کی بڑھتی وادرادتوں سے پیدا ہونے والے حالات کا نفسیاتی اظہار کیا۔ زبیر احمد صدیقی نے انشائیہ 'ابن آدم کی عارضی جنت' پیش کیا۔ عبدالرحمٰن نے افسانہ 'دہشت گرد' محمد فرقان سنبھلی نے افسانہ 'طلسم' پیش کیا جب کہ شہزاد انجم نے نظم 'اعتراف' محمد اسلم صدیقی نے انشائیہ 'نشیمن کی جانشین' پیش کیا۔ شعبۂ اردو کے سربراہ پروفیسر عقیل احمد صدیقی نے طلبا کی حوصلہ افزائی کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 8 نومبر 2013

مسلم یونیورسٹی میں فکشن کی تنقید پر خصوصی لیکچر

علی گڑھ: فکشن کی اصل جڑیں قرآن کریم کے قصوں اور تمثیل سے جڑی ہوئی ہیں اور ناول اور افسانے کے ساتھ ڈرامہ کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار مالیگاؤں سے آئے مہمان مقرر ڈاکٹر سلیم شہزاد نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی اردو اکادمی کے ہال میں شعبۂ اردو کی ریسرچ ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام منعقدہ خصوصی لیکچر سے 'فکشن کی تنقید اور تجزیہ کا فن' موضوع پر خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے کہا کہ ناول کے لیے صفحات کا تعین کوئی مسئلہ نہیں ہے اور انھوں نے محض 14 صفحات پر مشتمل ناول بھی دیکھا ہے۔ انھوں نے کہا کہ جو فکشن منطقی ترتیب اور زمان و مکان کے مطابق ہوتا ہے وہ روایتی فکشن تصور کیا جاتا ہے۔ انھوں نے فکشن کے لیے دو طرح کے زاویوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ منٹو کا بابو گوپی ناتھ واحد متکلم اچھا نمونہ ہے واحد غائب کا اچھا نمونہ پریم چند کے یہاں بھی ملتا ہے۔ اس سے قبل انجمن

کے سکریٹری محمد سلمان بلرام پوری نے موضوع کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ تنقید کا کام ادب کی ماہیت و مقصد کا بیان ہے۔ ایسوسی ایشن کے کنوینر پروفیسر صغیر افراہیم نے افتتاحی کلمات ادا کرتے ہوئے کہا کہ ریسرچ ایسوسی ایشن جس فعال طریقہ پر کام کر رہی ہے وہ طلبا کے لیے بے حد مفید ہے۔ پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے شعبۂ اردو کے سربراہ پروفیسر عقیل احمد نے کہا کہ افسانے کا انحصار واقعہ پر ہوتا ہے جب کہ ناول کی بنیاد کرداروں پر ہوتی ہے۔

روزنامہ 'جدید میل' دہلی، 29 نومبر 2013

سیمینار میں اسٹیج پر بیٹھے ہوئے (دائیں سے) بی ڈی نقوی، پروفیسر افضال حسین، گورنر اتراکھنڈ عزیز قریشی، صغیر احمد، فخر احمد شوبی اور ڈاکٹر یٰسین علی عثمانی

پروفیسر حنفی نقوی کی یاد میں سیمینار

بدایوں: اردو ادب کا ستون کہے جانے والے صف اوّل کے محقق ماہر طبیعات پروفیسر محمد حنیف نقوی کی یاد میں ایک سیمینار محلّہ مسوتھا میں واقع گرین وڈ اسکول میں منعقد کیا گیا جس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے اترانچل کے گورنر ڈاکٹر عزیز قریشی نے شرکت کی۔ یہ سیمینار دو اجلاس پر مشتمل تھا۔ دونوں اجلاس کی صدارت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے سابق صدر ڈاکٹر قاضی افضال حسین نے کی اور پہلے جلسے کی نظامت ڈاکٹر شمس بدایونی و دوسرے جلسے کی نظامت ڈاکٹر یٰسین عثمانی سابق چیئرمین اردو اکادمی اتر پردیش نے کی۔ عزیز قریشی نے اردو کے تعلق سے کہا کہ اگر ہمیں اردو زبان کو زندہ رکھنا ہے تو ہمیں اپنے گھروں میں نئی نسل کے بچوں کو زبان سکھانی ہوگی۔ انھوں نے کہا کہ پنڈت نہرو اور اندرا گاندھی نے زبان کے لیے کافی وکالت کی مگر صوبائی حکومتوں نے متعصبانہ رویہ اختیار کیا یہی وجہ ہے کہ زبان کا شیرازہ منتشر ہوا۔ اس سے پہلے پروگرام کا آغاز بی ڈی نقوی ایڈیشنل جج لکھنؤ نے شمع روشن کر کے کیا۔ پروگرام کے پہلے جلسے میں مہمان خصوصی رضا لائبریری کے ڈائرکٹر ایس ایم عزیز الدین حسن تھے۔ اجلاس میں صدارتی خطاب کرتے ہوئے قاضی افضال حسین نے کہا کہ حنیف نقوی کا سلسلہ علمی ملا عبدالقادر بدایونی سے ملتا ہے۔ ایس ایم عزیز الدین نے اردو کے حوالے سے کہا کہ جو خراجِ عقیدت عربی یا فارسی زبان نواسۂ رسول کو پیش نہیں کر پائی وہ کام اردو زبان نے مرثیہ اور نوحہ خوانی کی شکل میں کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ بدالقادر بدایونی نے رامائن کا ترجمہ اردو زبان میں کیا ہے۔ ڈاکٹر شمس بدایونی نے اپنے مقالے میں کہا کہ حنیف نقوی نے زیادہ تر کام رسائل اور اخبارات کے ذریعے ادب کو فروغ دینے میں کیا ہے، مگر اس کے باوجود انھوں نے ایک درجن سے زائد کتب بھی تحریر کی ہیں۔ تسلیم اللہ غوری نے اپنے مقالے میں کہا کہ تحقیق کو ان پر ناز ہے۔ وہ ہمیشہ اردو ادب کی خدمت کرنے والوں سے شفقت سے پیش آتے تھے۔ پروفیسر حسن عباس نے کہا کہ اگر مکتوب نگاری کا ذکر کیا جائے تو وہ بڑی پاکیزہ زبان کا استعمال کیا کرتے تھے۔ وہ صاحب فکر ونظر تھے۔ دوسرے اجلاس کی نظامت کرتے ہوئے ڈاکٹر یٰسین عثمانی نے حنیف نقوی کے فکر ونظر کے حوالے سے اردو اور اردو ادب پر ایک پرمغز تقریر کی۔ پروگرام کے آخر میں عزیز قریشی کے ہاتھوں ڈاکٹر شمس بدایونی کی شبلی نعمانی پر تحریر کردہ کتاب اور ظفر صدیقی کی 'کتاب نما' کا اجرا ہوا۔ جملہ مقالہ نگاروں کو اعزاز سے نوازا گیا۔ آخر میں فخر احمد شوبا نے جملہ شرکا بزم کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے پر سٹی مجسٹریٹ ندھی شریواستو کے علاوہ بدایوں کی کئی اہم ادبی شخصیات موجود تھیں۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 9 دسمبر 2013

فہمیدہ ریاض کو استقبالیہ

نئی دھلی: پاکستان کی مشہور ومعروف شاعرہ اور فکشن رائٹر فہمیدہ ریاض کو دہلی یونی ورسٹی کے شعبہ ہندی، شعبہ سنسکرت اور شعبہ اردو کی جانب سے مشترکہ طور پر استقبالیہ دیا گیا جس میں تینوں شعبوں کے اساتذہ اور طلبا

زیر نظر تصویر میں فہمیدہ ریاض گفتگو کرتے ہوئے

نے شرکت کی اور فہمیدہ ریاض کی نظموں سے مسحور ہوئے۔ مہمان خصوصی فہمیدہ ریاض نے اساتذہ اور طلبا سے دل چسپ اور پرمغز گفتگو کی۔ انھوں نے کہا میری نظموں کا پہلا مجموعہ 'پتھر کی زبان' اور دوسری کتاب 'بدن دریدہ' ہے ان میں شامل نظموں پر کافی شور ہوا اور میرے قلم سے نکلنے والی ہر بات کی زبردست گرفت کی گئی۔ صدر شعبہ ہندی پروفیسر ہری موہن شرما نے فہمیدہ ریاض کے لیے استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ مشترکہ طور پر سبھی مل کر ادبی و ثقافتی پروگرام کا انعقاد کریں تاکہ تہذیب وثقافت کو فروغ مل سکے۔ پروفیسر اپروانند نے کہا کہ ہندی سنسکرت اور اردو نے مل کر اس قسم کے پروگرام کرنے کا ارادہ کیا ہے جس کی یہ ابتدائی کڑی ہے۔ ڈاکٹر علی جاوید نے کہا کہ صرف ملک ہی نہیں زبانیں بھی دلوں کو جوڑنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ فہمیدہ کا مشن 'انسان کو انسان کے نظریے سے دیکھنے کا' اب تک جاری ہے۔ پروگرام کے اختتام پر پروفیسر بھاردواج نے اظہارِ تشکر ادا کیا۔

الہ آباد میں ایک دوسری تقریب میں بعنوان 'ہم عصر معاشرہ اور اردو ادب میں خواتین' پر ایک جلسے کا انعقاد کیا گیا جس میں فہمیدہ ریاض نے اپنے خطاب میں کہا کہ الہ آباد کی گنگا جمنی تہذیب کو میں کبھی بھول نہیں پاؤں گی۔ انھوں نے گنگا اور جمنا کی حسین وادیوں کا اپنی نظم کے حوالے سے خوبصورت منظر بھی پیش کیا۔ اس موقعے پر پروفیسر علی احمد فاطمی نے مہمان شاعرہ کا تفصیلی تعارف پیش کیا۔

روزنامہ 'صحافت'، دہلی، 14 نومبر و روزنامہ انقلاب دہلی 10 نومبر 2013

زندہ دلان امروہہ کا ادبی جلسہ

امروھہ: زندہ دلانِ امروہہ کی جانب سے یومِ ذوق کے موقعے پر ایک خصوصی جلسہ تنظیم کے دفتر محلّہ ترپولیہ میں منعقد کیا گیا جس کی صدارت تنظیم کے سرپرست ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی نے اور نظامت شیبان قادری نے کی۔ ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی نے کہا کہ ذوق نہایت متقی، نمازی اور پرہیزگار تھے بناوٹ اور تصنع سے کوسوں دور بھاگتے تھے یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام بناوٹ اور تصنع سے پاک ہے۔ ناصر امروہوی نے کہا کہ ذوق کی علمی صلاحیت کا کوئی ثانی نہ تھا ان کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں غزل، نظم، رباعیات، قطعات، سہرے اور قصیدے سب کچھ کہنے کی بے پناہ صلاحیت تھی، لیکن ان کی شہرت صرف قصیدوں کی وجہ سے زیادہ ہے۔ شیبان قادری نے کہا کہ ذوق نے اپنے قصیدوں کے لیے شگفتہ اور عمدہ زمینیں انتخاب کی ہیں۔ ان کے علاوہ شمیم عباسی، شہاب انور، احمد رضا فراز، ضیاء الدین عثمانی، اسلم بقائی، امیر امروہوی وغیرہ نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس'، دہلی، 21 نومبر 2013

اردو ترقی کی نئی منازل طے کر رہی ہے:

خواجہ محمد اکرام الدین

میرٹھ: قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ اکرام الدین نے سی سی ایس یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں صحافیوں سے گفتگو کے دوران کہا کہ اردو روز بروز ترقی کی نئی منازل طے کر رہی ہے۔ انھوں نے کونسل کے ذریعے اردو زبان

کونسل کے ڈائرکٹر خواجہ اکرام الدین صحافیوں سے خطاب کرتے ہوئے

کے فروغ کی سمت میں کی جارہی کوششوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ موجودہ عہد میں زبان کے سیکھنے اور سکھانے کے روایتی طریقوں کے ساتھ ساتھ نئے وسائل نے بڑی تیزی سے جگہ بنائی ہے جیسے آن لائن لرننگ، ڈیجیٹل اور کمپیوٹر ٹیکنالوجی کی مدد سے تعلیم کو عام کرنے کی عالمی کوششیں ہورہی ہیں۔ ان ہی کے پیش نظر کونسل نے آن لائن اردو لرننگ کا کامیاب تجربہ کیا ہے۔ آج کونسل کے آن لائن اردو لرننگ کے تحت پانچ ہزار سے زائد طلبہ و طالبات جڑے ہوئے ہیں۔ ان میں ہندوستان کے علاوہ 17 ممالک کے طالب علم شامل ہیں۔ اسی طرح اردو پیڈیا اور آن لائن اردو لائبریری سے بھی بڑی تعداد میں اردو احباب عالمی سطح پر مستفیض ہورہے ہیں۔ اس کے علاوہ کونسل کے اردو یونیورکوڈ کے 13 فاؤنٹ اور اینڈورائیڈ کے لیے اردو کی بورڈ جاری کیا ہے جو عوامی مفاد میں مفت دستیاب ہے۔ اس کی وجہ سے اپنے موبائل کو اردو زبان میں استعمال کرنا ممکن ہوا ہے۔ عنقریب یعنی دسمبر کے اواخر میں اردو اوسی آر اور اردو سافٹ ویئر لانچ ہوئے ہیں۔ جس کے ذریعے ڈیجیٹل کے تمام پلیٹ فارم پر اردو استعمال کرسکیں گے۔ انھوں نے اردو زبان کے بڑھتے دائرے اور اثر کا ذکر کرتے ہوئے مزید بتایا کہ کونسل کے رسالہ 'اردو دنیا' کی 27 ہزار اور نئے رسالے 'بچوں کی دنیا' جس کا محض چوتھا شمارہ سامنے آیا ہے کی پچیس ہزار سے اوپر کاپیاں فروخت ہورہی ہیں۔ یہ اپنے آپ میں ایک تاریخی بات ہے۔ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے کہا اس وقت اردو کے مستقبل کو لے کر اردو احباب میں متعدد غلط فہمیاں بیٹھی ہوئی ہیں اور انھیں اردو زبان کا مستقبل تاریک نظر آرہا ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اردو جدید ٹکنالوجی کے ذریعے ملک کی حدود سے نکل کر عالمی سطح پر اپنی پہچان اور انفرادیت قائم کرتی جارہی ہے اس موقعے پر ڈاکٹر کلیم اللہ، ڈاکٹر آصف علی، ڈاکٹر شاداب علیم، سعید سہارنپوری، سمیع اللہ اور عامر نظیر ڈار وغیرہ موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13 دسمبر 2013

اڑیسہ:

اڑیسہ میں بھی اردو کو سرکاری زبان بنانے کا مطالبہ

بالاسور: بالاسور فقیر موہن آٹونوموس کالج ہال میں یہ سیمینار زیر صدارت ڈاکٹر دھرتری داس، منعقد ہوا۔ جس میں پروفیسر گوگ چندر جینا، صدر پروفیسر عبدالخالق خان، ڈاکٹر سبھاش چندر پاترا، محترمہ رقیہ جمال بحیثیتِ مہمان خصوصی شرکت کیے۔ سیمینار کا آغاز ترانۂ اقبال سے کیا گیا۔ اپنی ابتدائی تقریر میں ڈاکٹر دھرتری داس، نے ایک مختصر لیکن نہایت ہی جامع نظریہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو اور ہندی کے صرف رسم الخط میں ہی فرق ہے۔ دونوں ہندستانی زبانیں ہیں، شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر عبدالخالق خان نے اردو کی تاریخ پہ روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو ہندستانی زبان ہے محققوں نے اپنی تحقیق میں اردو کی جائے پیدائش مختلف ہندستانی علاقوں کو بتایا ہے۔ محترمہ رقیہ جمال نے کہا کہ سنسکرت میں 'اُر' کا مطلب 'دل' سے ہے اور 'دو' کا مطلب دو ہے یعنی دو دلوں کے میل کو اردو کہا جاتا ہے۔ دیگر مقررین نے بھی اردو کو ایک شاندار پرکشش اور مہذب زبان قرار دیا۔ آخر میں مہمانِ خصوصی عنایت علی عنایت نے اپنی تقریر میں طلبا سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ان کے ذہن میں ہر وقت ایک ہی فکر لاحق رہتی ہے۔ پچھلے چند سالوں میں یوپی، بہار اور بنگال نے اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا، اس موقعے پر انھوں نے حکومتِ اڑیسہ سے مطالبہ بھی کیا ہے کہ اڑیسہ میں بھی اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ ملنے کا مطالبہ کیا گیا۔ اخیر میں محترمہ شگوفہ خانم نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 15 نومبر 2013

بہار:

ہم عصر اردو کہانیوں کے رجحانات

گیا: حکومت ہند کے نیشنل بک ٹرسٹ، نئی دہلی کے زیر اہتمام قومی کتاب ہفتہ کے تحت، مرزا غالب کالج، گیا کے ہال میں ایک روزہ سیمینار 'ہم عصر اردو کہانیوں کے رجحانات' کے موضوع پر منعقد ہوا جس کے افتتاحی اجلاس میں ٹرسٹ کے ایڈیٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے موضوع سے متعلق تعارفی کلمات پیش کیے۔ اس موقعے پر ٹرسٹ کی کئی اہم مطبوعات کا اجرا بھی عمل میں آیا جس میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی مرتب کردہ 'آج کی کہانیاں' کو لوگوں نے خاص طور پر پسند کیا۔ افتتاحی اجلاس کا کلیدی خطبہ ڈاکٹر حسین الحق نے دیا اور صدارتی خطبے میں ڈاکٹر عبدالصمد نے عصری مسائل اور اردو افسانے کے تعلق سے اپنے خیالات پیش کیے۔ اس افتتاحی اجلاس کے موڈریٹر کے طور پر ڈاکٹر شاہد رضوی نے بڑے خوبصورت انداز میں پوری کارروائی کو چلایا۔ اختتام پر شکریہ کی رسم ادائیگی جناب سرتاج علی خاں نے کی۔ اپنے صدارتی خطبے میں مشہور افسانہ نگار جناب شموئل احمد نے عصری افسانے کے پورے منظرنامے کو پیش کیا۔ آخری سیشن میں ڈاکٹر عین تابش اور ڈاکٹر احمد صغیر نے 'اجتماعی حسیت اور شناخت کا بدلتا منظرنامہ' عنوان کے تحت اپنے پیپر پڑھے۔ اس سیشن کے مہمان اعزازی ڈاکٹر محمد محفوظ الحسن اور صدر ڈاکٹر افصح ظفر نے بھی اپنے تاثرات پیش کیے۔ جلسے کے اختتام پر مرزا غالب کالج گیا کے پرنسپل ڈاکٹر غلام صمدانی نے شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس'، دہلی 22 نومبر 2013

اردو زبان کی تہذیب، سماج اور سیاست

گیا: سینٹرل یونیورسٹی آف بہار کے سیمینار ہال میں اسپیشل لیکچر دیتے ہوئے ڈاکٹر احمد کفیل نے کہا کہ دو یا دو سے زیادہ زبانوں کے ملنے سے کوئی زبان اچانک وجود میں نہیں آجاتی، یہ ایک فرسودہ لسانی مفروضہ ہے- زبانیں صدیوں اور ہزاروں برسوں میں غیر محسوس سطح پر اپنا ڈول اور کینڈا تیار کرتی ہیں - اس مہینے کے سیمینار سیریز کے تحت شعبہ اردو کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر احمد کفیل نے 'اردو زبان کی تہذیب، سماج اور سیاست' پر اسپیشل لیکچر دیتے ہوئے یہ بات کہی۔ انھوں نے آریوں کی ہندآمد سے لے کر سنسکرت زبان وادب کے فروغ کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے یہ نشان دہی کی کہ آج کی جو اردو ہے اس کی کتنی صوتیات سنسکرت کے ارتقا تک وجود میں آچکی تھیں۔ پالی پراکرت اور اپ بھرنشوں میں تنسم کی صورتیں تدبھو میں کیسے بدل رہی تھیں۔ انھوں نے ان تمام صورتوں کے عملی نمونے بھی سامعین کے سامنے رکھے۔ واضح رہے کہ یہ سیمینار یونیورسٹی کے وائس چانسلر

پروفیسر جنک پانڈے اور رجسٹرار پروفیسر محمد نہال کی ایما پر منعقد کیا گیا تھا جس میں آرٹس، سائنس اور لٹریچر کے اساتذہ اور طلبہ وطالبات نے شرکت کی۔

پریس ریلیز، اوم پرکاش، اکیڈمک سیکشن، سنٹرل یونیورسٹی آف بہار، گیا بہار، 10 دسمبر 2013

شعبۂ اردو، پٹنہ یونیورسٹی میں ریفریشر کورس

پٹنہ: ''عام طور پر زبان وادب کو آج کے زمانے میں اہمیت نہیں دی جاتی، مگر زبان وادب ہی نے تہذیب وتمدن کو ایک صورت بخشی ہے۔ سائنس، کمپیوٹر اور روبوٹ تو بنا سکتی ہے، مگر انسانی ذہن اور شخصیت کی تشکیل ادب ہی کر سکتا ہے۔'' اِن خیالات کا اظہار شعبۂ اردو، پٹنہ یونیورسٹی میں ریفریشر کورس کا افتتاح کرتے ہوئے جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے استاد پروفیسر انور پاشا نے کیا۔ انھوں نے کہا کہ سائنس اور ٹکنالوجی کے فروغ کے لیے بھی زبان وادب لازمی ذریعہ ہے، اس کے بغیر ان علوم کو دنیا تک نہیں پہنچایا جا سکتا۔

پٹنہ یونیورسٹی میں ریفریشر کورس کی افتتاحی تقریب کا منظر

18 نومبر سے 8 دسمبر تک تین ہفتے کا ایک ریفریشر کورس شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی میں منعقد کیا گیا جس میں بہار، بنگال اور جھارکھنڈ سے عربی، فارسی اور اردو کے اساتذہ شامل ہوئے۔ اس کی افتتاحی تقریب شعبۂ اردو کے سیمینار ہال میں منعقد ہوئی جس کی صدارت وائس چانسلر پروفیسر ارون کمار سنہا نے کی جبکہ نظامت کورس کوآرڈنیٹر ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے کی۔ پروفیسر اعجاز علی ارشد نے موضوع کی اہمیت بتائی اور کہا کہ یہ موضوع 'اردو فارسی اور عربی اصناف ادب کی تدریس' بہت دلچسپ ہے۔ عربی فارسی اور اردو میں انفرادی خوبیوں کے باوجود گہرا رشتہ ہے، جس سے ان زبانوں کے اساتذہ کو واقف ہونا ضروری ہے۔ ممتاز ماہر نفسیات پروفیسر شمشاد حسین نے کہا کہ اساتذہ کو بین العلومیت کا حامل ہونا چاہیے یعنی اپنے مضمون میں مہارت کے ساتھ دوسرے مضامین کے اساتذہ سے گفتگو کرنا چاہیے۔ پدم شری پروفیسر شرف عالم سابق وائس چانسلر مولانا مظہر الحق یونیورسٹی نے اساتذہ کو محنت اور تحقیق وجستجو کی طرف راغب کرتے ہوئے کہا کہ طلبہ کی کمی کا شکوہ کرنے کے بجائے ہمیں ایسے علمی وادبی کام کرنے چاہئیں جن سے معاشرہ کو فائدہ پہنچے۔ پروفیسر اسلم آزاد اور پروفیسر پربھا شکلا نے بھی خطاب کیا۔ صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے وائس چانسلر پٹنہ یونیورسٹی پروفیسر ارون کمار سنہا نے شعبۂ اردو کو مبارکباد دی اور کہا کہ نئے عہد کے تقاضوں کے مطابق یہاں ایک لینگویج لیب کی ضرورت ہے۔ اردو زبان کے فروغ کے لیے انھوں نے ڈائرکٹر اسٹاف کالج کو یو جی سی کے ذریعہ ایک لینگویج لیب قائم کروانے کا مشورہ دیا۔ صدر شعبہ پروفیسر اشرف جہاں نے شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز، شہاب ظفر اعظمی، پٹنہ 9 نومبر 2013

جموں کشمیر:

اردو اور سیکولرازم پر سیمینار

راجوری/جموں و کشمیر: راجوری کے ڈاک بنگلہ میں تحریک بقائے اردو نے قومی سیمینار بعنوان 'اردو-سیکولرزم کی علامت' منعقد کیا جس میں بین الاقوامی سطح کے شہرت یافتہ بیرون ریاست وریاست کے دانشوروں نے شرکت کی اور اردو کو بھارت کی سب سے زیادہ سیکولر زبان قرار دیا۔ اس دوران بین الاقوامی سطح پر اردو میں نمایاں رول ادا کرنے پر آصف بریلوی اور عالم بنارسی کو تحریک کا اس سال کا شان اردو ایوارڈ دیا گیا جب کہ قانون ساز اسمبلی جموں کشمیر میں اردو کی آواز بلند کرنے پر چودھری ذوالفقار علی، ممبر قانون ساز اسمبلی کو سپاہ اردو ایوارڈ دیا گیا۔ پروگرام کی شروعات میں تحریک کے پیر پنجال خطہ کے سربراہ خورشید تانترے نے استقبالیہ خطبہ پڑھا جس کے بعد مشاعرہ بھی منعقد کرایا گیا جس کی صدارت کرشن لعل آسی نے کی جب کہ نظامت تحریک کے طلبا شاخ کے سربراہ آفتاب منہاس نے کی۔ اس کے بعد نثار راہی کی صدارت میں ایک سیمینار کا انعقاد کیا گیا جس میں تمام مقررین نے اردو کو سیکولر زبان قرار دیتے ہوئے کہا کہ اسے ایک سازش کے تحت مسلمانوں کی زبان سمجھا جا رہا ہے تاکہ اس کا خاتمہ کیا جا سکے۔ اس موقعے پر بولتے ہوئے ممبر قانون ساز اسمبلی چودھری ذوالفقار علی، عالم بنارسی، آصف بریلوی اور نثار راہی نے تحریک بقائے اردو کو ایک مضبوط اور منظم تحریک قرار دیتے ہوئے کہا کہ کم عرصے میں یہ تنظیم نہ صرف ریاستی بلکہ ملکی سطح پر ایک منفرد مقام بنا چکی ہے۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 9 نومبر 2013

ایک شام کشمیر کے نام

سری نگر / جموں کشمیر کے محکمہ سیاحت کی جانب سے ڈل جھیل کے کنارے 'ایک شام کشمیر کے نام' سے کل ہند مشاعرے کا اہتمام کیا گیا جس میں ملک کے مشہور شعرا نے حصہ لیا۔ ان میں قومی اردو کونسل کے وائس چیئرمین پروفیسر وسیم بریلوی، ڈاکٹر راحت اندوری، منور رانا، ڈاکٹر نواز دیوبندی وغیرہ شامل تھے۔ جموں کشمیر کے وزیر سیاحت

جموں کشمیر ٹورزم ڈپارٹمنٹ کی جانب سے منعقدہ مشاعرے 'ایک شام کشمیر کے نام' میں ریاستی وزیر سیاحت غلام احمد میر ڈائریکٹر ٹورزم طلعت پرویز، پروفیسر وسیم بریلوی، ڈاکٹر نواز دیوبندی، گلاب سیف وغیرہ کو دیکھا جا سکتا ہے۔

غلام احمد میر، ڈائریکٹر ٹورزم جموں کشمیر طلعت پرویز اور تقریب کے چیف کوآرڈی نیٹر گلاب سیف اس موقع پر موجود تھے۔ گلاب سیف کے مطابق ایس کے آئی سی سی آڈیٹوریم میں تقریباً پانچ گھنٹوں تک جاری رہنے والے اس مشاعرے کو دوردرشن اردو اور ای ٹی وی اردو سے براہ راست نشر کیا گیا جسے دنیا کے 145 ملکوں میں تقریباً چالیس لاکھ اردو شائقین نے مشاعرے کو دیکھا اور سراہا۔ جموں کشمیر کے ثقافتی ماحول کو فروغ دینے کے لیے ایک روز قبل محفل موسیقی کا بھی اہتمام کیا گیا۔ (پریس ریلیز، گلاب سیف چیف کوآرڈی نیٹر، سری نگر، 17 دسمبر 2013)

اعزاز و اکرام:

غالب انسٹی ٹیوٹ کے سالانہ ایوارڈ

نئی دھلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کے ایوارڈ کمیٹی کی ایک اہم میٹنگ ایوانِ غالب میں پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی اور سکریٹری غالب انسٹی ٹیوٹ کی صدارت میں ہوئی۔ اس میٹنگ میں پروفیسر قدوائی کے علاوہ پروفیسر اسلم پرویز، پروفیسر شریف حسین قاسمی، شاہد ماہلی اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر ڈاکٹر رضا حیدر موجود تھے۔ تمام ممبران نے انسٹی ٹیوٹ کے پروقار غالب انعامات برائے 2013 کے 5 اہم انعامات پر فیصلہ کیا۔ اردو کے ممتاز ناقد اور دانشور پروفیسر ابوالکلام قاسمی کو ان کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں فخرالدین علی احمد غالب انعام برائے اردو تحقیق وتنقید سے سرفراز کیا جائے گا۔ اسی طرح فارسی کے معروف اسکالر اور دہلی یونیورسٹی شعبۂ فارسی کے صدر پروفیسر چندر شیکھر کو فخرالدین علی احمد غالب انعام برائے فارسی تحقیق وتنقید کے لیے منتخب کیا گیا۔ ان کے علاوہ معروف افسانہ نگار سلام بن رزاق کا نام غالب ایوارڈ برائے اردو نثر کے لیے طے کیا گیا۔ دورِ حاضر کے معروف شاعر مصحف اقبال توصیفی کا نام غالب انعام برائے اردو شاعری کے لیے تجویز کیا گیا جب کہ غالب انعام برائے اردو ڈرامہ کے لیے مشہور ڈرامہ نگار اقبال نیازی کے نام پر اتفاق ہوا۔ انعام کے طور پر سرٹیفکیٹ، مومنٹو اور 75 ہزار روپے نقد عطا کیے جائیں گے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 27 نومبر 2013

احمد ابراہیم علوی کو صحافت کا ایوارڈ

لکھنؤ: اردو کے سینئر صحافی و مدیر روزنامہ آگ لکھنؤ احمد ابراہیم علوی کو پریس کونسل آف انڈیا کی جانب سے نائب صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر حامد انصاری کے بدست بہترین صحافتی کا اعزاز ملنے کی خوشی میں اسلامک سنٹر آف انڈیا فرنگی محل میں ایک تہنیتی جلسہ ہوا۔ اس کی صدارت ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد نے کی۔ معروف شاعر انور جلال پوری نے جلسے کی نظامت کرتے ہوئے علوی کو مبارکباد دی۔ انھوں نے کہا کہ علوی کی صحافت نصف صدی سے زائد عرصے پر محیط ہے۔ اسلامک سنٹر آف انڈیا کے چیئرمین مولانا خالد رشید فرنگی محلی امام عیدگاہ لکھنؤ نے احمد ابراہیم علوی کو گلدستہ اور قلم دے کر استقبال کیا۔ ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ آزادی کے بعد اردو صحافت زوال کا شکار ہوئی ہے۔ علوی اردو صحافت کی نشاۃ ثانیہ کے مبشر اور معمار ہیں۔ احمد ابراہیم علوی نے اپنے اعزاز میں منعقدہ تقریب پر خوشی کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ اخبار نکالنے کا ہمارا مقصد یہ تھا کہ مسلم نوجوانوں میں جذبۂ عمل پیدا ہو۔ جلسے میں ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی نے علوی کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا کہ اس ایوارڈ سے یہ ثابت ہوگیا کہ اردو ایک زندہ زبان ہے اور وہ زندہ رہے گی۔ خواجہ معین الدین چشتی عربی فارسی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر انیس انصاری نے علوی کو مبارک باد دیتے ہوئے کہ کہ آپ کا اعزاز ہم سب کا اعزاز ہے۔

روزنامہ 'خبر جدید' نئی دہلی، 2013

سید احمد قادری کو عبدالمغنی ایوارڈ

اورنگ آباد: اردو کے نامور افسانہ نگار اور نقاد ڈاکٹر سید احمد قادری کو ان کی علمی، ادبی اور صحافتی خدمات کے اعتراف میں ان کے وطن اورنگ آباد (بہار) میں گزشتہ دنوں 'چراغ ادب' کی جانب سے پروفیسر عبدالمغنی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ایواڈ سے قبل 'چراغ ادب' کے روح رواں اور ناظم جلسہ جناب آفتاب رانا نے حاضرین جلسہ سے ڈاکٹر سید احمد قادری کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر سید احمد قادری اردو ادب میں اپنے افسانوں اور تنقید و تحقیق کے حوالے سے اپنی منفرد شناخت رکھتے ہیں۔ اس تعارف کے بعد پروفیسر عبدالمغنی کے صاحب زادے ڈاکٹر احمد مسعود اور اجمل فرید نے ڈاکٹر سید احمد قادری کو شال، مومنٹو، سند اور چاندی کا روپیہ پیش کیا۔ ایوارڈ لینے کے بعد اپنے مختصر تاثرات میں ڈاکٹر سید احمد قادری نے بڑے جذباتی انداز میں کہا کہ یوں تو مجھے بہت سارے اعزازات ملے ہیں، لیکن اپنے وطن میں جس خلوص اور محبت سے مجھے یہ ایوارڈ دیا گیا ہے، یہ میرے لیے بہت قیمتی ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 27 نومبر 2013

جاوید حبیب انعامات کی تقسیم

بلند شہر: بلند شہر اردو کی قابل قدر خدمت انجام دینے والے حضرات کے لیے مسلم یوتھ کونشن کی جانب سے ہر سال چار ایوارڈ دیے جاتے ہیں۔ ممتاز ملی قائد ہفت روزہ 'ہجوم' کے بانی ایڈیٹر اور مسلم یوتھ کونشن کے رہنما مرحوم جاوید حبیب کے نام سے یہ ایوارڈ منسوب ہے۔ یوم اردو کے موقعے پر ان انعامات کی تقسیم عمل میں آئی۔ پروقار تقریب میں یوم اردو کے مہمان خصوصی ممتاز ڈاکٹر راہل دیپانگر شکاگو (امریکہ) کے ہاتھ سے ایوارڈ دیے گئے۔ مسلم یوتھ کونشن کے کل ہند جنرل سکریٹری ڈاکٹر ظہیر احمد خاں، خورشید عالم راہی، ارشاد احمد شرر ایڈوکیٹ اور محمد صادق چیئرمین کی زیرنگرانی جاوید حبیب اردو صحافی ایوارڈ سینئر صحافی الحاج اطہر علی عباسی کو دیا گیا۔ جب کہ اردو ترقی ایوارڈ منیجر مسلم انٹر کالج حاجی راشد علی خاں، اردو شاعری ایوارڈ ساحل سیماب، اردو ٹیچر ایوارڈ ماسٹر جاوید عالم راہی کو دیا گیا۔ اس کے علاوہ خادم اردو کا ایوارڈ ماسٹر افضال احمد برنی، یرن پرنٹرس کو دیا گیا۔ اردو اعزازی ایوارڈ مشتاق کمال پوری، ماسٹر راحت حسین زیدی، ماسٹر عبدالماجد انصاری، اکبر خاں میکس پریس اور محمد نوید نیشنل کمپیوٹر انسٹی ٹیوٹ کو دیا گیا۔

روزنامہ 'خبر جدید' دلی، 18 نومبر 2013

رسم اجرا:

معمارِ قوم عبدالرحمٰن قدوائی

نئی دھلی: معروف سائنسداں، دانشور، مفکر، سیاست داں وعلمی وسماجی شخصیت اور کئی ریاستوں کے سابق گورنر و سابق ممبر پارلیمنٹ ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی پر مولانا مفتی عطا الرحمٰن قاسمی کی مرتب کردہ کتاب 'معمارِ قوم، ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی' کا نائب صدر جمہوریہ ہند محمد حامد انصاری نے اجرا کیا۔ شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے شائع کی جانے والی اس کتاب کی رسم اجرا کی تقریب غالب انسٹی ٹیوٹ کے اشتراک سے شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام ایوان غالب میں منعقد کی گئی۔ اس تقریب میں مہمان خصوصی کے طور پر نائب صدر جمہوریہ ہند محمد حامد انصاری نے شرکت کی، جب کہ صدارت کل ہند کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری شکیل احمد نے کی۔ اس موقعے پر نائب صدر جمہوریہ ہند محمد حامد انصاری نے اے آر قدوائی کی ہمہ جہت اور حیات وشخصیت کے بارے میں تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ ان کے اندر خدمت خلق کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے اور ان کے اسی جذبے کے تحت بڑی تعداد میں لوگ مستفید ہو چکے ہیں۔ اس موقعے پر اے آر قدوائی نے کہا کہ انھوں نے سابق صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین سے کافی استفادہ کیا۔ انھوں نے ماضی کی اپنی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی کا شکریہ ادا کیا۔ ڈاکٹر شکیل احمد نے اے آر قدوائی کی شخصیت اور خدمات کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ ہر سمجھدار شخص ان کی تقلید کرنا چاہتا ہے، شمائل نبی نے اے آر قدوائی کا موازنہ سابق صدر جمہوریہ ہند فخرالدین علی احمد سے کرتے ہوئے ان کے اخلاق و کردار

غالب اکادمی میں 'مضامین سکندر' کا اجرا کرتے ہوئے ڈاکٹر کمال احمد صدیقی، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی
پروفیسر عتیق اللہ، ڈاکٹر خورشید اکرم، ڈاکٹر احمد محفوظ، ڈاکٹر محمد کاظم اور غزالہ سکندر

اور شخصیت کی خوبیوں کا ذکر کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر عبدالحی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس سے قبل مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی نے تعارفی کلمات ادا کرتے ہوئے تمام مہمانان وشرکا کا خیر مقدم کیا اور اپنی مرتب کردہ کتاب 'معمارِ قوم، ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی' کا تذکرہ کرتے ہوئے اے آر قدوائی کی حیات وشخصیت اور کارہائے نمایاں کا ذکر کیا۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 22 نومبر 2013

مضامین سکندر احمد

نئی دھلی: غالب اکادمی بستی حضرت نظام الدین میں ماہر عروض سکندر احمد مرحوم کے مضامین کا مجموعہ 'مضامین سکندر احمد' کی رسم اجرا کی تقریب میں اہل علم و دانش نے انھیں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ وہ اردو کے لیے نایاب انسان تھے جن کے جانے سے اردو اپنے ایک جانباز مجاہد سے محروم ہوگئی۔ پروگرام کی صدارت ڈاکٹر کمال احمد صدیقی نے کی اور بطورِ مہمان خصوصی پروفیسر عتیق اللہ مدعو تھے، جب کہ نظامت ڈاکٹر احمد محفوظ نے کی۔ واضح رہے کہ مضامین کے اس مجموعے کو ان کی اہلیہ غزالہ سکندر نے ترتیب دیا ہے۔ اس موقعے پر خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد کاظم نے کہا کہ سکندر احمد نئی نسل کی مستقل حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ خورشید اکرم نے کہا کہ سکندر احمد نے اردو فکشن میں اپنا مقام خود بنایا۔ سکندر احمد اپنے لفظوں میں ہمیشہ زندہ وجاوید رہیں گے۔ مہمان خصوصی پروفیسر عتیق اللہ نے کہا کہ ان کے کردار کا اہم پہلو یہ تھا کہ وہ ایک سچے انسان تھے۔ صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ سکندر احمد مشکل اور ادق مسائل پر کام کرنے والے اردو ادب میں نہیں ہیں مگر میں انھیں ان لوگوں میں شمار کرسکتا ہوں۔ سکندر احمد اردو ادب کی قیمتی دولت تھے، جنھیں خدا نے چھین لیا۔ صدارتی خطبہ دیتے ہوئے ڈاکٹر کمال احمد صدیقی نے کہا کہ سکندر احمد کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اختتام پر مرحوم سکندر احمد کی بیوہ غزالہ سکندر نے اظہارِ تشکر کیا۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 28 نومبر 2013

اردو تدریس: جدید طریقے اور تقاضے

حیدرآباد: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں 11 نومبر کو منعقدہ یوم آزاد تقاریب کے اختتامی اجلاس میں مہمان خصوصی عزت مآب ڈاکٹر عزیز قریشی، گورنر اتراکھنڈ کے ہاتھوں ڈاکٹر ریاض احمد کی کتاب 'اردو تدریس: جدید طریقے اور تقاضے' کا اجرا عمل میں آیا۔ اس موقعے پر یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے چیئرمین پروفیسر ویدپرکاش، اردو یونیورسٹی

اردو یونیورسٹی میں کتاب 'اردو تدریس جدید طریقے اور تقاضے' کا اجرا کرتے ہوئے گورنر اتراکھنڈ عزیز قریشی

کے وائس چانسلر پروفیسر محمد میاں، پرواس چانسلر ڈاکٹر خواجہ محمد شاہد اور رجسٹرار پروفیسر ایس ایم رحمت اللہ بھی موجود تھے۔ جناب عابد عبدالواسع، اسسٹنٹ پبلک ریلیشنز آفیسر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے کتاب کا تعارف پیش کیا۔ کتاب 'اردو تدریس جدید طریقے اور تقاضے' ہندوستان میں اساتذہ کے تربیتی اداروں کے سبھی طلبا کو عمومی اور طریقہ تدریس اردو سے وابستہ ڈی ایڈ اور بی ایڈ کے طلبا کو خصوصی رہنمائی فراہم کرے گی۔ اس کتاب میں 2005 NCF اور 2009 کے اصول ونظریات NCERT نیز مختلف ریاستوں کے SCERT's اور متعدد یونیورسٹیوں کے شعبۂ تعلیمات کے مروج ڈی ایڈ اور بی ایڈ کے جدید نصابات کو خاص طور سے پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ C-TET اور مختلف ریاستوں کے TET امتحانات کے لیے بھی یہ کتاب نہایت مفید اور کارآمد ثابت ہوسکتی ہے۔ تمام حاضرین نے اس موقعے پر ڈاکٹر ریاض احمد کو مبارکباد اور امید ظاہر کی کہ اردو حلقے میں اس کتاب کی خاطر خواہ پذیرائی کی جائے گی۔

روزنامہ 'صحافت'، دہلی، 23 نومبر 2013

جنگ آزادی کے سرخیل

علی گڑھ: یوم تعلیم کے موقعے پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایڈمنسٹریٹیو بلاک کے کانفرنس روم میں قیادت اردو ہفت روزہ کے مدیر ڈاکٹر محمد شاہد صدیقی (علیگ) کی تصنیف جنگ آزادی کے سرخیل کا اجرا عمل میں آیا۔ اجرا کی رسم مہمان خصوصی پروفیسر عزیز الدین حسین (ڈائرکٹر رضا لائبریری، رام پور) اور وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) ضمیر الدین شاہ کی صدارت میں عمل میں آئی۔ ڈاکٹر حنیف احمد خاں نے رسم اجرا کے حوالے سے مصنف کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ مصنف نے ان شہیدوں کو اپنے نوک قلم سے ابھارا ہے جن کے دم سے ہماری آزادی کا چراغ روشن ہے۔ مہمان خصوصی پروفیسر عزیز الدین حسین نے کہا کہ اس کتاب کا اجرا اس ماہ میں ہورہا ہے جس میں سب سے پہلے Imperialism کے خلاف جنگ ہوئی تھی۔ انھوں نے کتاب کا موازنہ ڈالرحیل The Last Mughal سے کرتے ہوئے کہا کہ یہ کتاب اس موضوع پر کام کررہے ریسرچ اسکالرز اور اساتذہ کے لیے بڑی مفید ثابت ہوگی۔ تقریب کی صدارت کرتے ہوئے وائس چانسلر جنرل ضمیر الدین شاہ نے کہا کہ نئی نسل کو اپنے بزرگوں کی قربانی سے روشناس کرانے کے لیے ایسی کتابوں کا منظر عام پر آنا بے حد ضروری ہے۔

روزنامہ 'خبر جدید'، دہلی، 13 نومبر 2013

نواب سکندر بیگم کا سفرنامہ حج

لکھنؤ: نواب سکندر بیگم کا سفرنامہ حج اس لحاظ سے کافی اہمیت کا حامل ہے کہ جہاں انہوں نے تقریباً 20 سال تک حکومت کے نظم ونسق کو بحسن وخوبی انجام دیا اسی

طرح ان کا دینی جذبہ بھی قابل تحسین ہے کہ بیگم نے مشکلات سفر کے باوجود اپنے 1500 ہم وطنوں کے ساتھ بہ حج ادا کیا۔ یہ سفرنامہ دور حاضر کی خواتین کے لیے مشعل راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار انگلش یونیورسٹی کے چانسلر ڈاکٹر مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی

ڈاکٹر رضا حیدر، ڈاکٹر علی ظہیر صدیقی، سید شاہد مہدی، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی اور پروفیسر عزیز الدین حسین کتاب کا اجرا کرتے ہوئے

نے مسیحا اردو سوسائٹی کے زیر اہتمام مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی لکھنؤ کیمپس شعبۂ عربی کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر ثمامہ فیصل اور القصیم یونیورسٹی سعودی عرب کے پروفیسر ڈاکٹر ابراہیم البطشان کی کتاب نواب سکندر بیگم کے سفر نامہ حج کے عربی ترجمہ کے اجراء کے صدارتی خطبے میں کیا۔ اس کتاب کا اجرا مہمان خصوصی مولانا خالد رشید فرنگی محلی کے بدست ہوا اس موقعے پر مولانا موصوف نے کہا کہ قابل مبارکباد ہیں ڈاکٹر ثمامہ فیصل و ڈاکٹر بطشان جنھوں نے بیگم کے سفر نامہ کو عربی میں منتقل کیا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی لکھنؤ کیمپس کی انچارج ڈاکٹر وسیم بیگم نے ڈاکٹر ثمامہ فیصل کو ان کی اس کتاب پر مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ سکندر بیگم کا یہ سفر نامہ عظیم کارنامہ ہے جو ہماری نظروں سے پوشیدہ تھا۔ ڈاکٹر ثمامہ فیصل نے اپنی کتاب پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ بیگم کا سفر نامہ ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے جسے عربی زبان میں منتقل کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر ابراہیم البطشان کا پیغام عربی مع اردو ترجمہ بھی پڑھ کر سنایا گیا۔

پریس ریلیز ڈاکٹر مسیح الزماں خان مسیح، جنرل سکریٹری مسیحا اردو سوسائٹی لکھنؤ، 6 دسمبر 2013

شہر بے خواب

علی گڑھ: ممتاز نقاد اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ ماس کمیونی کیشن کے سربراہ پروفیسر شافع قدوائی نے کہا ہے کہ رئیس الدین رئیس نے اردو غزل کو نئی جہات سے متعارف کرایا ہے جس کی وجہ سے ان کی ادبی دنیا میں منفرد شناخت قائم ہوئی ہے۔ وہ حرف زار لٹریری سوسائٹی اور ابن سینا اکادمی کے زیر اہتمام منعقدہ عظیم الشان تقریب رونمائی میں علی گڑھ کے ممتاز استاد شاعر رئیس الدین رئیس کے چوتھے شعری مجموعہ 'شہر بے خواب' ہے' کا اجرا کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ رئیس الدین رئیس جتنے بڑے شاعر ہیں اتنے ہی عظیم انسان بھی ہیں۔ تقریب کے مہمانِ خصوصی سوامی رامانند تیرتھ مراٹھواڑہ یونیورسٹی ناندیڑ، مہاراشٹر کے شعبۂ اردو کے سربراہ پروفیسر ڈاکٹر حمید اللہ خاں نے کہا کہ رئیس الدین رئیس نئی غزل کے نمائندہ شاعر ہیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شعبۂ اردو کے پروفیسر شہپر رسول نے رئیس الدین رئیس کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ بیک وقت غزل اور نظم دونوں اصناف میں دسترس رکھتے ہیں جس کی وجہ سے وہ دورِ حاضر میں اپنے ہم عصروں میں منفرد شناخت اور مقام کے حامل ہیں۔ ممتاز اسکالر عادل حیات نے بھی رئیس الدین رئیس کے فن اور شخصیت پر روشنی ڈالی۔ ممتاز فکشن نگار پدم شری پروفیسر قاضی عبدالستار نے اپنے صدارتی خطبہ میں کہا کہ رئیس الدین رئیس نے اگرچہ مشکل زمینوں کا انتخاب کیا ہے مگر ان کی خوبی یہ ہے کہ وہ موسیقی ریز ہیں اور ان سے ہر طبقہ لطف اندوز ہوسکتا ہے۔ پدم شری پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن نے کہا کہ ابن سینا اکادمی ہمیشہ قلم کاروں کی حوصلہ افزائی کرتی رہی ہے اور رئیس الدین رئیس ادب میں جس مقام پر فائز ہیں اس کا تقاضہ تھا کہ ان کی کتاب کا اجرا ابن سینا اکادمی کے زیر اہتمام عمل میں آئے۔

روزنامہ خبر جدید دہلی، 18 نومبر 2013

گنج غرائب

نئی دھلی: غالب انسٹی ٹیوٹ اور رضا لائبریری رام پور کے زیر اہتمام شام شہریاراں کے موقعے پر میر مہدی مجروح کی تصنیف 'گنج غرائب' کی رسم اجرا کی تقریب میں صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے اردو ادب کے حوالے سے رضا لائبریری رامپور کی خدمات پر خوشی کا اظہار کیا اور لائبریری کے ڈائرکٹر سید محمد عزیز الدین حسین سے امید ظاہر کی کہ اردو دنیا میں رضا لائبریری اہم کردار ادا کرے گی۔ یہ کتاب اردو ادب میں گراں قدر اضافہ ہے۔ اس موقعے پر 'گنج غرائب' کی رونمائی بدست سید شاہد مہدی عمل میں آئی۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر رضا حیدر نے کہا کہ میر مجروح غالب کے شاگرد تھے، مجروح اور غالب کے تعلقات کا عالم یہ تھا کہ آج بھی غالب کی قبر پر جو کتبہ موجود ہے وہ میر مجروح کا ہی لکھا ہوا ہے۔ شرکا میں ڈاکٹر خالد علوی، شہباز ندیم ضیائی، متین امروہوی، پروفیسر آر گوپی ناتھ وغیرہ کے علاوہ بڑی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔

روزنامہ راشٹریہ سہارا دہلی، 30 نومبر 2013

آٹھ آنے کی مٹھاس

دھولیہ: اردو دنیا کے معروف و معتبر فکشن نگار جناب عباس خان ملتان کے افسانوی مجموعہ 'آٹھ آنے کی مٹھاس' کا اجرا معروف افسانہ نگار محقق ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی (نیویارک) کے ہاتھوں 17 نومبر کو عمل میں آیا۔ ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی کی دھولیہ آمد پر مہر فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام شاندار استقبالیہ دیا گیا۔ رسم اجرا کے موقعے پر ڈاکٹر فاروقی نے کہا ''عباس خان عہد حاضر کے افسانہ نگاروں میں معتبر نام ہے جس نے اپنے افسانوں میں کہانی کو زندہ رکھا ہے۔'' مہر فاؤنڈیشن کے صدر ڈاکٹر

شبیر اقبال نے کہا کہ عباس خان نے جدید احساس و خیالات سے اپنے افسانوں کا کینوس تیار کیا ہے۔ اس کتاب کے مرتب اور ڈاکٹر عبدالقادر فاؤنڈیشن کے صدر سلطان اختر سولاپوری نے کہا کہ عباس خان کی کہانیاں انسانی نفسیات کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔ محمد عمر فاروق اقبال نے کہا کہ ''عباس خان کے افسانے بے مثال ہیں۔ واضح رہے کہ عباس خان کے 5 سے زائد افسانوی مجموعے اور 3 سے زائد ناول منظر عام پر آچکے ہیں۔ اکتوبر 13 میں بیباک مالیگاؤں نے عباس خان پر خصوصی گوشہ شائع کیا تھا۔''

بذریعہ ڈاک: سلطان اختر، سولاپور، 17 نومبر 2013

امریکہ کنیڈا میں خواتین کی اردو خدمات

سولاپور: امریکہ میں مقیم معروف محقق و افسانہ نگار جناب عبدالقادر فاروقی کی تحقیقی کتاب 'امریکہ کنیڈا میں خواتین کی اردو خدمات' کی شولاپور میں رسم اجرا محترمہ شیخ بی بی تبسم اختر حسین کے ہاتھوں یکم دسمبر کو عمل میں آئی۔ جلسے کی صدارت معروف محققہ و شاعرہ رفیعہ شبنم عابدی

دائیں سے: ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی، شمشاد جلیل شاد، شیخ بی بی تبسم، رفیعہ شبنم عابدی دغیرہ

نے انجام دی۔ ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی کی سولاپور آمد پر انھیں ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی فاؤنڈیشن، شولاپور کے زیراہتمام شاندار استقبالیہ دیا گیا۔ اس کتاب پر اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد شفیع چوبدار نے کہا کہ ڈاکٹر فاروقی صاحب کی تحقیقی وعلمی ادبی خدمات مظہرالشمس ہیں۔ ڈاکٹر اویسکر شہناز بانو نے کہا کہ فاروقی صاحب کے اس بنیادی ماخذ سے بلاشبہ مزید چراغ جلیں گے اور نئے لکھنے والوں کو روشنی ملتی رہے گی۔ ڈاکٹر تبسم سلطانہ نے کہا کہ یہ بات قابل ستائش ہے کہ ڈاکٹر فاروقی دیارِ غیر میں رہ کر اردو کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی نے اس تحقیقی کتاب کی وجہ تحقیق بتائی اور اہالیانِ شولاپور کا شکریہ ادا کیا۔ سلطان اختر (صدر فاؤنڈیشن) مہمانانِ کا تعارف پیش کیا۔ نجم الدین انجم نے نظامت کی۔ صدر جلسہ رفیعہ شبنم عابدی نے موصوف کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے تمام مقالوں کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر فاروقی کی تحقیقی عالمی وادبی خدمات کا اعتراف کیا۔

بذریعہ ڈاک: سلطان اختر، سولاپور، یکم دسمبر 2013

وفیات/خراجِ عقیدت

معراج فیض آبادی

نئی دھلی: معروف شاعر معراج فیض آبادی کے 30 نومبر کو انتقال پر انڈین کلچرل سوسائٹی کی جانب سے

ایک تعزیتی نشست برمکان امیر امروہوی نیوسیلم پور میں منعقد ہوئی۔ اس موقعے پر سوسائٹی کے جنرل سکریٹری میکش امروہوی نے کہا کہ 72 سالہ معراج فیض آبادی ایک اچھے شاعر کے ساتھ ساتھ عظیم انسان بھی تھے جن کی شاعری کو رہتی دنیا تک یاد کیا جائے گا۔ انھوں نے ان کے انتقال پر رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اردو شعر وادب میں جو خلا واقع ہوا ہے اس کا پر ہونا ماضی قریب میں ہوتا ہوا نظر نہیں آرہا ہے۔ اردو کلچرل سوسائٹی کے جنرل سکریٹری نے کہا کہ معراج فیض آبادی نے اردو شعر وادب میں جو مقام حاصل کیا ہے وہ کم ہی شعرا کو حاصل ہوتا ہے۔ نمائندہ انقلاب محمد قاسم شمسی نے کہا کہ معراج فیض آبادی نے اپنی شاعری کے ذریعے ملت کو بیدار کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ معروف شاعر و نقاد شمس رمزی نے کہا کہ معراج فیض آبادی، مظلوم و مجبور انسانوں کے شاعر تھے۔ انھوں نے کہا کہ ان کے انتقال کی خبر سے پوری دنیا سوگوار ہوگئی۔ میزان کے جنرل سکریٹری ماجد دیوبندی نے بھی ان کے انتقال کو ناقابل تلافی خسارہ قرار دیا۔ اس موقعے پر سرفراز دہلوی، حاجی شکیل احمد محمد رضوان، عقیل احمد محمد طیب رضا اور اسلم دہلوی وغیرہ نے بھی رنج وغم کا اظہار کیا۔ معراج فیض آبادی کے مجموعہ کلام 'ناموس' کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔

معراج فیض آبادی کے انتقال پر اظہارِ تعزیت کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے وائس چیئرمین پروفیسر وسیم بریلوی نے کہا کہ گزشتہ چالیس برس سے معراج فیض آبادی اردو مشاعروں میں ایک معتبر شاعر کی حیثیت سے قومی اور عالمی سطح پر پہچانے جانے والے ایسے شاعر رہے جنھوں نے اپنی شاعری اپنے رکھ رکھاؤ اور ادبی رویوں سے اردو ذہنوں کی نہ صرف تربیت کی بلکہ نئی سوچنے کی راہیں بھی مہیا کیں۔ کسی بھی شاعر کی بڑی کامیابی یہ ہے کہ اس کے اشعار اپنی معنوی تہہ داریوں کے اعتبار سے کس حد تک زبان زد خاص و عام بنتے ہیں۔ معراج اس عہد کے اہم quotable شاعر کی حیثیت سے ہمیشہ اعتبار کی نگاہ سے دیکھے گئے:

مجھ کو تھکنے نہیں دیتا یہ ضرورت کا پہاڑ
میرے بچے مجھے بوڑھا نہیں ہونے دیتے
میکدے میں کس نے کتنی پی خدا جانے مگر
میکدہ تو مری بستی کے کئی گھر پی گیا
اب تھکن یادوں کی زنجیر بنی جاتی ہے
راہ کا خوف یہ کہتا ہے کہ چلتے رہیے

جیسے زبان زد خاص و عام اشعار کے خالق آج معراج فیض آبادی اس دنیا میں نہیں ہیں مگر سماجی معنویتوں کی ترجمان ان کی شاعری اردو کے شعری ادب کا ایک ایسا اثاثہ ہے جو مدتوں ذہنوں کو منور رکھے گا اور ان کی ادبی کاوشیں موضوع بحث بنے گی ایسا مجھے یقین ہے، کیونکہ معیاری شاعری چاہے وہ اسٹیج پر ہو چاہے وہ رسائل کی زینت بنے دنیا میں باقی رہنے کی ضرورت ہوتی ہے اور اس اعتبار سے معراج فیض آبادی ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، یکم دسمبر 2013 و ادارہ

بلراج کومل

نئی دھلی: اردو شعر و ادب کی معروف شخصیت، ادیب، شاعر، نقاد اور افسانہ نگار بلراج کومل کا مختصر علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ آنجہانی بلراج کومل 25 ستمبر 1928 کو سیالکوٹ (پاکستان) میں پیدا ہوئے تھے۔ تقسیم وطن کے بعد انھوں نے دہلی کو اپنی رہائش گاہ بنایا اور اپنی علم، محنت سچی لگن انکساری اور نرم گفتاری کے باعث لوگوں کے دلوں میں اپنی جگہ بنائی۔ اس سلسلے میں اردو اکادمی دہلی میں ایک تعزیتی میٹنگ کا انعقاد کیا گیا، جس میں اکادمی کے سکریٹری انیس اعظمی کے علاوہ دیگر ذمے داران وعہدیداران وکئی علمی وادبی شخصیات نے شرکت کی۔ بلراج کومل کے انتقال پر تعزیت کا اظہار کرتے ہوئے اکادمی کے سکریٹری انیس اعظمی نے کہا کہ آنجہانی بلراج کومل کا اکادمی سے دیرینہ تعلق رہا ہے۔ وہ بارہا اکادمی کی گورننگ کونسل کے ممبر نامزد ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ چونکہ ان کا تعلق ادب کے علاوہ محکمۂ تعلیم سے بھی تھا اور دہلی کے تعلیمی اداروں سے گہری وابستگی تھی اس لیے تعلیم سے متعلق اکادمی کے منصوبوں کو کارگر بنانے میں انھوں نے جو گراں قدر مشورے دیے ان سے اکادمی آج تک فیضیاب ہورہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ بلراج کومل کا ادبی سفر تقسیم وطن کے ناگفتہ بہ حالات میں شروع ہوا۔ اردو ادب کے تئیں ان کے سنجیدہ رویہ کی وجہ سے ہی ان کا شمار صفِ اوّل کے ادیبوں میں ہوتا تھا۔ بلراج کومل کو ہندوستان کی سب سے اعلیٰ اور موقر ادبی تنظیم ساہتیہ اکادمی نے ان کے شعری مجموعے 'پرندوں بھرا آسمان' کے لیے ایوارڈ سے نوازا تھا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 26 نومبر 2013

ساہتیہ اکادمی میں بلراج کومل کی یاد میں تعزیتی جلسہ

نئی دھلی: اردو کے ممتاز شاعر، ادیب اور دانشور بلراج کومل کی یاد میں ساہتیہ اکادمی کے زیراہتمام ایک تعزیتی جلسہ کا انعقاد کیا گیا جس میں دہلی کی متعدد سرکردہ شخصیات نے شرکت کی۔ اس موقع پر اردو مشاورتی بورڈ کے کنوینر چندربھان خیال نے اظہار تعزیت کرتے

ساہتیہ اکادمی میں بلراج کومل پر تعزیتی میٹنگ کا منظر

ہوئے کہا کہ بلراج کومل ہمیشہ ہماری یادوں میں زندہ رہیں گے۔ ان کی شاعری کا ایک زمانہ قائل رہا ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ بلراج کومل نے اردو شاعری کو ایک نئی جہت عطا کی۔ وہ ایک ایسے تخلیق کار تھے جنھوں نے نہایت خاموشی اور دلسوزی کے ساتھ اردو زبان وادب کی خدمت کی۔ انھوں نے کہا کہ ہم نے ایک ممتاز فنکار کو کھودیا جس کی کمی کا ہمیشہ احساس رہے گا۔ چندر بھان خیال نے پروفیسر گوپی چند نارنگ کا تعزیتی پیغام بھی پڑھ کر سنایا۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا کہ بلراج کومل میں انسانیت اور محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ انسان نہیں فرشتہ تھے۔ نہایت ملنسار، مرنجاں مرنج اور دوسروں کے دکھ درد میں شریک ہونے والے تھے۔ اردو نظم نگاری میں اپنی انفرادی آواز سے بلراج کومل نے بہت جلد اپنی پہچان پیدا کرلی۔ ان کی ہر نظم میں کوئی نہ کوئی نکتہ ہوتا تھا۔ نند کشور وکرم نے کہا کہ بلراج کومل اردو نظم کے ایک بڑے شاعر تھے۔ فاروق ارگلی نے کہا کہ بلراج کومل گنگا جمنی تہذیب کی علامت تھے۔ نارنگ ساقی نے کہا کہ انھوں نے سیدھی سادی زندگی بسر کی۔ نرمل سنگھ نرمل نے کہا کہ بلراج کومل کو اردو دنیا کبھی فراموش نہیں کرے گی۔ گروندر سنگھ عازم کوہلی نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ بلراج کومل کی شاعرانہ خصوصیات کے ہم سب قائل ہیں۔ اس موقعے پر دیگر اہم شخصیات نے بھی اظہارِ خیال کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 4 دسمبر 2013

صلاح الدین پرویز کی یاد میں تقریب

نئی دھلی: صلاح الدین پرویز ایک کشتۂ تیغ ستم تھے جنھیں تنقیدی تحفظات اور تعصّبات نے تہہ تیغ کیا اور ان کی تخلیقی ثروت مندی کو نظرانداز کرکے ان کی مادّی ثروت کو ان کی شناخت اور شہرت کا بنیادی حوالہ بنا دیا جب کہ صلاح الدین پرویز ایک ایسے تخلیقی ذہن کے حامل ہیں جنھوں نے نہ صرف بین المتونی تجربے کیے بلکہ ایک ایسا اسلوبیاتی نظام وضع کیا جو ان کے ہم عصروں سے مختلف تھا۔ ان خیالات کا اظہار معروف نقاد اور صحافی حقانی القاسمی نے ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام صلاح الدین پرویز پر منعقد تقریب 'میرے جھروکے سے' میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ صلاح الدین پرویز اپنے لسانی آہنگ

اور تمثالوں کے نظام کی وجہ سے ادب کی تاریخ میں زندہ رہیں گے۔ انھوں نے کلیشے زدہ لفظیات سے اجتناب برتا اور اپنی تخلیق میں باکرہ زبان استعمال کی۔ اس موقعے پر اردو مشاورتی بورڈ کے کنوینر چندر بھان خیال نے کہا کہ صلاح الدین پرویز ایک جینئس تھے۔ ان کی شاعری اور ان کے فکشن کا معیار بہت بلند تھا۔ اردو ادب اس نئے لب ولہجے کے فنکار کو کبھی فراموش نہیں کرے گا۔ اکادمی کے پروگرام افسر ڈاکٹر مشتاق صدف نے مہمانان و شرکا کا خیر مقدم کرتے ہوئے صلاح الدین پرویز کی شاعری اور فکشن پر اظہارِ خیال کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 30 دسمبر 2013

سعید اختر نظامی

لکھنؤ: اردو رابطہ کمیٹی کے صدر معروف دانشور پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے سعید اختر نظامی کے انتقال پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مرحوم دبستان لکھنؤ کے ان معروف شعرا میں تھے جنھوں نے اپنی شاعری کے نگار خانہ کو ان موضوعات سے سجایا تھا جو دبستان لکھنؤ اور دہلی کے امتیازات سے بالاتر ہوکر اردو کے اچھے اور صف اوّل کے شعرا کے موضوعات رہے ہیں۔ انھوں نے مرحوم کے بلندی درجات اور پسماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کی۔ اصحاب بدر کمیٹی پاٹانالہ کے دفتر میں کہنہ مشق شاعر سعید اختر نظامی کے انتقال پر ایک تعزیتی جلسہ عبدالباری راعینی کی صدارت میں ہوا جس میں مولانا عبدالجبار مظاہری نے اظہار تعزیت کیا۔ اردو دیگر حضرات بھی جلسے میں شامل ہوئے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 9 دسمبر 2013

سردار جعفری کی 100 ویں سالگرہ

الہ آباد: اردو کے معروف ترقی پسند ادیب و ناقد علی سردار جعفری کی 100 ویں سالگرہ کے موقعے پر سینئر ترقی پسند نقاد پروفیسر سید محمد عقیل رضوی کی رہائش گاہ پر ایک ادبی نشست کا انعقاد کیا گیا، جس میں شہر کے متعدد ادبا و دانشوران نے شرکت کی اور مرحوم جعفری کی ہمہ جہت شخصیت، ترقی پسند فکر اور ان کی ادبی صلاحیت پر غور وفکر کیا گیا۔ پروفیسر سید محمد عقیل رضوی نے اودھ کی خاک حسیں: ایک تجزیاتی مطالعہ' کے عنوان سے اپنا فکر انگیز مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ نظم جو ایک جمالیاتی فضا اور نیچر پینٹنگ سے شروع ہوتی ہے وہ صرف اودھ کی خاکِ حسیں، ہی نہیں بلکہ پورے غلام ہندوستان، اس کی

علی سردار جعفری کی 100 ویں سالگرہ کے موقعے پر پروفیسر سید محمد عقیل رضوی کی رہائش گاہ پر ادبی نشست کا منظر

کسمپرسی اور انقلابی کسمساہٹ کی ایک بولتی تصویر بن جاتی ہے۔ معتبر ترقی پسند ادیب و ناقد پروفیسر علی احمد فاطمی نے کہا کہ سردار کا لکھنؤ سے گہرا تعلق تھا۔ 'اودھ کی خاکِ حسیں' نظم اس الزام کو مسترد کرتی ہے کہ علی سردار جعفری نے خوبصورت منظریہ شاعری نہیں کی۔ پروفیسر عقیل رضوی نے جس انداز سے اس نظم کا تفصیلی تجزیہ پیش کیا ہے وہ صرف انھیں کا حصہ ہے۔ ڈاکٹر فخر الکریم، مشہور افسانہ نگار اسرار گاندھی نے بھی اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر صالحہ زریں، ڈاکٹر حسین جیلانی، عارفہ وغیرہ نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔ ان کے علاوہ نشست میں محمد نفیس، شاہد خاں اور دیگر ریسرچ اسکالر بھی شریک ہوئے۔ اس موقعے پر نوجوان شاعر نایاب بلیاوی نے سردار جعفری پر نظم پیش کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، یکم دسمبر 2013